تاریخِ حدیث و اصولِ حدیث

ڈاکٹر محمد طاہر مصطفےٰ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- **کتاب وسنت ڈاٹ کام** پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- **مجلس التحقیق الاسلامی** کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- **دعوتی مقاصد** کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

بسم الله الرحمن الرحيم

تاریخ حدیث واصولِ حدیث

DATA ENTERED

29320

ڈاکٹر محمد طاہر مصطفیٰ

الفیصل
ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

297.124001 Tahir Mustafa, Dr. Muhammad
Tareekh Hadees-o-Asool-e-Hadees/
Dr. Muhammad Tahir Mustafa.- Lahore:
Al-Faisal Nashran, 2013.
396p.

1. Hadees - Asool I. Title Card.

ISBN 969-503-894-8

اکتوبر 2013ء
محمد فیصل نے

آر۔ آر پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔

قیمت:-/350 روپے

AL-FAISAL NASHRAN
Ghazni Street, Urdu Bazar, Lahore. Pakistan
Phone: 042-7230777 & 042-7231387
http: www.alfaisalpublishers.com
e.mail: alfaisalpublisher@yahoo.com

29310

فہرست

1- تاریخ حدیث 9

2- اہمیت وحجیت حدیث 18

3- حدیث نبوی اور حکمت - ایک معنی دو تعبیریں 24

4- تفہیم قرآن کے لیے حدیث اور سنت کی ضرورت واہمیت 28

5- حجیت حدیث اور سنت 30

6- حفاظت حدیث 54

7- حفاظت حدیث عہد صحابہ میں 76

8- خلفائے اربعہ اور حفاظت حدیث 91

9- کثیر الروایت صحابہ کرامؓ 101

10- عہد تابعین اور خدمت حدیث 123

11- تحریک تدوین حدیث 125

12- حفاظت وتدوین حدیث 127

13- الصحیح البخاری 129

14- الصحیح المسلم 142

15- الصحیح بخاری اور الصحیح مسلم کا تقابلی جائزہ 151

16- سنن ابی داؤد 153

17- جامع ترمذی 160

18- سنن نسائی 170

19- سنن ابن ماجہ 176
20- فتنۂ انکارِ حدیث اور مستشرقین 182
21- علم حدیث اور شاہ ولی اللہ 203
22- اصول حدیث 206
23- روایت حدیث میں حزم واحتیاط 211
24- اصول درایت 213
25- اصول روایت 221
26- چند کتب اصول حدیث کا تعارف 223
27- اقسام حدیث 233
28- نقل کے اعتبار سے خبر واحد کی اقسام 246
29- عزیز 248
30- غریب 249
31- خبر واحد کی تقسیم دوم 252
32- صحیح لذاتہ 253
33- الحسن لذاتہ 258
34- الصحیح لغیرہ 261
35- الحسن لغیرہ 262
36- حدیثِ ضعیف 264
37- سند میں اسقاط کے باعث حدیث کا غیر مقبول ہونا 266
38- المُعلّق 267
39- مُرسَل 268
40- المَعضَل 272

41- المنقطع 274
42- المدلّس 275
43- المرسل خفی 280
44- حدیثِ موضوع 282
45- المتروک 285
46- المنکر 286
47- معروف 288
48- شاذ ومحفوظ 290
49- حدیث قدسی 292
50- مرفوع 293
51- الموقوف 294
52- المقطوع 296

* * *

تاریخ حدیث

حدیث کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

لفظ ''حدیث'' کے لغوی معنی کسی خبر، کسی بیان یا کسی نئی بات کے ہیں خواہ وہ مذہب سے متعلق ہو یا دنیاوی معاملات سے متعلق۔ اسی سے مختلف الفاظ یعنی حادثہ، حادث اور حدوث وجود میں آئے ہیں۔

ظہور اسلام سے پہلے بھی عرب حدیث کے لفظ کو خبر دینا کے معنی میں استعمال کرتے تھے۔ مثلاً وہ اپنے مشہور ایام کو ''احادیث'' سے تعبیر کرتے تھے۔ (۱)

ہم لفظ حدیث کے مادہ کو جیسے جیسے بھی تبدیل کرتے جائیں اس میں خبر دینے کا مفہوم ضرور پایا جائے گا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

فلیاتوا بحدیث مثلہ (سورۃ الطور۔۳۴)

اللہ نزل احسن الحدیث کتبا متشابھا (سورۃ الزمر۔۲۳)

بعض علما کے نزدیک لفظ حدیث میں جدت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس طرح حدیث قدیم کی ضد ہے۔ وہ قدیم سے مراد کتاب اللہ اور جدید سے حدیث رسول مراد لیتے ہیں۔ ابن حجر عسقلانی فتح الباری شرح بخاری میں لکھتے ہیں ''شرعی اصطلاح میں حدیث سے وہ (اقوال و اعمال) مراد ہیں جو آنحضرت ﷺ کی جانب منسوب ہوں''۔ گویا حدیث کا لفظ قرآن کے مقابلے میں بولا جاتا ہے۔ اس لیے کہ قرآن قدیم ہے اور حدیث اس کے مقابلے میں جدید ہے۔

حدیث کی متداول دینی تعریف کے مطابق حضور اکرم ﷺ کے قول و فعل اور تقریر کو حدیث کہا جاتا ہے نیز صحابہ کے قول و فعل اور تقریر بلکہ تابعی کے قول و فعل کو بھی بعض علما نے حدیث

میں شامل کیا ہے۔

تقریر سے مراد ہے کہ آپ ﷺ کے سامنے صحابہ نے کوئی عمل کیا اور آپ ﷺ نے اسے دیکھ کر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ خاموش رہے یا دوسرے لفظوں میں خاموش تائید فرمائی اسے حدیث تقریری کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس عمل کو برقرار رکھو۔

حدیث اور سنت میں فرق

عام طور پر حدیث اور سنت کے الفاظ باہم مترادف استعمال ہوتے ہیں مگر ان کے درمیان ایک فرق بھی پایا جاتا ہے۔ حدیث عام ہے، اس کے تحت وہ تمام اقوال وافعال اور امور آجاتے ہیں جو آنحضرت ﷺ کے سامنے ہوئے اور آپ ﷺ نے ان سے روکا نہیں۔ سنت سے مراد وہ دینی طریقہ ہے جس پر نبی ﷺ اپنی حیات طیبہ میں گامزن رہے۔ دینی ادب میں حدیث وسنت کو مختلف معانی ومفاہیم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی حدیث کے بارے میں فقہاء کہتے ہیں

هذا الحديث مخالف للقياس و السنة والاجماع

یہ حدیث قیاس وسنت اور اجماع کے خلاف ہے۔

یا یہ کہا جاتا ہے:

امام فی الحدیث و امام فی السنة و امام فیهما معا

فلاں شخص حدیث میں امام ہے، سنت میں امام ہے اور دونوں میں بیک وقت امام ہے۔

عبدالرحمٰن بن مہدی (متوفی ۱۹۸ ہجری) کہتے ہیں کہ سفیان ثوری حدیث میں امام ہیں، اوزاعیؒ سنت میں امام ہیں اور مالک بن انس دونوں میں امام ہیں۔ اس اختلاف کے باوجود حفاظ حدیث ان الفاظ کو ہمیشہ مساوی ومترادف یا قریب المعنی سمجھتے رہے ہیں۔ صبحی صالح کہتے ہیں یہ بات اپنی جگہ درست ہے کیونکہ مکمل طور پر سنت تو فقط آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طور وطریقہ کا نام ہے جس کی تائید آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکیمانہ اقوال واحادیث سے ہوتی ہے۔ پھر حدیث وسنت دونوں کا موضوع بھی ایک ہے۔ دونوں کا مرکز ومحور یکساں طور پر رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال کی تائید ہے اور آپ ﷺ کے اعمال سے بخوبی ان کی تائید ہوتی تھی۔ (۲)

مولانا محمد عبید اللہ الاسدی نے لکھا ہے کہ سنت کے لغوی معنی طریقہ یا عادت کے ہیں۔ اس کی جمع سنن ہے۔ جبکہ اس لفظ سنت کے اصطلاحی معنی مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ سنت بمعنی حدیث

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل

۳۔ کتاب وسنت سے ثابت حکم

۴۔ بدعت کا بالمقابل حکم

۵۔ فرض و واجب کے علاوہ دوسرے اعمال جن کے کرنے کا مطالبہ ہے، بالخصوص جس کی لزوم کے بغیر تاکید ہے، کرنے پر ثواب اور نہ کرنے پر عتاب ہے۔

۶۔ حضرات صحابہ وتابعین کے معمولات وفتاویٰ اور ان سے منقول اصول وقواعد۔ (۳)

ڈاکٹر الشیخ مصطفیٰ حسن السباعی (شامی) لکھتے ہیں ''سنت کے لغوی معنی طریقے اور راستے کے ہیں خواہ وہ اچھا ہو یا برا ہو''۔ چنانچہ صحیح مسلم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے کوئی اچھی سنت قائم کی اسے خود اپنے عمل کا بھی ثواب ملے گا اور قیامت تک اس سنت کی پیروی کرنے والے کے عمل کا بھی اور جس کسی نے بُری سنت قائم کی اس کے اپنے فعل کی ذمہ داری بھی اُسی پر ہے اور قیامت تک جو کوئی اس پر عمل کرے گا اس کی ذمے داری میں بھی وہ شریک ہے۔ ایک دوسری متفق علیہ حدیث ہے کہ ''تم اگلوں کی سنت کی قدم بقدم پیروی کرو گے''۔

''محدثین کی اصطلاح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول، فعل، تقریر، صفات اور سیرت کے بارے میں جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہو وہ سنت ہے۔ خواہ وہ قبل بعثت سے متعلق ہو یا بعثت کے بعد۔ بعض محدثین کے نزدیک حدیث کی تعریف بھی یہی ہے۔ علما اصول کی اصطلاح میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول، فعل اور تقریر کا نام ہے۔ قول کی مثال وہ ارشاد نبوی ہے جس کا تعلق تشریعی احکام سے ہو مثلاً انما الاعمال بالنیات (اعمال کا دارومدار نیتوں

پر ہے) یا لا وصية لوارث (وارث کے حق میں وصیت نہیں ہو سکتی)۔ فعل سے مراد نبی ﷺ کے نماز، روزہ اور حج کے بارے میں احکام یا آپ ﷺ کے وہ فیصلے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فریقین سے شہادت یا قسم لے کر فرمائے ہیں۔ تقریر سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے وہ افعال ہیں جو حضور ﷺ کے سامنے صادر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پر رضا مندانہ سکوت اختیار فرمایا یا اظہار جواز فرمایا"۔ (۴)

لفظ سنت قرآن مجید میں

لفظ سنت قرآن مجید میں بصیغۂ مفرد مندرجہ ذیل مقامات پر وارد ہوا ہے۔

☆ وان یعودوا فقد مضت سنت الاولین۔ (سورۂ انفال۔ ۳۸)

اور اگر وہ پھر (ظلم وقتال کی طرف) لوٹیں گے تو بے شک پچھلوں کا طریقہ پڑ چکا ہے۔

☆ لا یومنون به وقد خلت سنته الاولین۔ (سورۂ الحجر۔ ۱۳)

یہ (مجرم) رسول پر ایمان نہیں لاتے اور بے شک پہلی قوموں کا طریقہ گزر چکا ہے۔

☆ سنة من قد ارسلنا قبلک من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحویل۔

(سورۂ بنی اسرائیل۔ ۷۷)

(ان لوگوں کا انجام) اس قانون کے مطابق (ہوگا) جو ان رسولوں کے بارے میں تھا جو آپ سے پہلے ہم نے بھیجے تھے اور آپ ہمارے قانون میں تغیر نہیں پائیں گے۔

☆ وما منع الناس ان یومنوا اذ جآء هم الهدیٰ و یستغفروا ربهم آلآ ان تاتیهم سنة الاولین۔ (سورۂ الکهف۔ ۵۵)

اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آئی تو ان کو ایمان لانے اور اپنے رب سے گناہوں کی مغفرت طلب کرنے سے اور کسی بات نے نہیں روکا مگر صرف اس بات نے کہ ان کو پچھلی قوموں کا سا معاملہ پیش آ جائے۔

☆ سنة الله فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنة الله تبدیل۔ (سورۂ الاحزاب۔ ۶۲)

یہ اللہ کا قانون ہے ان لوگوں کے بارے میں جو پہلے گزر چکے ہیں اور آپ اللہ کے قانون میں تبدیلی کبھی نہیں پائیں گے۔

☆ سنة اللّٰه التی قد خلت۔ (سورۃ المومن۔ ۸۵)

یہ اللہ کا وہ قانون ہے جو پہلے سے ہوتا چلا آیا ہے۔

☆ فهل ينظرون الا سنت الاولين ج فلن تجد لسنت الله تبديلا ج ولن تجد لسنت الله تحويلا۔ (سورۃ الفاطر۔ ۴۳)

پھر کیا وہ انتظار کر رہے ہیں اس قانون کا جو پچھلی قوموں کے ساتھ پیش آ چکا ہے تو آپ اللہ کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں پائیں گے اور آپ اللہ کے قانون کو کبھی ٹلتا نہیں پائیں گے۔

انْ تمام آیات میں کلمۂ سنت مضاف ہے، جس کا مضاف الیہ "اللّٰہ" ہے یا "الاولین" یا "من قد ارسلنا"۔

بہر حال ان آیات میں سنت اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ قاعدہ اور قانون ہے جو اس نے ہمیشہ اپنے پیغمبروں کے بارے میں جاری رکھا۔ وہ یہ ہے کہ جو لوگ ان پیغمبروں پر ایمان لائے اور ان کی نصرت اور تائید کرتے رہے وہ کامیاب قرار پائے اور جو لوگ پیغمبروں کی مخالفت کرتے اور ان کی ایذا رسانی پر آمادہ ہو جاتے ان کو مہلت تو دی جاتی، مگر پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر قہر اور عذاب نازل ہوتا اور وہ صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیے جاتے۔

درج ذیل آیت میں لفظ سنت بمعنی قانون الٰہی ذرا مختلف مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

☆ سنة الله فى الذين خلوا من قبل ط و كان امر الله قدرا مقدورا۔

(سورۃ الاحزاب۔ ۳۸)

یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے ان (پیغمبروں) کے بارے میں جو پہلے گزر چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا حکم مقرر ٹھہرایا ہوا ہے۔

اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اشارۃً حکم دیا گیا ہے کہ (حضرت زینبؓ کے

نکاح کے بارے میں) اللہ تعالیٰ نے جو پہلے پیغمبر بھیجے ان سب کو اللہ تعالیٰ نے اس قانون کا پابند رکھا ہے کہ احکام الٰہی کی تعمیل میں رسم کی کوئی پرواہ نہ کریں اور منشاء الٰہی کو بلا تامل پورا کرتے رہیں۔

درج ذیل آیات میں کلمہ سنن سنت کی جمع کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

☆ قد خلت من قبلكم سنن فسيروا فى الارض فانظروا كيف كان عاقبة المكذبين۔ (سورۂ آل عمران۔ ۱۳۷)

تم سے پہلے سنن (بمعنی قواعد وقوانین) گزر چکی ہیں پس زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔

یہاں سنن سے مراد اقوام و ملل کے وہ تجربات و واقعات ہیں جو قانون الٰہی کے مطابق ظہور میں آئے ہیں۔

☆ يريد الله ليبين لكم و يهديكم سنن الذين من قبلكم. (سورۂ النساء۔ ۲۶)

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے احکام کھول کر بیان کر دے اور تمہیں ان لوگوں کے سنن (قوانین اور ضابطے) بتا دے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔

یہاں سنن سے مراد شرائع و مناہج ہیں جن کی پابندی پچھلے زمانے میں علما و صلحا نے کی تھی اور غالباً قرآن مجید کے اسی مفہوم کی مناسبت سے حضور اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کے اقوال و اعمال بھی سنن کہلائے۔ (۵)

سنت احادیث میں

احادیث میں بھی لفظ سنت کے معنی طریقے ہی کے ہیں۔ لیکن جہاں یہ لفظ بطور مضاف استعمال ہوا ہے، وہاں معنی کا تعین مضاف الیہ کے ذریعے ہو جاتا ہے مثلاً:

☆ ابغض الناس الى الله ثلاثة : ملحد فى الحرم و مبتغ فى لا سلام سنة الجاهلية و مطلب دم امرى بغير حق ليهريق دمه۔ (۶)

اللہ کے ہاں تین طرح کے آدمی مبغوض ترین ہیں: ایک وہ جو حرم میں بے راہ روی (ظلم)

کرتا ہے، دوسرا وہ جو اسلام میں دور جاہلیت کے رسم و رواج یا طور طریقے چاہتا ہے اور تیسرا وہ جو ناحق کسی شخص کا خون بہانے کے درپے ہے۔

☆ **ولذی نفسی بیدہ لترکبن سنة من کان قبلکم۔ (۷)**

اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تم ان لوگوں کے طریقے (رواج) پر چلنے لگو گے جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔

بعض مقامات پر سنت کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر بطور مضاف الیہ ہوا ہے اس لیے سنت سے یہاں بھی گویا لفظی معنی ہی مراد ہیں۔ مثلاً

☆ **من احیا سنة من سنتی قد امیتت بعدی کان له من الاخر مثل من عمل بها۔ (۸)**

جس نے میری سنت میں سے کوئی سنت (طریقہ) جسے میرے بعد چھوڑ دیا گیا تھا دوبارہ زندہ کیا تو اسے اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا اس پر عمل کرنے والے کو ملے گا۔

لیکن بعض مقامات پر سُنت کا اطلاق سنت نبوی پر اضافت کے بغیر بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً:

☆ **جاء ناس الی النبی ﷺ فقالو ان ابعث معنا رجالا یعلمونا القرآن و السنة۔ (۹)**

کچھ لوگ حضور اکرم ﷺ کے پاس آئے اور عرض کی کہ ہمارے ساتھ کچھ ایسے آدمی بھیج دیجیے جو ہمیں قرآن وسنت کی تعلیم دیں۔

☆ **ان الامانة نزلت فی جذر قلوب الرجال ثم علموا من القرآن ثم علموا من السنة۔ (۱۰)**

امانت لوگوں کے دلوں کی تہہ میں اتری تھی پھر انہوں نے قرآن مجید سے سیکھا پھر انہوں نے سنت (نبوی) سے سیکھا۔

ان حوالوں سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی سیرت اور طریقۂ کار پر سنت کا اطلاق خود عہدِ نبوی سے ہوتا چلا آیا ہے۔

سنت کے اصطلاحی مفاہیم

علوم دینیہ کی اصطلاح میں سنت کے مختلف معنی بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً

سنت اس نظام (عقائد و اعمال) کا نام ہے جو حضور اکرم ﷺ نے بتایا اور اس کے پابند رہے۔ آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفائے راشدین بھی اس کے پابند رہے اور ان کے بعد امت مسلمہ کی اکثریت بھی اس پر کاربند رہی۔ اس اصطلاحی معنی کی رو سے سنت کے مقابلے پر کلمۂ بدعت استعمال ہوتا ہے جس کے بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔

كل محدثة بدعة و كل بدعة ضلالة۔ (۱۱)

دین میں ہر نئی (سنت سے مغائر) چیز بدعت ہے اور بدعت گمراہی ہے۔

بالفاظ دیگر سنت وہ منہاج ہے جو حضور اکرم ﷺ کے ذریعے دنیا میں رائج ہوا۔ آیت **فلن تجد لسنت الله تبديلا**۔ (سورۂ الفاطر۔۴۳) میں سنت اللہ کے معنی ''اللہ کی تدبیر و حکمت کا طریقہ اور اس کی اطاعت و عبادت کا منہاج'' بھی بتائے گئے ہیں اور اس کی تعبیر یہ کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے واسطے سے جو شرائع نازل فرمائی ہیں ان کی شکلیں چاہے مختلف ہوں ان کے مقاصد اور اصول ایک ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اس نازل کردہ اور حضور اکرم ﷺ کے اس جاری کردہ نظام پر حضور اکرم ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفائے راشدین بھی کاربند رہے۔ سنت کے اس معنی کی تائید و تاکید میں حضور اکرم ﷺ کی یہ حدیث بھی وارد ہے۔

عليكم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين المهدين (۱۲)

تم میری سنت اور میرے ان خلفاء کی سنت پر جو رشد و ہدایت کے منصب پر فائز ہیں سختی سے کاربند رہو۔ (۱۳)

اصول فقہ میں سنت سے مراد وہ امور ہیں جو حضور اکرم ﷺ سے کتاب اللہ کے علاوہ منقول ہوئے ہیں۔ اصول فقہ کی اس اصطلاح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام راغب

فرماتے ہیں۔

و سنته النبي طريقته التي كان يتحراها۔

نبی کی سنت ان کا وہ طریقہ کار تھا جو سوچ سمجھ کر اختیار فرمایا کرتے تھے۔

الشاطبی (م ۷۹۰ ہجری) نے الموافقات میں سنت کے تین معنی بیان کیے ہیں۔ سنت بمقابلۂ بدعت، سنت بمعنی اقوال و افعال رسول اللہ ﷺ اور تیسرے معنی یہ کہ سنت وہ احکام ہیں ن پر صحابہ کرام کا عمل رہا ہو چاہے ان کا ذکر کتاب و سنت میں ہو یا نہ ہو۔ امام شاطبی کی اس اصطلاح کی رو سے حدیثِ موقوف یعنی کسی صحابی کا قول، فعل یا تقریر بھی سنن میں شامل ہو جاتی ہے۔ (۱۴)

حدیث و سنت میں یگانگت

اگرچہ اکثر جگہ حدیث و سنت کے الفاظ کا اطلاق جداگانہ معنی و مفہوم پر کیا جاتا ہے مگر نقادِ حدیث ہمیشہ ان کو مساوی و مترادف یا کم از کم قریب المعنی سمجھتے رہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے س لیے کہ عملی سنت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ آنحضرت ﷺ کے طور طریقہ کا نام ہے جس کو آپ پنے حکیمانہ اقوال اور احادیث سے مزین فرمایا کرتے تھے۔ پھر یہ کہ حدیث و سنت دونوں کا وضوع ایک ہے۔ دونوں کا مرکز و محور یکساں طور پر آنحضرت ﷺ کے اقوال و اعمال ہیں۔ جب ورہ حقائق نقاد حدیث کے ذہن میں گردش کرنے لگے تو انہیں اس ناقابل تردید حقیقت کا کشاف الفاظ میں اعتراف کرنا پڑا کہ اگر ہم حدیث و سنت دونوں کے اصلی مورد کو نظر انداز کر دیں تو (استعمال کے لحاظ سے) دونوں ایک ہیں اور ان میں کوئی فرق و امتیاز نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا ان ئق کے پیش نظر اکثر محدثین نے ان کے مترادف ہونے کا فیصلہ صادر کیا ہے۔ (۱۵)

اہمیت و حجیت حدیث

جمہور علمائے اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ قرآن و حدیث یا سنت شریعت اسلامی کے دو بنیادی ماخذ ہیں۔ یعنی جو احکام رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل یا تقریر کے ذریعے ثابت ہوتے ہیں وہ بھی اسی طرح واجب التعمیل ہیں۔ جس طرح خود قرآن مجید کے ذریعے ثابت شدہ احکام۔

حدیث کی ضرورت و اہمیت کیا ہے؟ اس کی حجیت کا ثبوت کیا ہے؟ انسانی زندگی کی فلاح اور نجات میں حدیث کا کیا کردار اور دائرہ عمل ہے؟ ان جیسے تمام سوالوں کا بنیادی جواب ہمیں اس ایک سوال کے جواب میں ملتا ہے کہ رسالت کی ضرورت و اہمیت کیا ہے یا دوسرے لفظوں میں وحی اور اس کی حقیقت کیا ہے۔ اور اس سوال کا جواب مولانا مفتی محمد شفیع رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر معارف القرآن کی ابتداء میں بہت خوبصورت پیرائے میں دیا ہے۔ پہلے ہم اس سے استفادہ کرتے ہیں بعد میں آگے چلیں گے۔ مولانا لکھتے ہیں۔

’’ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں آزمائش کے لیے بھیجا ہے اور اس کے ذمہ کچھ فرائض عائد کر کے پوری کائنات کو اس کی خدمت میں لگا دیا ہے۔ لہٰذا دنیا میں آنے کے بعد انسان کے لیے دو کام ناگزیر ہیں ایک یہ کہ وہ اس کائنات سے اور اس میں پیدا کی ہوئی اشیاء سے ٹھیک کام لے اور دوسرا یہ کہ اس کائنات کو استعمال کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام کو مدنظر رکھے اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو۔

ان دونوں کاموں کے لیے انسان کو ’’علم‘‘ کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی کون سی چیز کے کیا خواص ہیں؟ ان سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟ اس وقت تک وہ دنیا کی کوئی بھی چیز اپنے فائدے کے لیے استعمال نہیں کر سکتا، جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کیا ہے؟ وہ کون سے کاموں کو پسند اور

کن کو ناپسند کرتا ہے۔ اس وقت تک اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا ممکن نہیں ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدا کیں ہیں جن کے ذریعے اسے مذکورہ باتوں کا علم حاصل ہوتا رہے۔ ایک انسان کے حواس یعنی آنکھ، کان، منہ، ناک اور ہاتھ پاؤں، دوسرے عقل اور تیسرے وحی۔ چنانچہ انسان کو بہت سی باتوں کا علم اپنے حواس کے ذریعے سے معلوم ہو جاتا ہے۔ بہت سی باتوں کا عقل کے ذریعے سے اور جن باتوں کا علم ان دونوں ذرائع سے حاصل نہیں ہوتا ان کا علم وحی کے ذریعے سے عطا کیا جاتا ہے۔

علم کے ان تینوں ذرائع میں ترتیب کچھ ایسی ہے کہ ہر ایک کی ایک خاص حد اور مخصوص دائرہ کار ہے جس سے آگے وہ کام نہیں دیتا چنانچہ کچھ چیزیں انسان کو اپنے حواس سے معلوم ہو جاتی ہیں ان کا علم محض عقل سے نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک دیوار کو آنکھ سے دیکھ کر آپ کو یہ تو علم ہو جاتا ہے کہ اس کا رنگ سفید ہے لیکن اگر آپ اپنی آنکھوں کو بند کر کے صرف عقل کی مدد سے اس کا رنگ معلوم کرنا چاہیں تو یہ ناممکن ہے۔ اسی طرح جن چیزوں کا علم عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے وہ صرف حواس سے معلوم نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً آپ صرف آنکھوں سے دیکھ کر یا ہاتھوں سے چھو کر یہ پتہ نہیں لگا سکتے کہ اس دیوار کو کسی انسان نے بنایا ہے یا مشین نے۔ اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔

غرض جہاں تک حواس خمسہ کام دیتے ہیں وہاں تک عقل کوئی رہنمائی نہیں کرتی اور جہاں حواس خمسہ جواب دے دیتے ہیں وہیں سے عقل کا کام شروع ہوتا ہے۔ اس عقل کی رہنمائی بھی غیر محدود نہیں ہے یہ بھی ایک حد پر جا کر رک جاتی ہے اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا علم نہ حواس کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے اور نہ عقل کے ذریعے۔ مثلاً اسی دیوار کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ اس کو کس طرح استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ راضی اور کس طرح استعمال کرنے سے ناراض ہوگا، یہ نہ حواس کے ذریعے ممکن ہے نہ عقل کے ذریعے سے۔ اس قسم کے سوالات کا جواب انسان کو دینے کے لیے جو ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے اس کا نام وحی ہے اور اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے

کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو منتخب فرما کے اسے پیغمبر قرار دیتا ہے اور اس پر اپنا کلام نازل فرماتا ہے اس کلام کو "وحی" کہتے ہیں۔

اس سے واضح ہو گیا کہ وحی انسان کے لیے وہ اعلیٰ ترین ذریعہ علم ہے جو اسے اس کی زندگی سے متعلق ان سوالات کا جواب مہیا کرتا ہے جو عقل اور حواس کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صرف عقل اور مشاہدہ انسان کی رہنمائی کے لیے کافی نہیں بلکہ اس کی ہدایت کے لیے وحی الٰہی ایک ناگزیر ضرورت ہے اور چونکہ بنیادی طور پر وحی کی ضرورت پیش ہی اس جگہ پر آتی ہے جہاں عقل کام نہیں دیتی اس لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وحی کی ہر بات کا ادراک عقل سے ہی ہو جائے۔ بلکہ جس طرح کسی چیز کا رنگ معلوم کرنا عقل کا کام نہیں بلکہ حواس کا کام ہے اسی طرح بہت سے دینی عقائد کا علم عطا کرنا بھی عقل کی بجائے وحی کا منصب ہے اور ان کے ادراک کے لیے صرف عقل پر بھروسہ کرنا درست نہیں ہے۔

جو شخص (معاذ اللہ) خالق کائنات اللہ رب العزت کے وجود ہی کا قائل نہ ہو اس سے تو وحی کے مسئلہ پر بات کرنا ہی بے سود ہے۔ لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی قدرت کاملہ پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے وحی کی عقلی ضرورت، اس کے امکان اور حقیقی وجود کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ اگر آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ کائنات ایک قادر مطلق نے پیدا کی ہے، وہی اس کے مربوط اور مستحکم نظام کو اپنی حکمت بالغہ سے چلا رہا ہے اور اسی نے انسان کو کسی خاص مقصد کے تحت یہاں بھیجا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اسے بالکل اندھیرے میں چھوڑ دیا ہو اور اسے یہ تک نہ بتایا ہو کہ وہ کیوں اس دنیا میں آیا ہے؟ یہاں اس کے ذمہ کیا فرائض ہیں؟ اس کی منزل مقصود کیا ہے؟ اور وہ کس طرح اپنے مقصد زندگی کو حاصل کر سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص جس کے ہوش حواس سلامت ہوں ایسا کر سکتا ہے کہ اپنے کسی نوکر کو ایک خاص مقصد کے تحت کسی سفر پر بھیجے اور اسے چلتے وقت سفر کا مقصد بتائے نہ بعد میں کسی پیغام کے ذریعے اس پر واضح کرے کہ اسے کس کام کے لیے بھیجا گیا ہے اور سفر کے دوران اس کی ڈیوٹی کیا ہوگی۔ جب ایک معمولی عقل کا انسان بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تو آخر اس خالق کائنات کے

بارے میں یہ تصور کیسے کیا جا سکتا ہے جس کی حکمت بالغہ سے کائنات کا یہ سارا نظام چل رہا ہے؟ یہ آخر کس طرح ممکن ہے کہ جس ذات نے چاند، سورج، آسمان، زمین، ستاروں اور سیاروں کا ایسا محیر العقول نظام پیدا کیا ہو وہ اپنے بندوں کو پیغام رسانی کا کوئی ایسا انتظام بھی نہ کر سکے جس کے ذریعے انسانوں کو ان کے مقصد زندگی سے متعلق ہدایات دی جا سکیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ پر ایمان ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ اس نے اپنے بندوں کو اندھیرے میں بالکل نہیں رکھا بلکہ ان کی رہنمائی کے لیے کوئی باقاعدہ نظام ضرور بنایا ہے۔ بس رہنمائی کے اس باقاعدہ نظام کا نام وحی اور رسالت ہے۔ (۱۶)

مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی اس بحث سے یہ بنیادی بات ثابت ہو گئی کہ انسان کی کامل رہنمائی کے لیے وحی ایک اساسی حیثیت رکھتی ہے مگر دوسری طرف یہ بھی ایک فطری اور آفاقی حقیقت ہے کہ وحی اگر کلام الٰہی کا بلیغ شاہکار ہے تو اس کے مقصد و مدعا کو سمجھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے اور دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ وحی جو کہ اللہ کی طرف سے کامل رہنمائی ہے یہ بھی ہر نفس پر نازل نہیں ہوتی بلکہ اس کا منصب و مقام نزول ایک نبی ہوتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وحی وصول کرنے کے بعد نبی کا کیا کردار ہوتا ہے؟ اس سوال کے جواب کے لیے پوری انسانی تاریخ شاہد ہے کہ نبی کا کردار اپنے قول و فعل سے وحی الٰہی کی تشریح و توضیح کرنا ہوتا ہے۔ تمام انبیاء نے یہی فریضہ سرانجام دیا ہے۔ نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کا قول و فعل اور تقریر بھی وحی الٰہی کی تشریح و توضیح اور تفسیر و تفصیل ہے اور یہی بات ضرورت اور حجیت حدیث کے متعلق تمام سوالوں کا بنیادی جواب ہے۔

وحی متلو اور وحی غیر متلو

ایک وحی وہ ہے جو قرآنی متن کے طور پر ہمارے سامنے ہے اور جس کی ہم قرآن حکیم سے تلاوت کرتے ہیں، یہ وحی متلو ہے۔ متلو سے مراد ہے جس کی تلاوت کی جائے۔

دوسری وحی وہ ہے ہمارے ہادی برحق حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوئی مگر ہم اس کی قرآن

حکیم کی طرح تلاوت نہیں کرتے، یہ وحی غیر متلو ہے۔ غیر متلو سے مراد ہے جس کی باقاعدہ تلاوت نہ کی جائے اور یہ ہمارے نبی کریم ﷺ کی زبان اقدس سے نکلا ہوا ہر حرف اور لفظ ہے۔

حدیث وحیِ غیر متلو ہے

رسول اکرم ﷺ کا قول، فعل اور تقریر یہ تمام وحی غیر متلو ہے۔ اس دعوے کی دلیل قرآن حکیم کی یہ آیت ہے۔

وما ينطق عن الهوى ٥ان هو الا وحى يوحى۔ (سورۃ النجم۔۱۳)

(ہمارا نبی) اپنے پاس سے کچھ نہیں بولتا یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔

اب اس سے زیادہ اہمیت اور حجیت حدیث کی اور کیا دلیل ہو گی کہ اللہ تعالیٰ خود گواہی دے رہا ہے میرے اس نبی کی زبان مبارک سے نکلنے والا ہر لفظ ہماری طرف سے وحی ہے۔ اور وحی ہم پہلے مان چکے ہیں کہ انسان کی رہنمائی کے لیے کامل ترین ذریعہ ہے جس کی اتباع کے بغیر انسان کے لیے صراط مستقیم کا حصول ناممکن ہے۔

معارف القرآن میں مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

"رسول اللہ ﷺ اپنی طرف سے کوئی بات کہہ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کریں اس کا قطعی کوئی امکان نہیں ہے بلکہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کیا ہوا ہوتا ہے۔ وحی کی بہت سی اقسام احادیث بخاری سے ثابت ہیں۔ ان کی ایک قسم وہ ہے جس کے معنیٰ اور الفاظ سب حق تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں جس کا نام "قرآن" ہے۔ دوسری قسم یہ کہ صرف معنیٰ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں آنحضرت ﷺ اس معنیٰ کو اپنے الفاظ میں بیان فرماتے تھے۔ اس کا نام حدیث اور سنت ہے۔ پھر حدیث میں جو مضمون حق تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے کبھی وہ کسی معاملہ کا صاف اور واضح فیصلہ اور حکم ہوتا ہے، کبھی کوئی قاعدہ کلیہ بتلایا جاتا ہے۔ جس سے رسول اللہ ﷺ اپنے اجتہاد سے احکام نکالتے ہیں اور بیان کرتے ہیں۔ اس اجتہاد میں (عام انسان سے تو) یہ امکان رہتا ہے کہ کوئی غلطی سرزد ہو جائے مگر رسول اللہ ﷺ اور تمام

انبیاء کی یہ خصوصیت ہے کہ جو احکام وہ اپنے اجتہاد سے بیان فرماتے ہیں اگر ان میں غلطی کا شائبہ بھی پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے۔ وہ اپنے غلط اجتہاد پر قائم نہیں رہ سکتے جب کہ دوسرے علما مجتہدین سے یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ ان سے اجتہاد میں خطا ہو جائے تو وہ اس پر قائم رہ سکتے ہیں''۔ (۱۷)

وحی غیر متلو یا حدیث یہی ہے کہ کسی بات کا معنی و مطلب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی پر نازل ہو جبکہ متن یا عبارت نبی اپنے الفاظ میں بیان کر دے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس وحی کو حکمت کے لفظ سے بھی تعبیر کیا ہے۔

حدیث نبوی اور حکمت ۔ ایک معنی دو تعبیریں

قرآن حکیم میں حدیث نبوی کے لیے حکمت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ حدیث نبوی اور حکمت کہنے کو یہ دو لفظ ہیں لیکن معانی دونوں کے ایک ہی ہیں۔ اگرچہ ان کی تعبیریں مختلف ہو سکتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔ قرآن حکیم کی درج ذیل آیات:

☆ **كما ارسلنا فيكم رسولا منكم يتلوا عليكم ايتنا و يزكيكم ويعلمكم الكتب و الحكمة و يعلمكم ما لم تكونوا تعلمون٥** (سورۃ البقرہ۔ ۱۵۱)

جیسا کہ ہم نے بھیجا تم میں ایک رسول تمہی میں سے کہ تم پر ہماری آیتیں تلاوت کرے اور تمہیں پاک کرے اور تمہیں سکھائے کتاب و حکمت اور سکھائے تم کو وہ علم جو تم نہیں جانتے۔

دوسرے مقامات پر ہے۔

☆ **لقد من الله على المؤمنين اذبعث فيهم رسولا من انفسهم يتلوا عليهم ايته ويزكيهم ويعلمهم الكتب و الحكمة ج وان كانوا من قبل لفي ضلل مبين۔** (سورۃ آل عمران۔ ۱۶۴)

بے شک اللہ تعالیٰ نے بڑا احسان کیا ہے ایمان والوں پر کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر ان کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں (کفر و گناہ کی آلودگی سے) پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔ کیونکہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

☆ **ادع الى سبيل ربك بالحكمة و الموعظة الحسنته و جادلهم بالتي هي احسن۔** (سورۃ النحل۔ ۱۲۵)

(اے محمد ﷺ) آپ اپنے رب کی طرف حکمت اور اچھی نصیحتوں کے ذریعے بلائیے اور

ان سے احسن طریقے سے بحث کیجئے۔

☆ **یوتی الحکمة من یشآء ومن یوت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا ط وما یذکر الا اولو الالباب۔** (سورۂ البقرہ۔۲۶۹)

(اللہ رب العزت) حکمت (دین کا فہم) جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور جس کو دین کا فہم مل جائے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔

☆ **وانزل اللہ علیک الکتب و الحکمة و علمک مالم تکن تعلم ط و کان فضل اللہ علیک عظیما** (سورۂ النساء۔۱۱۳)

اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور علم کی باتیں نازل فرمائیں اور آپ کو وہ باتیں بتلائی جو آپ نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا فضل عظیم ہے۔

ان تمام آیات میں حکمت کو کتاب سے علیحدہ اور مستقل حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ علما امت متفق ہیں کہ حکمت سے مراد نبی کا خاص فہم ہوتا ہے جس کی رہنمائی اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ اور اس خاص فہم کو پیغمبرانہ بصیرت کے ساتھ ساتھ ''وحی خفی'' کے نام سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس طرح نبی کے علم سے مراد وہ علم ہوتا ہے جو انہیں اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی عطا فرماتا ہے اس طرح حکم یا حکمت سے مراد معمولی فہم نہیں بلکہ وہ خاص فہم ہے جو ''وحی خفی'' سے ملتا ہے۔ اسی وحی خفی کو علما امت ''حدیث'' کہتے ہیں۔ (۱۸) اور اسی وحی کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح ہے۔

ثم ان علینا بیانه۔ (سورۂ القیامہ۔۱۹)

اور پھر اس کا بیان کر دینا بھی ہمارے ذمہ ہے۔

تفسیر قرآن، تفصیل اجمال اور توضیح احکام سب وحی خفی پر مبنی ہیں اور یہی سب کچھ حدیث اور سنت رسول ہے۔

سید سلیمان ندوی حکمت کے مفہوم پر لکھتے ہیں:

”ائمہ لغت اور علمائے قرآن کے تمام اقوال پر ایک غائر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ تمام کی تمام ایک مفہوم کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی حقیقت کی متعدد تفسیریں ہیں۔ حکمت عقل وفہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے جس سے صحیح وغلط، حق وباطل اور خیر وشر کے درمیان تمیز وفیصلہ بذریعہ غور وفکر، دلیل وبرہان اور تجربہ واستقرار کے نہیں بلکہ منکشفانہ طور سے ہوتا ہے اور اس کے مطابق اس صاحب حکمت کا قول بھی ہوتا ہے۔

ہر فن کے واقف کار دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو کسی فن کو باقاعدہ حاصل کرتے ہیں، سیکھتے ہیں، اس کی مشق کرتے اور اس میں مہارت وکمال بہم پہنچاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو اس فن کی فطری استعداد اور قابلیت رکھتے ہیں اور تجربہ ودلیل کے بغیر خود اپنی فطری صلاحیت صحیح وجدان اور سلیم ذوق سے اس فن کی کسی شے کو دیکھنے کے ساتھ ہی اس کے متعلق جچی تلی رائے دیتے ہیں اور حرف بحرف صحیح دیتے ہیں، اسی کا نام آپ صحت وجدان اور سلامت ذوق رکھتے ہیں۔ شاعری، انشاپردازی اور دوسرے فنون لطیفہ میں اس کی مثالیں بکثرت دیکھی جاتی ہیں۔ اس طرح بعض لوگوں میں اشیاء کے حق وباطل اور افعال کے خیر وشر کی تمیز کا صحیح وجدان اور صحیح ذوق ہوتا ہے۔ وہ ان امور کے دقیق سے دقیق مسئلہ کے متعلق اپنے ربانی ذوق ووجدان سے ایسی صحیح رائے دیتے ہیں جو دوسرے لوگ وسیع مطالعہ اور غور وفکر کے بعد بھی نہیں دے سکتے۔ یہی وہ معرفت اور نور الٰہی ہے جو جدوجہد اور سعی ومحنت سے نہیں بلکہ عطا وبخشش سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کا نام حکمت ہے۔

دوسری ربانی استعدادوں اور فطری بخششوں کی طرح حکمت کا عطیہ بھی سب کو یکساں نہیں ملتا بلکہ بحسب استعداد معمولی حکمت سے لے کر اعلیٰ ترین اور کامل ترین حکمت تک لوگوں کو عطا ہوتی ہے۔ اس کے مختلف درجے اور مرتبے عام انسانوں کو مل سکتے ہیں اور ملتے ہیں لیکن اس کا اعلیٰ ترین اور کامل ترین درجہ اور مرتبہ صرف انبیاء کو حاصل ہوتا ہے۔ مگر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح اس ربانی عطیہ، الہامی فہم، دینی عقل اور نورانی قوت پر حکمت کا اطلاق ہوتا ہے اسی طرح اس قوت (حکمت) کے آثار ونتائج اور اس کی تعلیمات پر اس کا اطلاق ہوتا ہے“۔ (۱۹)

اس موضوع پر تفصیلی بحث فرمانے کے بعد سید صاحب مزید لکھتے ہیں۔

”خلاصہ بحث یہ ہے کہ حکمت نبوی اصل میں وہ نور نبوت اور الہامی معرفت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب و دماغ میں ودیعت کیا تھا۔ چونکہ آپ ﷺ کے سنن و اقوال آپ ﷺ کی اس ودیعت شدہ حکمت نبوی کی پیداوار اور آثار و نتائج ہیں اس لیے ان پر بھی حکمت کا اطلاق جائز ہے“۔ (۲۰)

اس بحث کے بعد اگر ہم ان آیات پر غور کریں جن میں کتاب کے ساتھ حکمت کو بیان کیا گیا ہے تو اس سے حقیقت دین مراد لی جاسکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے حکمت کتاب بھی کہا جاسکتا ہے یعنی کتاب (قرآن) میں جو اوامر و نہی، جو احکامات و ارشادات، اور پند و نصائح مذکور ہیں ان کی ماہیت کا صحیح صحیح علم اور ان پر صحیح علم و عمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر رسول کو کتاب کے ساتھ عطا فرمایا جاتا ہے۔ اس طرح معلم کتاب ﷺ کو بھی اپنی کتاب کا علم و عمل اللہ تعالیٰ ہی نے مرحمت فرمایا اور حضور ﷺ کا یہی علم و عمل ہے جس کی تعبیر سنت سے کی جاتی ہے۔ قرآن پر عمل کرنے کے لیے حضور ﷺ کے اقوال و اعمال پر عمل کرنا پڑے گا۔ ان آیات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حکمت یا سنت اصل میں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر کتاب اللہ کے احکام کے مصداق و مدلول کا تعین عقل انسانی کے سپرد کردیا جائے تو احکام الٰہی اہل خرد کی موشگافیوں کی بھینٹ چڑھ جائیں گے۔ (۲۱)

تفہیم قرآن کیلئے حدیث اور سنت کی ضرورت واہمیت

یہ ایک آفاقی حقیقت ہے کہ قرآن حکیم محض کوئی علمی کتاب نہیں کہ جس سے صرف علمی مباحث اور موشگافیوں کو سلجھانے کے لیے استفادہ کیا جاسکے۔ بلکہ یہ تو افراد و امم کے لیے ایک ایسا دستور العمل ہے جسے زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کرنا ہے۔

دنیاوی علوم میں بھی بہت سے علوم ایسے ہیں جو تشریحی وضاحتوں اور عملی مشاقی کے بغیر اولاً تو سمجھ ہی نہیں آتے اور اگر سمجھ بھی آجائیں تو اس وقت تک صحیح طور پر عمل میں نہیں لائے جاسکتے جب تک اُن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔ جیسے ڈاکٹری کا علم یا سائنس کے دوسرے تجربات کہ ان کو صرف پڑھ لینے سے ان کی پوری حقیقت سے آگاہی ناممکن ہے۔ لہٰذا جب ان معمولی دنیادی علوم کا یہ حال ہے تو پھر ربانی علوم کی دقتیں اور معاملات وعبادات کی نزاکتیں اپنے انواع واقسام کے اختلاف کے ساتھ کسی ربانی معلم کی تعلیم اس کے کسی صحیح نقشے کو دیکھے بغیر کیسے سمجھی جاسکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ اس کا صحیح صحیح نقشہ عمل بھی بھیجا جائے۔ مشیت یزدی نے یہاں معلم کتاب کے ساتھ اس کا نقشہ عمل نہیں بھیجا بلکہ جو معلم تھا خود اسی کو مجسم نقشہ عمل نادیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول صرف تبلیغ وحی کے لیے نہیں آتے بلکہ عملی طور پر کتاب اللہ کا نمونہ بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر عمل میں ان کی اطاعت ضروری ہوتی ہے۔

بیشک نہیں کہ تمام کتب سماویہ میں قرآن مجید سب سے زیادہ جامع کتاب ہے۔ لہٰذا اس لیے ضروری ہے کہ اس کا نقشۂ عمل بھی تمام نقشوں میں جامع ترین یعنی اگر کتاب اللہ میں نماز، وزہ، حج، زکوٰۃ کے احکام مذکور ہیں تو انسان کو اس کی زندگی میں ان عبادات کا مکمل نقشہ ملنا چاہیے راگر اس میں امارت وامامت، غزوات وجہاد، نظم ونسق اور معاشرت ومعیشت کی تعلیمات و

ہدایات موجود ہیں تو ان تمام امورِ زندگانی کا نقشہ بھی انسان کی اس زندگی میں نظر آنا چاہیے اگر اس کی حیات میں قرآن کا ایک ہی پہلو ہو اور دیگر امور کا نمونہ نہ ہو تو اس نمونہ کو مکمل نمونہ اور اس نقشہ کو قرآن کریم کا مکمل نقشہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس نمونہ کو جامع اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب قرآن کے ہر چھوٹے بڑے عمل کی تصویر اس کی ہر ساعت زندگی میں نظر آئے۔ صرف عبادات و معاملات کی نہیں بلکہ ان فطری حالات کی بھی جہاں شریعت نے کچھ نہ کچھ دخل دیا ہے یعنی بول و براز، کھانے پینے، رفتار و گفتار، خندہ و گریہ، نوم و بیداری، حتی کہ انسانی زندگی کے نازک سے نازک حالات کی بھی عملی تصویر اس ذات میں نظر آنی چاہیے، اگر قرآن کی جامعیت کے لیے ان معمولی گوشوں پر بھی علمی حیثیت سے روشنی ڈالنا ضروری تھا تو اس کے نقشۂ عمل کی تکمیل کے لیے ان کی عملی نزاکتوں کا ظاہر کرنا بھی ناگزیر تھا۔ اگر قرآن نے ازدواجی زندگی کی تشریحات کرنا انسانیت کی تکمیل کے لیے ضروری سمجھا ہے تو ان نزاکتوں کی باریکیاں بھی اس نقشہ میں صفائی سے نظر آنی چاہئیں چہ جائیکہ باہمی معاملات کے فیصلے امت کی مہمات اور جنگ و صلح کی تدابیر جیسے مسائل نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔

احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی ذات کو صرف کسی خاص شعبہ زندگی کا نمونہ نہیں بنایا تھا بلکہ جو کچھ قرآن میں کہا گیا تھا وہ سب یہاں دکھلا دیا گیا تھا۔ ایک شخص نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا آپ ﷺ کے اخلاق کیا تھے فرمایا کہ یہ قرآن ہی آپ کا خلق تھا۔ خلق میں اقوال اور افعال سب داخل ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ آپ کا کوئی قول و فعل ایسا نہ تھا جو قرآن سے باہر ہو۔ گویا اسوۂ رسول کی جامعیت بھی قرآن کے ہم رنگ تھی۔ اس لیے آپ کی ذات کو بلا کسی تفصیل کے تمام عالم کے لیے اسوہ بنا دیا گیا تھا۔ ایک طرف خدا کی یہ جامع کتاب موجود تھی دوسری طرف یہ اسوۂ موجود تھا۔ خلاصہ یہ کہ ایک قرآن بشکل مصحف تھا اور دوسرا بشکل اسوۂ رسول۔ فرق یہ تھا کہ وہ خاموش تھا یہ ناطق۔ یہاں تیسری چیز احادیث رسول تھیں یہ بھی قرآن ہی کی ایک شکل تھی مگر وہ مجمل تھا یہ مفصل۔ یہ تینوں قرآن بلحاظ اجمال و تفصیل جدا جدا تھے مگر بلحاظ اصل حقیقت میں یہ ایک ہی قرآن تھا۔ (۲۲)

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے خود کئی حوالوں کے ساتھ اطاعت رسول کا بڑی توجہ سے بار بار حکم دیا۔

حجیت حدیث اور سنت

فلسفہ اطاعت کے تناظر میں

قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر خالق کائنات نے مخلوق کو اپنے رسول ﷺ کی غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا ہے اور کئی مقامات پر یہ تنبیہ بھی فرمائی ہے کہ جس نے میرے رسول کی فرمانبرداری سے یا اس کی اطاعت سے انحراف کیا وہ اپنے رب کا باغی ہے اور اس کی پاداش میں وہ انعامات الٰہی سے محروم اور عذاب وغضب کا حق دار ہے۔ اطاعت رسول کے بارے میں خالق کائنات نے ارشاد فرمایا۔

☆ **اطیعوا اللہ والرسول۔** (سورۂ آل عمران۔۳۲)

اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔

☆ **اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول۔** (سورۂ المائدہ۔۹۲ محمد۔۳۳، التغابن۔۱۲)

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔

☆ **من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔** (سورۂ النساء۔۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

ان تمام آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے ساتھ اپنے نبی کی اطاعت کو ہر شخص کے لیے غیر مشروط طور پر فرض قرار دیا ہے۔

☆ **یایھا الذین امنوآ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم ۚ فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر۔**

(سورۂ النساء۔۸۹)

اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے ارباب اختیار کی

اطاعت کرو پھر اگر تم کسی بات پر آپس میں نزاع کرنے لگو تو اسے (فیصلے کے لیے) اللہ اور رسول کے پاس لے جاؤ۔ اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

☆ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (سورۃ الاحزاب۔۲۱)

بے شک تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے۔

اس کے بعد اطاعت پر انعام اور بغاوت پر آلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

☆ وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ ط ولو انھم اذظلموآ انفسھم جآؤک فاستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول لو جدوا اللہ تواباً رحیما

(سورۃ النساء۔۶۴)

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی واسطے کہ اس کا حکم مانا جائے اللہ کے اذن سے اور اگر وہ لوگ جس وقت انہوں نے اپنا برا کیا تھا آتے تیرے پاس پھر اللہ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کو بخشواتا تو البتہ اللہ کو پاتے معاف کرنے والا مہربان۔

قل اِن کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ (آل عمران)

کہو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اطاعت کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

"مطلب یہ کہ جو لوگ میرے محبوب رسول کا اتباع نہیں کرتے اس کے نقش پا کو اپنا خضر راہ نہیں بناتے اور اس کے ارشادات کے سامنے سمعنا واطعنا کہتے ہوئے سر تسلیم خم نہیں کر دیتے اور پھر کہتے ہیں کہ اے رب ہمارے دل تیری محبت سے سرشار اور سینے تیرے نور عشق سے معمور ہیں وہ جھوٹے ہیں اور ان کا تو مجھ سے دور کا بھی واسطہ نہیں اگر واقعی انہیں مجھ سے الفت ہے تو میرے رسول کا اتباع کریں اس کا نتیجہ اور انعام یہ ہوگا کہ میں بھی ان سے محبت کرنے لگوں گا یعنی پہلے وہ صرف میرے محبّ تھے اور اس دعویٰ محبت کی صداقت پر ان کے پاس کوئی دلیل بھی نہیں تھی۔ لیکن جب میرے رسول کی غلامی کا شرف انہیں حاصل ہو جائے گا تو ان کا دعویٰ محبت بھی مسلمہ اور انہیں خلعت محبوبیت بھی مبارک۔

محبوبیت حقیقت میں اللہ اور رسول کی اطاعت فرماں برداری میں پختگی اور ثبات کا نتیجہ ہے۔ سورۂ آل عمران کی مندرجہ بالا آیت میں **تحبون اللہ** اور **یحببکم اللہ** کے الفاظ میں محبت کا جو ذکر کیا گیا ہے، اس پر اگر مزید غور کیا جائے تو حقیقت یوں اجاگر ہوتی ہے کہ پھر کسی کو انکار کی مجال نہیں ہے۔

محبت کیا ہے؟ بندے کی محبت اللہ تعالیٰ سے کیسے ہوتی ہے؟ اور اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے بندے سے ہو اس کے کیا معنی ہیں۔

محبت اس کشش اور میلان کو کہتے ہیں جو دل میں کسی باکمال ہستی کی طرف پیدا ہوتا ہے خواہ وہ کمال و جمال معنوی ہو یا صوری، حسن ظاہری ہو یا حسن سیرت وشمائل اور یہ جذبہ اسے اس ہستی سے قریب تر ہونے کے لیے بے تاب رکھتا ہے۔

بندہ جب یہ سمجھ لیتا ہے کہ گلستان حسن وخوبی کی ہر پتی اور ہر کلی پر اس ذات باکمال کا جمال جلوہ طراز ہے اور آنکھ جو کمال کہیں اور کسی شکل میں دیکھتی ہے۔ اس کا سرچشمہ وہی ذات صمدیت ہے تو اس کے عشق ومحبت اور اجلال واحترام کی محرابوں کے مصنوعی صنم پاش پاش ہو جاتے ہیں اور اس کے ان تمام جذبات کا مرکز صرف ایک وہی ذات رہ جاتی ہے۔ اس کا یہ جذبہ چونکہ ایجابی ہوتا ہے اس لیے اپنے محبوب حقیقی کی عبادت اور اطاعت میں عملی طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ جذب نہاں کی اس نمودار اور ظہور کو **محبۃ العبد اللہ** (بندے کی اللہ سے محبت) کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اگر خلوص نیت اور عزم صادق کی زاد لے کر وہ راہ عشق پر چل نکلے تو بارگاہ ربوبیت سے جلد ہی رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ (اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی) کی نوید جاں فزا سامع نواز ہوتی ہے اس سرفرازی اور پذیرائی کو اللہ تعالیٰ کی اپنے بندے سے محبت کہا جاتا ہے۔

دل عاشق میں وصال حبیب کے لیے بے قراری کو جو آگ بھڑک رہی ہوتی ہے وہ اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ کوئی ایسی صورت نکالے خواہ جان پر بھی کیوں نہ کھیلنا پڑے جس سے وصال میسر ہو۔ اب اگر اللہ تعالیٰ اپنے عاشقان دل فگار کی رہنمائی نہ فرمائے تو یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے عقل و فکر کی قوت سے قرب الٰہی حاصل کر سکیں کیوں کہ ان کی عقل کتنی ہی روشن ہو بہر حال محدود ہے۔

ان کا فکر کتنا ہی بلند پرواز ہو بہر حال انسانی فکر ہے۔ اسی لیے رب العالمین نے اپنا رسول بھیجا اور تمام دنیا والوں کو بتا دیا کہ اگر میری رضا اور قرب کے خواہش مند ہو اور میرے وصال کے طلب گار ہو تو گمان و تخمین کی دلدلوں میں نہ بھٹکتے پھرو بلکہ میرے رسول کا دامن پکڑ لو۔ اس کے بتائے ہوئے طریقے پر میری یاد کرو، اس کے سکھلائے ہوئے اسلوب پر میری عبادت کرو، اپنی اقتصادی، سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی مشکلات کو اس کے اشارات کے مطابق حل کرو۔

اب اگر کوئی محبت کا مدعی ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے نبی کی اطاعت نہیں کرتا تو وہ نادان ہے یا وہ اپنے دعویٰ محبت میں جھوٹا ہے۔

اسی پر اکتفا نہیں بلکہ اتباع نبی کریم ﷺ کی مزید برکات و خیرات کا بھی ذکر فرمایا کہ **یغفر لکم ذنوبکم** کہ اطاعت رسول کی برکت سے تمہارے گناہ بخش دیے جائیں گے اور تمہاری لغزشوں اور کوتاہیوں پر قلم عفو پھیر دی جائے گی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ قوموں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب ان کے گناہوں اور بدکرداریوں کی وجہ سے نازل ہوتا ہے۔ قیامت خیز قحط، ہلاکت آفرین جنگیں اور تباہ کن امراض کے شکنجہ میں قدرت کسی کو بلاوجہ نہیں کس دیتی بلکہ یہ انسان کی اپنی بداعمالیوں کا طبعی ردعمل ہوا کرتا ہے۔

لیکن اطاعت رسول عربی وہ اکسیر ہے جس سے جاں بلب مریض شفایاب ہو جاتا ہے۔ س کے اعجاز سے ان قوموں کو تاج سروری عطا کیا جاتا ہے جو قعر مزلت میں مدتوں سے پڑی سڑ رہی ہوتی ہیں۔ اس کے صدقے ان امتوں کو حیات نو اور ذوق عمل مرحمت کیا جاتا ہے جو اپنی ست گامی سے زندگی کی دوڑ میں شکست کھا چکی ہوتی ہیں۔

ایک قلب سلیم کے لیے تو اس روشن دلیل اور واضح برہان کے بعد کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہیں لیکن دبیر ازل قلم معجز نگار نے چونکہ اس مضمون کو مختلف اداؤں سے پیش فرمایا ہے اس لیے ان سے متمتع ہونا بھی عین سعادت ہے۔

سورۃ النساء میں ارشاد ہے:

تلک حدود اللہ ومن یطع اللہ ورسولہ یدخلہ جنٰت تجری من تحتھا

الانہر خلدین فیہا ط و ذالک الفوز العظیم (سورۃ النساء۔ ۱۳)

یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ اسے ان باغات میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں رواں ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

یہ دنیا دار العمل ہے اور ہمارا عقیدہ ہے کہ قیامت کے روز تمام مخلوقات کو پھر زندہ کیا جائے گا اور ان کے اعمال نیک و بد کا محاسبہ ہوگا۔ اطاعت کیش اور پاک باز جنت کی ابدی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے اور سرکشوں اور متکبروں کو دوزخ کا ایندھن بنایا جائے گا۔ اس جہاں میں ہمارا مقصد زیست، شوکت و سطوت، جاہ و منصب اور عیش و نشاط کے حصول تک محدود نہیں۔ گو ہم ان سے دست کش ہونا بھی کفران نعمت سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارا عقاب ہمت اس عالم آب و گل کے کہستانوں میں آشیانہ نہیں بناتا اس کا نشیمن تو فردوس اعلیٰ کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔

ہماری حقیقی کامیابی یہی ہے کہ ہم قیامت کے روز بارگاہ الٰہی میں سرخرو ہوں اور اس کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے یہی بتایا ہے کہ اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کے انعامات کے مستحق وہی ہیں جنہوں نے فرمان مصطفوی کو دل و جان سے تسلیم کیا ہے۔

اطاعت رسول کی برکات بیان کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی سے بھی روکا گیا ہے۔

یایہا الذین امنوآ اذا تناجیتم فلا تتناجوا بالاثم والعدوان و معصیت الرسول و تتناجوا بالبر والتقوی ط واتقوا اللہ الذی الیہ تحشرون۔

(سورۃ المجادلہ۔ ۹)

اے ایمان والو جب تم آپس میں مشورہ کرو تو گناہ کرنے، حد سے بڑھنے اور رسول کی نافرمانی کا مشورہ نہ کرنا اور نیکی اور پرہیز گاری کا مشورہ کرنا۔ اللہ سے ڈرو جس کی طرف اٹھائے جاؤ گے۔

یہاں اللہ رب العزت کیا دلکش اور محبت بھرے انداز میں مسلمانوں کو ایسی سرگوشیوں سے

روکتے ہیں جن میں فسق وتعدی اور فخر الرسل کی نافرمانی کی سازش کی جائے اور ساتھ ہی تنبیہ فرمادی کہ یہ تمہاری سرگوشیاں یا مشورے مجھ سے اوجھل نہیں ہیں اگر تم باز نہ آئے تو قیامت کے دن تمہیں رسوا کیا جائے گا۔

کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے دوزخ کی آگ میں جلنے والوں اور عذاب خداوندی میں گرفتار بدنصیبوں کا ذکر فرمایا کہ اس وقت ان کی آنکھیں کھلیں گی اور وہ اس وقت کف افسوس ملتے ہوئے اشک ندامت بہاتے ہوئے نہایت حسرت سے اپنے جرم کا اعتراف بدیں الفاظ کریں گے۔

☆ **یوم تقلب وجوھھم فی النار یقولون یلیتنا اطعنا اللہ واطعنا الرسولا۔**

(سورۃ الاحزاب۔٦٦)

جس دن ان کے منہ الٹ الٹ کر آگ میں جلائے جائیں گے وہ کہتے ہوں گے کہ کاش ہم نے خدا کی اطاعت کی ہوتی اور رسول کی اطاعت کی ہوتی۔

☆ **یومئذ یود الذین کفروا وعصوا الرسول لو تسوی بھم الارض ولا یکتمون اللہ حدیثا۔** (سورۃ النساء۔۴۲)

اس دن تمنا کریں گے وہ جنہوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی، کاش! انہیں مٹی میں دبا کر زمین ہموار کر دی جائے اور وہ کوئی بات اللہ سے چھپا نہ سکیں گے۔

☆ **قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم الاخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتو الکتب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون۔** (سورۃ توبہ۔۲۹)

ان سے لڑو جو ایمان لاتے تو اللہ پر اور قیامت پر اور حرام نہیں مانتے اس چیز کو جس کو حرام کیا اور اللہ اور اس کے رسول نے اور سچے دین کے تابع نہیں ہوتے یعنی وہ جو کتاب دیے گئے جب تک اپنے ہاتھ سے جزیہ نہ دیں ذلیل ہو کر۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے نہایت کھلے طور پر بیان کیا ہے کہ قرآن کریم کی اطاعت اور سنت نبی کریم کی اطاعت مساوی طور پر فرض ہے اور جو سزا قرآن سے سرتابی کرنے والے کی ہے اسی سزا

کا مستحق سنتِ نبوی کا منکر ہے۔

☆ **واذا قيل لهم تعالوا الى مآانزل الله والى الرسول رايت المنافقين يصدون عنك صدودا** (سورۃ النساء۔۶۱)

اور جب ان کو (جو ظاہر میں مسلمان ہونے کے مدعی ہیں) کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل فرمائی ہے اور اس کے رسول کی طرف۔ تو تم نے دیکھا منافقوں کو کہ وہ تم سے دور ہٹتے ہیں۔

قرآن کی اصطلاح میں وہ بھی منافق ہے جو حضور ﷺ کے ارشاد گرامی کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔ یعنی کوئی مسلمان تو سنت سے انحراف کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ سنت سے انحراف تو فقط منافقین کا شیوہ ہے۔

کیوں کہ اطاعت رسول رشد و ہدایت کی کفیل ہے اس سے انسان روز محشر کی ندامت سے محفوظ ہوسکتا ہے یہی بات جنت کی کلید ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت وسیع کا حق دار انہی لوگوں کو بتایا ہے جو اطاعت رسول میں کوشاں رہتے ہیں۔

☆ **ورحمتي وسعت كل شيء ط فساكتبها للذين يتقون ويوتون الزكوة والذين هم باٰيتنا يومنون ○ الذين يتبعون الرسول النبي الامي۔**

(سورۃ الاعراف۔۱۵۶۔۱۵۷)

اور میری رحمت شامل ہے ہر چیز کو۔ سو اس کو لکھ دوں گا ان کے لیے جو متقی ہیں اور زکوۃ ادا کرتے ہیں اور جو ہماری باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی اُمّی ہے۔ (۲۳)

غور و فکر اور تدبر کی بات ہے کہ کیا یہ قرآن حکیم کی تمام آیات حجیت حدیث کی وکیل نہیں ہیں؟

آیات بالا میں پورے عموم کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرماں برداری اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور اس کا ذمہ لیا گیا ہے کہ وہ جو کچھ پڑھ کر سنائیں گے، اس کے بعد جو اس کی مراد بیان کریں گے وہ سب کی سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگی جو کلمہ زبان سے نکالیں گے وہ

خواہشات نفس سے قطعاً پاک ہوگا۔ قرآن میں جو رائے دیں گے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگی حتیٰ کہ ان کے دل میں جو خطرات گزریں گے وہ بھی قدرت کی حفاظت کے نیچے رہیں گے اس کے بعد کیا یہ حق کسی کو ہوسکتا ہے کہ وہ رسول کے کلام میں اپنی جانب سے یہ تفریق پیدا کردے کہ جو اس نے قرآن کہہ کر سنایا وہ تو واجب الاطاعت ہے لیکن جو اس نے اس کی مراد کہہ کر بتائی یا جو خود فرمایا وہ واجب الاطاعت نہیں ہے بلکہ اس کو کوئی شرعی حیثیت بھی حاصل نہیں ہے۔ حالانکہ رسول بذات خود ایک شرعی منصب ہے وہ اس لیے آتے ہیں کہ دنیا کو ہدایت اور خدا کی رضامندی کی راہ دکھلائیں اس لیے اس بارے میں وہ جو کہتے ہیں وہ سب رب العزت کے رسول کی حیثیت سے کہتے ہیں۔ جو پہنچاتے ہیں وہ خدا ہی کا پیغام ہوتا ہے۔ اگر قرآن پہنچانا رسالت میں داخل ہے تو اس کی مراد بیان کرنا یا اس کی تفصیل بیان کرنا رسالت کا جز کیسے نہیں ہوسکتا۔ قرآن حکیم کی کسی ایک آیت میں بھی یہ اشارہ تک نہیں ملتا کہ رسول کی یہ تمام صفات صرف قرآن کے ساتھ مخصوص ہیں اور جب یہی رسول دین کے معاملہ میں کچھ اور کہتا ہے تو تب اس کی حفاظت نہیں کی جاتی یا پھر اس میں خواہشات نفس کا دخل ہونے لگتا ہے اور یہاں اس کی کوئی تشریعی حیثیت نہیں ہے۔ (۲۴)۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم میں سے جو اطاعت رسول کے خصائص معلوم ہوئے ہیں ان کی جھلک اس طرح ہے۔

۱۔ اپنے ہر معاملہ کو رسول اللہ کے سپرد کردینا پھر اس کے ہر فیصلہ کو حق سمجھنا اور اس فیصلہ پر ایسی خوشی سے راضی ہوجانا کہ اگر یہ دل کی مرضی کے خلاف ہو پھر بھی کوئی تنگی محسوس نہ کرنا۔

۲۔ رسول کے فیصلے کے خلاف اپیل نہ کرنا۔

۳۔ ان کے ہر فیصلہ پر رضامندی شرطِ ایمان ہونا۔

۴۔ ان کا ہر فیصلہ ناطق ہونا۔

۵۔ ان کی اطاعت میں ہدایت منحصر ہونا۔

۶۔ ان کی اطاعت بعینہٖ اللہ کی اطاعت ہونا۔

۷۔ ان کی اتباع میں اللہ کی محبت اور گناہوں کی مغفرت کا یقین حاصل ہونا۔

۸۔ کسی خاص مشورہ کی مجلس میں ان سے استیذان لازم ہونا اور اس اجازت کا معیار کمال ایمان ہونا۔

۹۔ ان کی اطاعت کے لیے کسی دلیل کا محتاج نہ ہونا۔

حجیت حدیث کا خود حدیث سے ثبوت

حدیث کو حجیت شرعیہ ثابت کرنے کے لیے خود احادیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے مثلاً

الدارمی نے حضرت جابرؓ کی سند سے یہ حدیث روایت کی ہے

☆ **لیوشک الرجل متکئا علی اریکته یحدث بحدیثی فیقول بیننا و بینکم کتاب اللہ ما وجدنا فیه من حلال استحللناه وما وجدنا فیه من حرام مناه وان ما حرم رسول اللہ فهو مثل ما حرم اللہ۔ (۲۵)**

ہوسکتا ہے کہ کوئی آدمی اپنی مسہری پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو اور اسے میری کوئی حدیث سنائی جائے تو کہنے لگے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب کافی ہے اس میں ہم جو حلال پائیں گے اسے حلال سمجھیں گے اور جو حرام پائیں گے اسے حرام قرار دیں گے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو اللہ کے رسول نے (بذریعہ حدیث یا سنت) حرام کر دیا ہو وہ اسی طرح ہے جس طرح وہ چیز اللہ تعالیٰ نے (بذریعہ کتاب) حرام ٹھہرائی ہو۔

☆ **یا ایها الناس انی قد ترکت فیکم ما ان اعتصمتم به فلن تضلو ابدا کتاب اللہ و سنة نبیه۔ (۲۶)**

لوگو میں نے تم میں دو چیزیں باقی چھوڑی ہیں کہ اگر تم ان پر مضبوطی سے قائم رہو گے تو کبھی بھی گمراہ نہیں ہوگے یعنی اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت۔

ان تمام آیات قرآن اور احادیث کی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ملت اسلامیہ کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے ہے۔ اس لیے متکلمین کے نزدیک عقائد میں احتیاج ایمان

بالرسول کے عقیدے پر خاص زور دیا گیا ہے۔ نبی کی رسالت پر عقیدہ مضبوط ہو جائے تو دوسرے تمام عقائد و احکام اس کی فرع کی حیثیت سے خودبخود ماننے پڑیں گے۔ حضرت محمد ﷺ کو نبی صادق ماننے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کچھ فرمائیں اس کی پیروی اس درجے میں لازم ہو جاتی ہے جس درجے میں وہ بتائیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس کلام کو قرآن مجید کہا ہم نے اسے قرآن مجید ہی مانا۔ جس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ وحی ہے۔ ہم نے اسے وحی تسلیم کیا ہے۔ جس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمائیں کہ یہ حکم الٰہی ہے وہ حکم الٰہی ہے۔ جسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرض بتائیں وہ فرض ہے اور جسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متروک کہیں وہ متروک ہے۔

الغرض دین کی بنیاد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث اور سنت پر اُستواری ہے۔ حدیث و سنت کے ذریعے ہی تو اذان کا طریقہ رائج ہوا۔ نمازوں کے اوقات متعین ہوئے نماز کی رکعتیں مقرر ہوئیں، زکوٰۃ کا نصاب اور اس کی مقدار معلوم ہوئی۔ حج کے ارکان واضح ہوئے۔ ان کے علاوہ عبادات، احوال شخصیہ، معاملات، معاشرت کے احکام جہاد، صلح و امن، حدود و تعزیرات و قصاص ہر نوع کے احکام امت کے لیے ممکن العمل ہے۔ کتاب اللہ نے تو ان احکام کو مجمل چھوڑا ہے اور حدیث و سنت نے ان کی تفسیر و توضیح جاری کی ہے۔

ذات نبوی میں علوم قرآنی کا ظہور

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ایک مرتبہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواباً فرمایا **وکان خلقه القرآن** یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلق (سیرت) یہ قرآن ہی تو ہے اور قرآن کے بارے میں خود صاحب سیرت و خلق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

ولایقضی عجائبه ولایخلق عن کثرة الدر

اس قرآن کے عجائبات (علوم و معارف) کبھی ختم ہونے والے نہیں اور یہ بار بار کی تکرار

سے کبھی بھی پرانا نہیں ہوگا۔ (کہ دل اس سے اکتا جائیں)

اس سے یہ صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ سیرت کے عجائبات بھی کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ ہے کہ قرآن میں لامحدود عجائبات علمی ہیں اور ذات بابرکات نبوی میں یہی عجائبات عملی صورت میں ہیں گویا ایک قرآن علمی ہے اور ایک قرآن عملی ہے جو کہ ذات نبوی میں محفوظ ہے اور دونوں آپس میں من وعن منطبق ہیں پس قرآن کا کہا ہوا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کہا ہوا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کہا ہوا قرآن کا کہا ہوا ہے۔ اس لیے قرآن کریم کی یہ ہزاروں آیتیں درحقیقت مقدمۂ سیرت کے عملی پہلو ہیں۔ قرآن میں جو چیز ''قال'' ہے وہی ذات نبوی میں ''حال'' ہے اور جو قرآن میں نقوش واؤ یا دال ہے وہی ذات اقدس کی سیرت و اعمال ہے۔ اس لیے قرآن حکیم کے مختلف مضامین سے اپنی اپنی نوعیت اور مناسبت کے مطابق سیرت کے مختلف انواع ثابت ہوتے ہیں۔

قرآن مجید میں ذات وصفات کی آیتیں آپ ﷺ کے عقائد ہیں اور احکام کی آیتیں آپ ﷺ کے اعمال۔ تکوین کی آیتیں آپ ﷺ کا استدلال ہیں اور تشریع کی آیتیں آپ ﷺ کا حال۔ قصص وامثال کی آیتیں آپ ﷺ کی عبدیت ہیں اور کبریائے حق کی آیتیں آپ ﷺ کی نیابت۔ اخلاق کی آیتیں آپ ﷺ کی حسن معیشت ہیں اور معاملات کی آیتیں آپ ﷺ کا حسن معاشرت۔ توجہ الی اللہ کی آیتیں آپ ﷺ کی خلوت ہیں اور تربیت خلق اللہ کی آیتیں آپ ﷺ کی جلوت۔ قہر وغضب کی آیتیں آپ ﷺ کا جلال ہیں اور مہر و رحمت کی آیتیں آپ ﷺ کا جمال۔ تجلیات حق کی آیتیں آپ ﷺ کا مشاہدہ ہیں اور ابتغاء وجہ اللہ کی آیتیں آپ ﷺ کا مراقبہ۔ نفی غیر کی آیتیں آپ ﷺ کی فنائیت ہیں اور اثبات حق کی آیتیں آپ ﷺ کی بقائیت۔ عذاب کی آیتیں آپ ﷺ کا خوف ہیں اور انعام کی آیتیں آپ ﷺ کا سکون وانس، وحی کی آیتیں آپ ﷺ کا عروج ہیں اور تعلیم وتبلیغ کی آیتیں آپ ﷺ کا نزول۔

غرض کسی بھی قوم کی آیت ہو وہ آپ ﷺ کی پیغمبرانہ سیرت اور کسی نہ کسی مقام نبوت کی تعبیر ہے۔ اس لیے یہ بات ایک ناقابلِ انکار حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ اگر قرآن کے علمی

عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے تو سیرت نبوی ﷺ کے عملی عجائبات بھی کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ اگر قرآن علمی طور پر قیامت تک بنی نوع انسان کی تکمیل کا ضامن ہے تو سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی یوم حشر تک اقوام عالم کی تسکین و تکمیل کی کفیل رہے گی۔ (۲۷)

انہی استدلال و توجیہات کی روشنی میں کہنا پڑتا ہے کہ قرآن کی شرعی تفسیر حدیث پاک ہے۔ قرآن اگر متن ہے تو حدیث اس کا بیان اور شرح ہے جس سے قرآن کی مخفی گوشے کھلتے ہیں اور مطالب خداوندی نمایاں ہوتے ہیں۔

ترتیب و تزئین پر غور کریں تب بھی قرآن میں اول ذات حق پھر اسی کی ربوبیت عامہ پھر رحمت عامہ پہ اور پھر مالکیت عامہ ہے۔ اس کے بعد عبادت و استقامت ہے سورۃ بقرہ کی ابتداء میں پہلے ایمان بالغیب پھر نماز انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ یعنی قرآن حکیم میں اولیت ایمان اور یقین واعتقاد کی ہے بعد میں عباوات اور اس کے بعد دنیا کی دوسری تفاصیل ہیں۔ اسی طرح عموماً کتب حدیث میں بھی اسی اسوۂ قرآنی کے مطابق ابواب و فصول کی ابتداء میں پہلے کتاب الایمان ہے پھر کتاب الصلوٰۃ، کتاب الصوم اور کتاب الحج ہے اس کے بعد اخلاق و معاملات، نکاح و طلاق، میراث پھر مسائل معاش، زراعت، تجارت، صنعت و حرفت پھر ان کے نفاذ کے لیے تعزیرات و کفارات اور پھر ان تمام ابواب کی حفاظت کے لیے آخر میں خلافت و امارت اور جہاد و سیاست کے ابواب لائے گئے ہیں۔ اس سے نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ذات رسول اللہ ﷺ اور قرآن حکیم دونوں آپس میں کس قدر لازم و ملزوم ہیں۔

تشریحاتِ قرآن میں احادیثِ رسول کی چند مثالیں

۱۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی

الذین امنوا ولم یلبسوآ ایمانهم بظلم اولئک لهم الامن وهم مهتدون

(سورۃ الانعام۔۸۳)

جو لوگ ایمان لائے پھر انہوں نے اپنے ایمانوں میں کوئی ظلم شامل نہیں کیا یہی لوگ ہیں

جن کو امن ملے گا اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔

صحابہ کرام نے یہ آیت سنی تو گھبرا اٹھے اور دربار رسالت میں عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم میں ایسا شخص کون ہے؟ جس نے ایمان لانے کے بعد کوئی ظلم اور معصیت نہ کی ہو لہذا اس آیت کے موجب تو ہم میں کوئی بھی امن اور ہدایت کا مستحق نہیں رہتا آپ ﷺ نے فرمایا یہاں ظلم سے مراد ہر معصیت نہیں ہے خاص شرک مراد ہے جیسا کہ دوسری آیت میں شرک کو بھی ظلم سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ کہ

ان الشرک لظلم عظیم (سورۂ لقمان۔۱۳)

شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

یہ جواب سن کر صحابہ کے دل مطمئن ہو گئے اور ان کا تردد جاتا رہا۔

۲۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن جس کا بھی حساب لیا گیا سمجھ لو کہ بس وہ ہلاک ہوا۔ اس پر ایک بی بی نے عرض کیا رسول اللہ ﷺ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ

فاما من اوتی کتبہ بیمینہ فسوف یحاسب حسابا یسیرا۔ (سورۂ الانشقاق۔۷۔۸)

جس شخص کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب نہایت نرمی سے ہوگا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہلاک نہیں ہوں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا حساب یسیر کے معنی یہاں یہ ہیں کہ ان کا اعمال نامہ ان کے سامنے رکھ کر ان کو صرف جتلا دیا جائے گا کہ تم نے فلاں فلاں عمل کیا ہے مگر اس پر باز پرس نہ ہوگی۔ اس کے سوا اگر کسی سے یہ سوال کر لیا گیا کہ یہ کام کیوں کیا تو بے شک اس کی خیر نہیں۔ یہ سن کر صحابہ کا شبہ رفع ہو گیا۔

۳۔ جب روزہ کے احکام میں یہ آیت نازل ہوئی

حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود۔ (سورۂ البقرہ۔۱۸۷)

کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ سیاہ و سفید دھاگہ میں تمہیں فرق معلوم ہونے لگے۔

تو عدی بن حاتمؓ نے دونوں دھاگے ایک سفید دوسرا سیاہ لے کر اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لیے اور رات کو ان دھاگوں کی طرف دیکھتے رہے۔ جب دونوں کا رنگ نظر آنے لگا تو انہوں نے کھانا

پینا بند کر دیا۔ آپ ﷺ کو جب اس بات کا پتہ چلا تو فرمایا اے عدی تمہارا تکیہ بڑا لمبا چوڑا محسوس ہوتا ہے جس میں رات اور دن دونوں سما جاتے ہیں یہاں سفید اور سیاہ دھاگے مراد نہیں ہیں۔ یہاں شب کی تاریکی اور ان کی سفیدی مراد ہے اس کے بعد مزید توضیح کے لیے آیت میں ''من الفجر'' کا ٹکڑا نازل ہو گیا تا کہ پھر غلط فہمی کا اعادہ نہ ہو۔

۴۔ بعض صحابہ کو آیت **ومن يعمل سوء او يظلم نفسه ثم يستغفر الله يجد الله غفورا رحيما.** (سورۃ النساء۔ ۱۱۰)

اور جو کوئی کرے گناہ یا اپنا برا کرے پھر اللہ سے بخشوادے تو پاوے اللہ کو بخشنے والا مہربان۔

اس آیت میں یہ شبہ ہوا کہ ہر انسان سے کوئی نہ کوئی قصور تو ہوتا ہی ہے لہٰذا اس آیت کے موافق تو ہر شخص کے لیے عذاب میں گرفتار ہونا ضروری ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہاں بدلہ سے جہنم کا عذاب مراد نہیں ہے بلکہ ہر وہ تکلیف ہے جو انسان کو دنیا میں پہنچتی ہے وہ بھی اس کی فروگذاشت کا بدلہ بن جاتی ہے۔

۵۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ قیامت میں باری تعالیٰ کا دیدار ہو گا۔ صحابہ اہل زبان تھے رؤیت کا مفہوم ان کو معلوم تھا اس لیے رؤیت کے مفہوم میں ان کو کوئی مغالطہ نہیں ہوا۔ انہوں نے اس کی پوری حقیقت سمجھ لی مگر اس کی تفصیل سمجھنے میں انہیں دشواری پیش آئی۔ کیوں کہ دنیا میں معمولی اجتماع کے وقت کسی ایک شخص کو اطمینان سے دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ پھر قیامت میں جہاں اولین و آخرین کا بہت بڑا اجتماع ہو گا۔ ایک خدا کی رؤیت کیسے ہو گی۔ بظاہر بہت سی گردنیں پھلانگنی پڑیں گی بہت سے کندھے اچھل جائیں گے۔ اور پھر بھی شاید اہل محشر برابر کی رؤیت سے فیض یاب نہیں ہو سکیں گے۔ آپ ﷺ نے نہایت حکمت سے فرمایا کہ عالم مخلوق کو ہی دیکھو آفتاب اور چاند تمہارے سامنے نہیں جس طرح ہم ان دونوں چیزوں کو بغیر کسی مزاحمت درکاوٹ کے دیکھتے ہیں اس سے بھی زیادہ صفائی کے ساتھ ہم محشر میں اللہ کو دیکھ سکیں گے۔ جب عالم مخلوقات میں تمہاری آنکھوں کے سامنے ایک مثال نہیں بلکہ دو مثالیں ہیں جہاں تمام عالم کو بیک وقت دیدار میں کوئی

دشواری پیش نہیں آتی۔ تو خالق کے دائرہ میں بھی جو اس سے کہیں اعلیٰ و ارفع ذات ہے کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ آپ ﷺ کی اس مثال کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔

وجوہ یومئذ ناضرۃ ○ الی ربھا ناظرۃ۔ (سورۃ القیامہ۔ ۲۲۔ ۲۳)

اس دن بہت سے لوگوں کے چہرے ٹکٹکی لگائے اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

۶۔ ایک مرتبہ تقدیر کے مسئلہ پر صحابہ کرام کو یہ شبہ ہوا کہ جب ہمارے اعمال پہلے سے طے شدہ لکھے جا چکے ہیں تو اب آئندہ عمل کی جدوجہد کرنا بے کار ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کیوں نہ بیٹھے رہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم سعید لکھے جا چکے ہو تو تم سے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اعمال صالحہ نہ کرو اور اگر خدانخواستہ تقدیر دوسری طرف جا چکی ہے تو اعمال صالحہ کی ہزار کوشش کرو مگر تم کر ہی نہیں سکتے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ عمل کی جدوجہد کرنا تقدیر سے باہر کی بات ہے؟ ایسا نہیں ہے بلکہ تقدیر کا وسیع احاطہ جہاں سزا و جزا کو محیط ہے ایسا ہی عمل خیر اور عمل شر کو بھی محیط ہے۔ لہٰذا کسی انسان سے وہی عمل صادر ہوگا جو تمہاری تقدیر کے مطابق ہوگا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔

فاما من اعطی و اتقی ○ و صدق بالحسنی ○ فسنیسرہ للیسری ○ و اما من بخل و استغنی ○ و کذب بالحسنی ○ فسنیسرہ للعسری ○ (سورۃ اللیل۔ ۵ تا ۱۰)

یعنی نیکی کی توفیق اور بدی سے احتراز سب اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ہی میسر آتا ہے۔

۷۔ **یوم القیمۃ و السموات مطویت بیمینہ۔** (سورۃ الزمر۔ ۶۷)

اس دن جب کہ زمین اپنی حالت سے بدل دی جائے گی اور آسمان دست ایزدی سے لپٹے ہوئے ہوں گے۔

صحابہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ ﷺ جب ایک طرف زمین اپنی موجودہ حالت سے بدل دی جائے گی۔ اور آسمان بھی لپیٹ دیے جائیں گے تو اس وقت خدا کی یہ ساری مخلوق کہاں چلی جائے گی؟ فرمایا پل صراط پر۔

۸۔ صحابہ کرام نے جب بار بار یہ سنا کہ مرنے کے بعد پھر ایک مرتبہ زندہ ہونا ہے تو انہوں نے عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ مٹی ہونے کے بعد، ریزہ ریزہ ہونے کے بعد نئے سرے سے زندگی

کیسے ہوگی فرمایا کبھی بارش سے پہلے تم نے زمین کی حالت دیکھی ہے؟ کیسی خشک اور بے آب وگیاہ نظر آتی ہے پھر بارش کے بعد کتنی سبز اور تر و تازہ ہو جاتی ہے۔ وہ تنکے جو ابھی زمین پر مردہ لیٹے ہوئے تھے ایک چھینٹا پڑنے کے بعد ہی کیسے اکڑے ہوئے ہو جاتے ہیں۔

فلک تخرجون

پس اس طرح مرنے کے بعد تم بھی پھر سے جی اٹھو گے۔

۹۔ قرآن کریم کی بے شمار آیتوں میں وحی کا لفظ آیا ہے۔ عرب وحی کے لفظ اور اس کی عام شرح سے واقف تھے لیکن وحی رسالت اور وحی نبوت کی تفصیل نہ جانتے تھے۔ اس لیے آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ آپ پر وحی کس طرح نازل ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے اس کی اجمالاً تین صورتیں بتائیں۔ جو صحیح بخاری کے پہلے ہی صفحہ پر مذکور ہیں ایک مرتبہ ایک شخص کو عین حالت وحی میں آپ ﷺ کو دیکھنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے ایک موقع پر کہا کہ آؤ اس وقت نبی ﷺ پر وحی نازل ہو رہی ہے آکر دیکھ لے۔ دیکھا تو آنحضرت پر شدت وحی کی وہی کیفیت طاری تھی جو آپ سے سنا کرتا تھا۔

۱۰۔ **یاخت ھرون ما کان ابوک امرا سوء وما کانت امک بغیا** (سورۂ مریم۔۲۸)

اس پر بعض اہل کتاب نے صحابہ سے سوال کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یہ ہارون علیہ السلام کی بہن کہاں سے آگئیں حضرت ہارون اور موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ تو ایک ہی ہے جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان تو بہت بڑی مدت ہے۔ صحابہ نے اس سوال کے جواب میں مشکل محسوس کی تو آپ ﷺ سے دریافت کیا۔ فرمایا یہ وہ ہارون نبی نہیں ہیں بلکہ ان کے ہمنام ایک اور شخص ہیں۔

۱۱۔ بعض صحابہ نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا آیت **لقد کان لسبا**۔ (سورۂ سبا۔۱۵) میں سبا کسی عورت کا نام ہے یا ملک کا۔ آخر تمام صحابہ جغرافیہ دان تو تھے نہیں بلکہ اُمّی لوگ تھے ان کے دماغوں میں ایسے سوالات آجانا کچھ بعید نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہ کسی عورت کا نام ہے نہ کسی ملک کا بلکہ ایک شخص کا نام ہے جس کی طرف عرب کے دس قبائل مشہور ہیں۔

۱۲۔ ایک مرتبہ صحابہ کا ایک طبقہ جن کا گزر بسر بیشتر سمندر کے شکار پر منحصر تھا۔ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا یا رسول اللہ ﷺ ہم لوگ اکثر سمندر میں سفر کرتے ہیں اور صرف پینے کے لیے تھوڑا سا پانی ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔ یا اسے پی سکتے ہیں یا اس سے وضو کر سکتے ہیں اور اگر اسے پی لیں تو کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں؟ اس کا پانی اور مردار (یعنی پانی سے باہر مچھلی) دونوں پاک ہیں۔ سوال کی وجہ یہ تھی کہ قرآن کریم میں جس پانی کی صفت بتائی گئی تھی وہ بارش کا پانی تھا۔

وانزلنا من السمآء مآء طھورا۔ (سورۃ الفرقان۔ ۴۸)

اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی اتارا ہے۔

کنوئیں کا پانی بھی دراصل یہی پانی ہوتا ہے جو جذب ہو کر زمین کی تہہ میں چلا جاتا ہے اور جذب ہو کر محفوظ ہو جاتا ہے۔ سمندر کا پانی دوسری قسم کا پانی تھا۔ اس کا ذائقہ جدا اور رنگ بھی جدا تھا پھر اس میں بہت سے جانور بھی مرتے رہتے تھے۔ اس لیے صحابہ کا یہ سوال بے جا نہیں تھا۔ مگر حضور ﷺ کا یہ جواب سن کر وہ مطمئن ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ایک کنواں بیر بضاعۃ کے نام سے بھی مشہور تھا اس کے ذریعے چند کھیتوں کی آب پاشی بھی کی جاتی تھی۔ چونکہ جنگل میں واقع تھا اس جنگل کے کنوؤں کی طرح وہ بھی محفوظ نہیں رہتا تھا۔ ہر چند کہ آب پاشی کی وجہ سے اس کا پانی اکثر نکلتا رہتا تھا۔ تاہم نفیس المزاج صحابہ کو یہ سوال کرنا پڑا کہ وہ ایک کنواں ایسا ہے جس میں طرح طرح کی نجاستوں کا پڑنا بھی بہت قرین قیاس ہے۔ لہٰذا کیا اس کا پانی وضو کے قابل ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا (شبہ مت کرو) جب تک کہ نجاست کا اثر پانی میں ظاہر نہ ہو جائے۔ قدرت نے جب پانی کو پاک پیدا کیا ہے تو جب تک کوئی دلیل ظاہر موجود نہ ہو اسے ناپاک نہیں کہا جا سکتا۔ اگر محض شبہ کی بنا پر پانی کو ناپاک کہہ دیا جائے تو عرب جیسی سرزمین پر یہ حکم بڑی تنگی کا باعث بن جائے گا۔

۱۳۔ حضرت ام سلمہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ میں اپنے بال سخت گوندھتی ہوں کیا جنابت کے بعد غسل میں پورے اور ہر بار کھولنے چاہئیں آپ نے فرمایا نہیں جڑوں میں پانی پہنچا لینا کافی ہے۔

۱۴۔ ایک عورت اپنی قمیض کا دامن ذرا لمبا رکھتی تھی جب مسجد جاتی تو دامن زمین پر گھسٹتا اس لیے اس کو وہم ہوا کہ شاید ناپاک ہو جاتا ہوگا۔ آپ سے عرض حال کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا پاک کپڑا زمین کے ساتھ گھسٹنے سے ناپاک نہیں ہوتا جب تک کہ اس پر ناپاکی کا کوئی اثر ظاہر نہ ہو۔

۱۵۔ ایک مرتبہ گھی میں چوہیا گر گئی اور مر گئی۔ اس گھی کے متعلق آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر گھی جما ہوا ہے تو چوہیا نکال کر پھینک دو اور ارد گرد کا گھی بھی پھینک دو بقیہ گھی استعمال کر لو اگر گھی پگھلا ہوا ہے تو اب کھانے کے قابل نہیں رہا۔

۱۶۔ آپ سے مردار کی کھال کے متعلق پوچھا گیا کہ اسے استعمال کر سکتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں دباغت اسے پاک کر دیتی ہے۔

۱۷۔ ایک بادیہ نشین نے پوچھا ہم چار چار مہینے ریگستان میں رہتے ہیں پانی نہیں ملتا غسل کے موقع پر ہم کیا کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تیمم کر لیا کرو تمہارے لیے یہی کافی ہے۔

۱۸۔ ایک شخص نماز کے اوقات معلوم کرنے کے لیے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ ﷺ نے فرمایا دو دن ہمارے ساتھ نماز پڑھو۔

۱۹۔ ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ دن اور رات میں وہ کونسی گھڑی ہے جب پروردگار اپنے بندوں کے سب سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا آخر شب۔

ان تمام مثالوں سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ یہ تمام الجھنیں صحابہ نے آنحضرت ﷺ کے سامنے پیش کیں جن کا جواب آپ ﷺ نے دے دیا۔ سوال یہ ہے کہ آج اگر ہم میں سے کوئی عمل کے لیے قدم اٹھائے اور ہمیں بھی اس طرح کی الجھنیں پیش آئیں تو کیا ایسے سوالات کے جوابات صرف قرآن یا عقل کی مدد سے دیے جا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ یہ الجھنیں حدیث کی مدد کے بغیر حل نہیں ہو سکتیں۔ (۲۸)

قرآن مجید نے متعدد مقامات پر جائز و ناجائز دونوں قسم کی اشیاء کے لیے احکام بیان کیے ہیں پھر کچھ اشیاء ایسی رہ جاتی ہیں جن میں اجتہاد اور غور و فکر کی گنجائش ہے اگر غور و فکر اور نتیجہ اخذ کرنے کے مقدمات آسان ہوں تو حدیث و سنت بسا اوقات اسے اصحاب اجتہاد کی رائے پر چھوڑ

دیتی ہے اور اگر نتیجہ اخذ کرنے کے مقدمات گہرے ہوں یا ان کا حکم قیاس فقہی کے اصول پر نہ ہو تو ان صورتوں میں حضور اکرم ﷺ کی طرف سے بیان آ جاتا ہے جس کی رو سے وہ اشیاء کی ایک طرف (یعنی جائز یا ناجائز) شمار ہو جاتی ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ویحل لهم الطیبت و یحرم علیهم الخبئث۔ (سورۃ الاعراف۔۱۵۷)

اس ارشاد کی رو سے پاکیزہ اشیا حلال اور گندی اشیا حرام ٹھہریں۔ کچھ اشیاء مشتبہ رہ گئیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہر ڈاڑھ والا درندہ اور ہر پنجے والا (شکاری) پرندہ حرام ہے۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا کہ یہ اشیا ناپاک ہیں۔ ان کے مقابلے میں فاختہ، خرگوش وغیرہ چند اشیا کو پاکیزہ اشیا کے ساتھ ملحق فرما دیا۔ اسی طرح قرآن مجید نے پانی، دودھ، شہد وغیرہ مشروبات کو حلال اور شراب (خمر) کو حرام قرار دیا، حضور اکرم ﷺ نے اولاً کھجور کا شیرہ ان برتنوں میں رکھنا جن میں پہلے شراب بنانے کا دستور تھا سدّ ذرائع کے طور پر ممنوع ٹھہرایا اور جب کچھ وقت گزر گیا اور حکم منقطع ہو گیا تو فرمایا شیرے میں کوئی حرج نہیں۔ ہاں جو مشروب مقدار میں زیادہ نشہ آور ہو اس کا تھوڑی مقدار میں پینا بھی حرام ہے۔

قرآن مجید نے کچھ احکام بیان کیے اور حدیث و سنت نے ان کے ساتھ کچھ اور احکام ایسے شامل کیے جو ان پر قیاس کیے جا سکتے ہیں، مثلاً قرآن مجید نے دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا حرام ٹھہرایا۔ حدیث و سنت نے اس کے ساتھ پھوپھی اور بھتیجی کو یا خالہ اور بھانجی کو بھی اکٹھا نکاح میں رکھنا ممنوع ٹھہرایا۔

قرآن مجید کچھ احکام متفرقاً بیان کر دیتا ہے حدیث و سنت وہ قاعدہ کلیہ بیان کر دیتی ہے جو ان متفرق احکام سے ماخوذ اور ان کی مصلحت پر مشتمل ہے مثلاً قرآن مجید نے بیوی کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے روکے رکھنا، کسی عورت کو بچے کی وجہ سے تکلیف دینا۔ (سورۃ البقرہ ۲۳۱ تا ۲۳۲) مطلقہ عورتوں کو مدت عدت کے اندر تنگ کرنا۔ (سورۃ الطلاق۔ ۱) ممنوع قرار دیا۔ سنت نے اس سے کلیہ اخذ کیا **لا ضرر و لا ضرار**۔ (۲۹)

بعض اصحاب نے احادیث کے تفصیلی احکام کے لیے قرآن مجید سے تفصیلی مآخذ تلاش کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ فاطمہ بنت قیس کہتی ہیں کہ مجھے بائن طلاق ملی تھی اور حضور اکرم ﷺ نے میرے لیے مسکونہ مکان کا حق نہیں دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس نے گھر والوں کے ساتھ زبان درازی کی تھی یہ گویا اس آیت کی تفسیر تھی۔

لا تخرجوهن من بيوتهن ولا يخرجن الآ ان ياتين بفاحشة مبينة۔

(سورۃ الطلاق۔ا)

ان عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ ہی وہ نکلیں سوائے اس صورت کے کہ کھلی بے حیائی کا کام کریں۔ (۳۰)

الغرض دین اسلام کو ایک کامل ضابطۂ حیات کی حیثیت سے سمجھنے کے لیے قرآن کے ساتھ دیث یا سنت کو رجوع کرنا ازبس ضروری ہے یہ وہ چشمۂ صافی ہے جس سے اسلامی تعلیمات اور دینی احکام و مسائل کے سوتے پھوٹتے ہیں کتاب الٰہی مجموعہ قوانین اور اسلامی طرز زندگی کے صول و قواعد کی جامع ہے جب کہ حدیث نبوی اس کے اجمال کی تفصیل اور ابہام کی توضیح پیش کرتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر قرآن حکیم کو سمجھنے کی کوشش میں حدیث و سنت سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے تو قرآن حکیم مبہم امر و نواہی اور قصص کا ایک مجموعہ ہو کر رہ جائے گا اور اسلام کے مکمل و مفصل ستور اساسی ہونے کی حیثیت بڑی حد تک باطل ہو جائے گی۔ مثلاً اقیموا الصلوٰۃ کے معنی و مصداق ی تحقیق میں اگر حدیث اور سنت سے مدد نہ لی جائے تو اس حکم کی تعمیل میں عجیب قسم کا انتشار نظر آئے گا۔ صلوٰۃ کے لغوی معنی دعا یا عبادت گاہ کے ہیں۔ حدیث و سنت کی رہنمائی کے بغیر کوئی تو صلوٰۃ کے عمل میں صرف دعائیں کرتے رہیں گے اور اس کے لیے بھی کوئی خاص شکل اور کوئی خاص وقت نہیں ہوگا۔ اور **وارکعو مع الراکعین** کے امر کی تعمیل میں بھی اسی طرح ہڑبونگ نظر ئے گی۔ رکوع کے معنی لغت میں مطلق انحنا (جھکنا) ہیں اب اگر رکوع کو اس کی حقیقت شرعیہ جس کا ثبوت صرف سنت سے ملتا ہے) سے الگ کر دیا جائے تو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ ارکعو مع الراک(سورۃ البقرہ۔۴۳) کے معنی کیا ہیں اور اس کا مقصد کیا ہے۔ اس کے

علاوہ زکوٰۃ، حج، اوقات وارکان صلوٰۃ، ربٰو وغیرہ میں سے کسی کی صحیح حقیقت سمجھ ہی نہیں آسکتی اور پورے قرآن کو پڑھنے کے بعد بھی عبادات و معاملات کا کوئی مکمل جماعتی نقشہ مرتب نہیں ہوسکتا۔

امام بیہقی نے اپنی سند سے شیب بن فضالۃ المکی سے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ عمران بن حصینؓ نے چند لوگوں کے سامنے شفاعت کا بیان کیا تو ایک شخص بولا اے ابوجنید تم ہمارے سامنے وہ حدیثیں بیان کرتے ہو جن کی اصل ہم کو قرآن میں نہیں ملتی عمران یہ سن کر غضبناک ہو گئے اور آپ نے اس شخص سے فرمایا تم نے قرآن پڑھا ہے؟ اس نے کہا ہاں! فرمایا کیا تم نے قرآن میں کہیں پڑھا ہے کہ عشاء کی فرض رکعتیں چار، مغرب کی تین فجر کی دو اور ظہر وعصر کی چار چار ہیں۔ بولا نہیں۔ حضرت عمران بن حصینؓ نے فرمایا کیا ان سب رکعتوں کا علم تم نے ہم سے حاصل نہیں کیا اور کیا ہم نے ان کو آنحضرت ﷺ سے نہیں سیکھا ہے؟ پھر عمران بن حصینؓ نے سوال کیا کیا تمہیں قرآن میں کوئی ایسی آیت ملی ہے جس میں بتایا گیا ہو کہ چالیس بکریوں میں ایک بکری زکوٰۃ کی اور اتنے اونٹوں میں سے ایک اونٹ اور اتنے درہم میں سے ایک درہم زکوٰۃ کا ادا کرنا ہوگا اس شخص نے کہا نہیں۔ آپ بولے کیا زکوٰۃ کی ان تمام مقادیر اور نصاب کا علم تم نے ہم سے اور ہم نے رسول اللہ ﷺ سے نہیں سیکھا ہے۔ اس کے بعد عمران نے فرمایا قرآن مجید میں ہے **ولیطوفوا بالبیت العتیق** (سورۃ الحج۔ ۲۹) تو کیا قرآن نے تم کو یہ بتایا ہے کہ سات طواف کیا کرو اور اس سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت ادا کیا کرو۔ پھر فرمایا تم نے سنا نہیں قرآن نے خود ہی تو کہا ہے۔

وما اتکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنه فانتھوا۔ (سورۃ الحشر۔ ۷)

جو کچھ رسول تمہیں دے لے لو اور جس سے منع کردے رک جاؤ۔

اس تقریر کے بعد عمران بولے یہ اسلامی احکام (جو عبادات و معاملات سے متعلق ہیں) سب کے سب ہم نے قرآن پڑھنے کے بعد حضور اکرم ﷺ سے سیکھے ہیں۔ (۳۱)

اگر فہم قرآن میں سنت سے مدد نہ لی جائے تو اس سے نہ صرف یہ کہ منقولات شریعہ یعنی وہ الفاظ جو لغتاً کسی معنی میں مستعمل ہوئے تھے لیکن شریعت نے ان کے معانی مخصوص متعین کر دیے ہیں۔ مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، اعتکاف، طواف وغیرہ کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ بلکہ لغت کی روشنی میں بھی

بعض آیات کے مفہوم کو صحیح طور پر متعین نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام زبان دان اور عربی فصاحت و بلاغت سے پورے طور پر واقف ہونے کے باوجود بعض آیات کا مطلب نہیں سمجھتے تھے ور آنحضرت ﷺ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ جب آیت **والله على الناس حج البيت من ستطاع اليه سبيلا** (سورۂ آل عمران۔۹۷) نازل ہوگئی تو ایک صحابی نے دریافت کیا یہ حکم اسی سال کے لیے ہے یا پھر ہر سال کے لیے؟ پھر آپ نے بتایا کہ ایک شخص پر عمر بھر میں ایک مرتبہ حج رنا فرض ہے بشرطیکہ اس میں فرضیت حج کی شرائط پائی جائیں۔

تیمم کی آیت نازل ہوئی۔

فلم تجدوا مآء فتيمموا صعيدا طيبا. (سورۂ المائدہ۔٦)

پس پھر اگر تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کر لو۔

اس آیت کے نزول پر صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ کیا تیمم صرف وضو کی ضرورت کے لیے ہے یا غسل کے تقاضے بھی پورے کرتا ہے۔ چنانچہ ایک صحابی کو سفر میں غسل کی ضرورت پیش آ گئی اور وہاں پانی نہیں تھا انہوں نے اپنے اجتہاد سے اپنے تمام بدن کا مٹی سے تیمم کر لیا۔ آنحضرت ﷺ کو واقعہ کی اطلاع ہوئی تو فرمایا جو تیمم وضو کا قائم مقام ہے وہی غسل کا بھی ہے۔

پھر یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ بعض اوقات کسی کلام کا صحیح مفہوم صرف خاطب کے ذریعہ متعین ہو سکتا ہے مثلاً فرض کریں آپ اپنے کسی بیمار دوست کی عیادت کے لیے گئے ہیں اور اس کے مزاج کی کیفیت دریافت کرتے ہیں تو وہ اکتائے ہوئے لہجہ میں کہتا ہے "اچھا ہوں" اس جواب کا بظاہر مطلب یہی ہے کہ وہ تندرست ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ بیمار دوست نے جو "اچھا ہوں" کہا ہے وہ کس لہجہ میں کہا تھا اور اس بنا پر اس کا مطلب وہ نہیں ہے جو اس کے لفاظ ظاہری معنی دیتے ہیں بلکہ چونکہ وہ بیماری سے اتنا نڈھال، کمزور اور نحیف ہو گیا ہے کہ وہ وچتا ہے اب میں اپنے بارے میں کیا بیمار، بیمار کہوں بس یہی کہنا چاہیے "اچھا ہوں"۔

پس جب آپ روزمرہ زندگی کی گفتگو میں بعض جملوں کا مطلب ان کے ظاہر المعانی نے کے باوجود مخاطب کی امداد کے بغیر نہیں سمجھ سکتے تو قرآن مجید کو سنت سے الگ

طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ جب کہ یہ بھی معلوم ہے کہ قرآن حکیم شرعی احکام کی کتاب سماوی ہے اور اس کا نزول ایک خاص وقت میں ماحول کے پیش آمدہ مسائل کے جواب میں ایک خاص قسم کی نفسیات و طبائع رکھنے والی قوم کی زبان میں ہوا ہے اور جس میں اخلاق و کردار کی اصلاح کے نفسیاتی اصولوں کو کہیں نظر انداز نہیں کیا گیا۔

صحابۂ کرام اور حدیث و سنت کا احترام

صحابۂ اکرام حدیث اور سنت کے احترام کے متعلق انتہا درجے کے قائل اور عامل تھے اس کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ اگر صحابہ کرام کسی مسئلہ کی نسبت کوئی حکم صادر فرما دیتے لیکن ان کو بعد میں معلوم ہوتا کہ آنحضرت ﷺ کا فتویٰ اس کے خلاف ہے تو فوراً اس سے رجوع کر لیتے تھے مثلاً حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ دیت عاقلہ کے لیے ہے اور کسی عورت کو شوہر کی دیت میں سے وراثت نہیں مل سکتی۔ ضحاک بن سفیان نے انہیں بتایا کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے ان کو لکھا تھا کہ اشیم الضبی کی بیوی کو اس کی دیت میں سے حصہ دے دیا جائے حضرت عمرؓ نے یہ سن کر اپنے قول سے رجوع کر لیا۔ (۳۲)

اسی طرح جنین کی دیت کے بارے میں حضرت عمرؓ کا قیاس تھا کہ عام دیتوں کی طرح اس میں گائے بکری وغیرہ دینی ہوگی لیکن جب حضرت مغیرہ بن شعبہ سے آپ کو معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے اس مسئلہ میں ایک غلام یا باندی کے آزاد کرنے کا حکم دیا ہے تو آپ نے حضرت مغیرہ سے ان کی روایت پر ایک گواہ طلب کیا اور جب محمد بن مسلمہ نے گواہی دے کر اس کی توثیق کر دی تو حضرت عمرؓ کو اطمینان ہو گیا اور پھر آپ نے اس حدیث کی روشنی میں ہی دیت جنین کے متعلق فیصلہ کیا۔ (۳۳)

بعض روایتوں میں تو یہاں تک آیا ہے کہ اس قسم کے ایک معاملہ میں حضرت عمرؓ نے ایک صحابی کی زبانی حدیث سن کر ارشاد فرمایا۔ ''اگر ہم یہ روایت نہ سنتے تو قریب تھا کہ اپنی رائے سے کام لے کر رسول اللہ ﷺ کے خلاف کوئی حکم صادر کر بیٹھتے''۔

صحابہ اگر کسی چیز پر عامل ہوتے اور ان کو معلوم ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ کا کوئی قول یا فعل اس کے خلاف ہے تو فوراً اس سے تائب ہو جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ ایک مرتبہ شام تشریف لے جا رہے تھے کہ مقام سرغ پر پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ وہاں وبا پھیلی ہوئی اب آپ بڑے متردّد ہوئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ''اگر کسی شہر میں وبا پھیلی ہوئی ہو تو وہاں مت جاؤ اور اگر تم کسی شہر میں موجود ہو اور وہاں وبا پھیلنی شروع ہو جائے تو اس کے خوف سے بھاگو مت'' حضرت عمرؓ اللہ عنہ سن کر سرغ سے واپس تشریف لے آئے۔

کسی مسئلہ میں اگر صحابہ کو کوئی شک ہوتا تھا تو خود اقدام نہیں کرتے تھے۔ پہلے اس کا حکم کتاب اللہ میں تلاش کرتے اگر وہاں نہ ملتا تو سنت میں تلاش کرتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس ایک عورت آئی جس کے نواسہ کا انتقال ہو چکا تھا اس نے اپنے حق وراثت کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا تمہارے لیے قرآن میں کوئی حکم نہیں ہے اور جہاں تک مجھ کو معلوم ہے سنت میں بھی کچھ نہیں ہے ساتھ ہی آپ نے ساتھی صحابہ سے اسی بابت دریافت فرمایا تو حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''میں آنحضرت ﷺ کے پاس موجود تھا آپ ﷺ نے اس طرح ایک معاملہ میں نانی کو چھٹا حصہ دلوایا تھا حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کوئی گواہ ہے۔ محمد بن مسلمہ الانصاری کھڑے ہو کر بولے میں ہوں۔ یہ سن کر حضرت صدیق اکبرؓ نے اس عورت کو چھٹا حصہ دینے کا حکم صادر فرمایا۔ (۳۴)

صحابہ کرام جو زبان دان ہونے کے باوصف درس گاہ نبوت سے براہ راست فیض یاب ہوتے تھے اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ قرآن حکیم کی بہت سی آیتیں مجمل ہیں لہٰذا ان کی تشریح وتوضیح اقوال اور اعمال رسول کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔

حفاظت حدیث

جمع و تدوین سیرت کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے معروف اسلامی و دینی محقق پروفیسر حافظ احمد یار لکھتے ہیں ''تمام بنیادی اسلامی علوم مثلاً تفسیر و قرأت، حدیث و فقہ اور سیرت یا تاریخ اسلام کی تدوین کا قصہ یکساں ہے۔ ان سب چیزوں کی حفاظت کا کام عہد رسالت میں ہی شروع ہوگیا تھا لیکن ایک ایک موضوع پر مستقل اور الگ الگ چھوٹی کتابیں لکھنے کا رواج پہلی اور دوسری صدی ہجری میں ہوا۔ پھر ان چھوٹی تالیفات اور مختصر رسائل وغیرہ سے مواد لے کر یکجا کر کے ایک ایک موضوع پر بڑی کتابیں لکھنے کا کام تیسری اور چوتھی صدی میں مکمل ہوا۔ اس تاخیر کی ایک معقول وجہ ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ کے احکام و تعلیمات کی تفصیلات (حدیث) یا آپ ﷺ کی زندگی کے حالات کی تفصیلات (سیرت) کے بارے میں کوئی بھی جامع کتاب تیار کرنا آپ ﷺ کی وفات کے بعد کم از کم تین چار نسلیں گزر جانے سے پہلے ممکن ہی نہیں تھا۔

وجہ یہ تھی کہ نبی ﷺ کی ذات گرامی، آپ ﷺ کی تعلیمات، آپ ﷺ کے حالات وغیرہ کے بارے میں جملہ معلومات آپ ﷺ کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں صحابہ کے اندر منتشر طور پر موجود تھیں۔ کسی صحابی کی معلومات زیادہ تھیں کسی کی کم۔ بعض کو ایک یا چند باتیں معلوم تھیں تو بعض کو دوسری۔ کسی بھی ایک صحابی کے پاس آپ ﷺ سے متعلق ہر طرح کی جامع معلومات نہیں تھیں اور نہ ایسا ممکن تھا۔ اس لیے کوئی ایک آدمی ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ جو پورے تیئس سال ہر روز کے پورے چوبیس گھنٹے آپ ﷺ کے ساتھ رہا ہو۔ کسی کو یہ موقع کم ملا کسی کو زیادہ۔ آپ ﷺ کے گھر کے اندر پیش آنے والے واقعات کے متعلق آپ ﷺ کی ازواج مطہرات ہی بہتر معلومات رکھتی تھیں کسی خاص جنگ کے واقعات کو اس جنگ میں شامل ہونے والے ہی زیادہ بہتر جانتے تھے۔

اس علم کو یکجا کرنے کی ایک ہی صورت تھی کہ تمام صحابہ سے حاصل ہونے والی جملہ معلومات ایک

جگہ جمع کر دی جائیں۔

رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ابتدائے نبوت سے صحابہ کرام کی غیر معمولی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ خود صحابہ کرام بھی باہم ایک دوسرے کے ذریعے سے آنحضرت ﷺ کے بارے میں اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ آپ ﷺ کی زندگی میں ہی یہ دستور اور رواج پڑ گیا تھا کہ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے ملتا تو آپ ﷺ کی کسی حدیث یا سنت کو دریافت کر کے اپنی زندگی میں شامل کرنے کی کوشش کرتا۔ یہ سلسلہ آپ ﷺ کی زندگی تک برقرار رہا۔ پھر آپ ﷺ کی وفات کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا رہا آپ کے پیروؤں میں آپ ﷺ کے اخلاق و عادات اور آپ ﷺ کی زندگی سے متعلق باتیں دریافت کرنے کا شوق بڑھتا چلا گیا۔ اس شوق سے رفتہ رفتہ روایات کا ایک وسیع سلسلہ جمع ہونا شروع ہو گیا۔ صحابہ کرام کے بعد آگے والی نسل (تابعین) کے دور میں صحابہ کے ذریعے حاصل ہونے والی معلومات اکٹھی کرنے کا کام شروع ہوا ہی تھا۔ اب اس کے ساتھ علوم میں مہارت کی تقسیم (Specialization) کا کام بھی شروع ہو گیا۔ مثلاً ایک تابعی مختلف صحابہ سے حضور اکرم ﷺ کی صرف عام حدیث (وعظ، تقریر، نصائح) سن کر لکھ لیتا یا یاد کر لیتا۔ دوسرا تابعی مختلف صحابہ سے آپ ﷺ کی جنگوں کے حالات اور دیگر واقعات دریافت کر کے لکھ لیتا۔ اسی طرح ایک ایک تابعی کے پاس دس بیس پچاس صحابہ کے ذریعے سے حاصل ہونے والی معلومات جمع ہوتی گئیں۔ فتوحات کے باعث صحابہ کرام ایران، عراق، شام اور مصر وغیرہ میں پھیل گئے تھے چنانچہ صحابہ سے معلومات جمع کرنے کا کام ان تمام علاقوں اور ان کے اہم مقامات پر بھی شروع ہو گیا۔

تابعین کے بعد اگلی آنے والی نسل (تبع تابعین) کو اب موقع ملا کہ وہ متعدد تابعین سے ان کے پاس جمع شدہ متعدد صحابہ سے حاصل کردہ معلومات یکجا کر سکتے تھے۔ مثلاً ایک تابعی کے پاس بیس صحابہ سے حاصل شدہ معلومات ہیں، دوسرے کے پاس تیس صحابہ سے حاصل کردہ ذخیرہ معلومات ہے اور تیسرے کے پاس پچاس صحابہ سے حاصل کردہ علم ہے۔ اگر تبع تابعی ان تینوں تابعین سے یہ علم حاصل کر لے تو گویا اس کے پاس ایک سو صحابہ سے حاصل ہونے والا علم جمع ہو گیا۔

اس طرح ہزاروں صحابہ کا علم سیکڑوں تابعین میں اور سیکڑوں تابعین کا علم بیسیوں تبع تابعین کے پاس جمع ہوگیا۔ لہٰذا تبع تابعین بلکہ ان کے بعد آنے والی نسل اس پوزیشن میں تھی کہ اب ایک موضوع پر جمع شدہ معلومات کی مناسب تقسیم اور ترتیب کے ساتھ ایک ایک جامع کتاب مرتب کرلی جائے۔ تبع تابعین کے بعد کے دور میں کسی ایک شخص سے کوئی نئی بات معلوم ہونے کا امکان ختم ہوگیا۔ اب تو درجنوں اور بیسیوں چھوٹی چھوٹی کتابوں میں جمع شدہ ذخیرہ علم سے بڑی اور جامع کتب تیار کرنے کا کام ہی رہ گیا تھا۔ یوں اس چوتھی نسل کے زمانے میں حدیث، تفسیر، سیرت وغیرہ سب کی اہم ابتدائی چھوٹی کتابیں اور پھر بعد میں بڑی اور جامع کتابیں تیار کرنے کا کام تقریباً ایک ہی زمانے میں ساتھ ساتھ جاری ہوا۔ حدیث، تاریخ اور مغازی سیرت کے چھوٹے چھوٹے مجموعے جب بڑے مجموعوں میں شامل ہوتے گئے تو آہستہ آہستہ چھوٹے مجموعے متروک ہوتے گئے۔ البتہ بڑے مجموعوں اور جامع کتابوں میں ان چھوٹے مجموعوں کے حوالے بکثرت ملتے ہیں۔ جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس بڑی کتاب کی تدوین کے زمانے تک یہ چھوٹے مختصر مگر اصل ماخذ پڑھے پڑھائے جاتے تھے۔ اب اسی انداز پر تدوین حدیث و سیرت کا کام بھی کچھ یوں شروع ہوا کہ بعض بزرگوں نے صرف واقعات سیرت سے مواد جمع کرنے کو بھی اپنا دینی اور علمی مشغلہ اور میدان اختصاص بنالیا اور اس فن میں خاصی شہرت پائی اور یوں حفاظت اور جمع و تدوین حدیث کا بیشتر کام تیسری صدی کے آخر تک مکمل ہوا۔ (۳۵)

حفاظت حدیث کے ضمن میں تین اہم سوال

حفاظت حدیث کے ضمن میں بالعموم تین قسم کے سوالات اٹھائے جاتے ہیں اور ان کا اظہار بار بار کیا جاتا ہے۔

۱۔ احادیث کی جمع و ترتیب کا کام عہد رسالت کے دو تین سو سال بعد شروع ہوا۔ اور محدثین نے لوگوں سے سنی سنائی باتیں بلا تحقیق اپنی کتابوں میں جمع کر کے انہیں دین بنا دیا۔ اس سے پہلے صحابہ اور تابعین کے زمانے میں احادیث کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس

عرصہ میں لوگوں نے بے شمار جھوٹی حدیثیں اپنی طرف سے حضور ﷺ کی طرف منسوب کر دیں جو چیز اتنی مدت کے بعد مدوّن کی گئی ہو اس پر کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں۔

۲۔ اگر نبی ﷺ کا مقصد یہ ہوتا کہ احادیث پر بھی قیامت تک عمل کیا جائے تو احادیث کی حفاظت کے لیے بھی وہی انتظامات کیے جاتے جو قرآن کو محفوظ رکھنے کے لیے کیے گئے تا کہ احادیث بھی تغیر و تبدل سے محفوظ رہیں۔ حضور ﷺ کا احادیث کی طرف التفات نہ فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ خیال نہیں تھا کہ احادیث پر بھی قیامت تک عمل کیا جائے۔

۳۔ حضور اکرم ﷺ نے کتابت حدیث سے منع فرما دیا تھا۔

مندرجہ بالا تینوں سوالات کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام نے حفاظت کا اہتمام نہیں کیا یہ خیال بعد کے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوا اور انہوں نے یکا یک احادیث کو مدوّن کرنا شروع کر دیا۔ (۳۶)

عہد رسالت میں حدیث کی تحریری حفاظت

جہاں تک عہد رسالت میں حدیث کی تحریری حفاظت کا تعلق ہے یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے عہد میں حدیث کے لکھنے کا اتنا اہتمام نہیں کیا گیا جتنا قرآن مجید کے لکھنے کا کیا گیا۔ بلکہ بعض احادیث سے یہاں تک بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے کتابت حدیث کی ممانعت کر دی۔ حضرت ابو سعید الخدری ؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

لا تکتبوا عنی و من کتب عنی غیر القرآن فلیمحه و حدثوا عنی فلا حرج و من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعده من النار۔ (۳۷)

تم میری حدیث نہ لکھو اور جو شخص قرآن کے علاوہ میری حدیثیں لکھتا ہو اس کو چاہیے کہ انہیں مٹا دے۔ ہاں میری حدیث بیان کرو اس میں کچھ حرج نہیں ہے اور جو شخص قصداً مجھ

پر جھوٹ باندھے اسے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالینا چاہیے۔

لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ عہد نبوی میں حدیث کی تحریری حفاظت کا کام ہی نہیں ہوا۔ کیوں کہ ہمیں کچھ روایات ایسی بھی ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض خاص خاص ارشادات نبوی ہوتے تھے جنہیں آپ ﷺ خود قلمبند کراتے تھے یا کسی نے انہیں خود قلمبند کرنا چاہا تو آپ ﷺ نے اس کی ممانعت نہیں فرمائی۔ سنت کی اہمیت کے پیش نظر حفاظت حدیث کا اہتمام عہد نبوی میں ہی شروع ہو گیا تھا اور اس ضمن میں دور نبوی میں حفاظت حدیث کے لیے دو اہم طریقے اختیار کیے گئے تھے۔

ا۔ حفظ

قدرت نے انسان کو جن بے شمار صلاحیتوں سے نوازا ہے ان میں اہم ترین قوت حافظہ ہے۔ اللہ کی دی ہوئی اس خاص نعمت سے انسان حالات وواقعات اور مشاہدات وتجربات کو ذہن میں محفوظ رکھتا ہے اور حسب ضرورت انہیں کام میں لاتا ہے۔ کسی متن کو محفوظ کرنے کے لیے انسان کا ابتدائی طریق حفظ ہی تھا۔ آہستہ آہستہ وہ کتابت سے آشنا ہوتا گیا۔ دنیا کے مختلف گوشوں میں تہذیبوں کے اجاگر ہونے اور تمدنوں کے پروان چڑھنے سے کتابت کو فروغ حاصل ہوا لیکن حافظہ ہر دور میں حفاظت کا ایک اہم ذریعہ رہا ہے۔ مختلف اقوام میں ایسے بے شمار افراد پائے جاتے رہے ہیں جن کے حافظوں کو بطور نظیر پیش کیا جاتا رہا ہے خود مسلمان علما میں یہ جملہ مشہور رہا ہے کہ ”العلم فی الصدور لا فی الکتب“ فی الحقیقت علم وہی ہے جو انسان کے سینے میں ہو۔ اس استحضار کے لیے حافظے کے سوا کوئی اور شے نہیں۔ خود ہندوستان میں سید انور شاہ کاشمیری بے نظیر حافظے کے مالک تھے۔ عرب بھی بے پناہ قوت و حافظہ کے مالک تھے۔ ان کے شعرا، خطبا، اور رواۃ ہزاروں اشعار، ضرب الامثال اور واقعات کے حافظ ہوتے تھے۔ شجرہ ہائے نسب کو محفوظ رکھنا ان کا معمول تھا بلکہ وہ تو اپنے گھوڑوں کے نسب نامے بھی یاد رکھتے تھے۔ ان صلاحیتوں کی موجودگی میں جب ان عربوں کو قرآن پاک اور رسول اکرم ﷺ سے بے حد محبت وعقیدت ہوئی تو انہوں نے

قرآن وحدیث کو حفظ کرنا شروع کر دیا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں۔

”ہم لوگ نبی ﷺ کے پاس ہوتے اور حدیث سنتے جب ہم اٹھتے تو ایک دوسرے سے دہراتے حتیٰ کہ ہم اسے یاد کر لیتے“ (۳۸)

حضرت انسؓ کا ہی ایک دوسرا قول ہے۔

”ہم لوگ رسول اللہ ﷺ سے حدیثیں سنتے اور جب آپ مجلس سے تشریف لے جاتے تو ہم آپس میں حدیثوں کا دور کرتے۔ یکے بعد دیگرے ہم میں سے ہر شخص ساری حدیثیں بیان کرتا۔ اکثر مجلس میں بیٹھنے والوں کی تعداد ساٹھ تک ہوتی اور وہ سب باری باری بیان کرتے۔ پھر جب ہم اٹھتے تو حدیثیں یوں یاد ہوتیں جیسے وہ ہمارے دلوں پر نقش ہو گئی ہیں۔ (۳۹)

آنحضرت ﷺ نے جب دعوت کا آغاز کیا اس وقت عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج کم تھا اور ایسے لوگوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مثلاً ابن سعد نے طبقات میں نو آدمیوں کا ذکر کیا ہے۔ مکہ میں بعثت نبوی کے وقت سولہ سترہ سے زیادہ آدمی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب لکھنے پڑھنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ صحرائی قبائل لکھنے پڑھنے کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور لکھنے پڑھنے کے خلاف حقارت کا یہ جذبہ آج تک صحرائی قبائل میں بدستور باقی ہے۔

یہ حافظہ پر اعتماد ہی کا نتیجہ تھا کہ بڑی مدت تک محدثین حدیثیں حفظ ہی کرتے رہے۔ انہوں نے لکھنے کو پسند نہیں کیا۔ امام اوزاعی کا قول ہے۔

”حدیث کا علم قیمتی اس وقت تھا جب لوگوں کے منہ سے حاصل کیا جاتا تھا۔ لوگ باہم ملتے جلتے رہتے تھے اور آپس میں اس کا ذکر کرتے رہتے تھے لیکن جب سے حدیثیں کتابوں میں آئیں ان کا نور اور ان کی رونق جاتی رہی اور یہ علم ایسے لوگوں میں پہنچ گیا جو اس کے اہل نہیں“۔ (۴۰)

صحابہ اکرام میں ایسے لوگوں کی وافر تعداد موجود تھی جو حدیثیں یاد کرتے تھے اور نبی کریم

ﷺ کو اس بات کا علم تھا۔ لوگ حضور اکرم ﷺ سے سن کر یاد کرتے اور دوبارہ پوچھتے۔ بقول سید منت اللہ رحمانی ''کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام میں احادیث کے یاد کرنے کا رواج عام تھا اور جنہیں کوشش کے باوجود حدیثیں یاد نہ رہتیں وہ رسول اللہ ﷺ سے آ کر شکایت کرتے۔ ایسے لوگوں کے لیے بعض دفعہ آپ ﷺ دعا فرماتے اور بعض دفعہ لکھنے کا حکم دیتے اور بعض دفعہ ایسے صحابہ کا آپ ﷺ معجزانہ علاج فرماتے۔ اس سلسلہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کا واقعہ مشہور ہے۔ ان کی زندگی طالب علمانہ تھی۔ اکثر دربار رسالت میں حاضر رہتے تھے۔ اس لیے انہیں احادیث کے سننے کا موقع سب سے زیادہ ملتا تھا۔ چنانچہ بعد میں جب لوگ ان سے ان کی کثرت روایت کے متعلق پوچھتے تو اس کی وجہ یہی بیان کرتے کہ میں غریب شخص تھا۔ کسی کاروبار یا روزگار سے مجھے سروکار نہ تھا۔ رات دن آستانۂ نبوت میں پڑا رہتا تھا۔ دوسرے صحابہ کرام اپنے اپنے کاموں اور روزگار میں مصروف رہتے۔ فرصت نکال کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اس لیے مجھے دوسرے صحابہ کے مقابلہ میں احادیث سننے کا زیادہ موقع ملا۔ لیکن لگاتار حاضری دینے اور احادیث کو یاد کرنے کی کوشش کے باوجود آپ کو حدیثیں یاد نہ رہتیں۔ ایک دفعہ آپؓ نے حضور ﷺ کے پاس بڑی حسرت سے اپنی داستان کہی اور یاد نہ رہنے کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے معجزانہ طریقے سے اس کا علاج فرمایا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے فرمایا اپنی چادر پھیلاؤ۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے دونوں خالی ہاتھوں کا لپ ان کی چادر میں ڈال کر فرمایا کہ چادر سمیٹ لو۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ اس واقعہ کے بعد میرا حافظہ اس قدر قوی ہو گیا کہ کسی بات کو ایک مرتبہ سن لینے کے بعد کبھی نہ بھولا۔ (۴۱)

اس ایک واقعہ سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت حافظہ کو کس قدر اہمیت حاصل تھی اور اس دور کے لوگ اس سے کام لینے کا کتنا اہتمام کرتے تھے۔

ذخیرہ حدیث پر جو اعتراض کیے جاتے ہیں ان میں ایک بہت نمایاں اعتراض یہ ہے کہ حدیث کا سارا سلسلہ زبانی تھا اس لیے قابل اعتماد نہیں اس پر مولانا مودودی لکھتے ہیں۔

''پہلی بات تو یہ سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن حکیم کو جس وجہ سے لکھوایا گیا وہ یہ

تھی کہ اس کے الفاظ و معانی دونوں منجانب اللہ تھے۔ اس کے الفا
ترتیب ہی نہیں اس کی آیتوں کی ترتیب اور سورتوں کی ترتیب بھی خدا کی طرف سے تھی۔ اس کے الفاظ کو دوسرے الفاظ کے ساتھ بدلنا بھی جائز نہیں تھا اور وہ اس لیے نازل ہوا تھا کہ لوگ انہی الفاظ میں اسی ترتیب کے ساتھ اس کی تلاوت کریں۔ اس کے مقابلے میں سنت کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ وہ محض لفظی نہ تھی بلکہ عملی بھی تھی اور جو لفظی تھی اس کے الفاظ قرآن کے الفاظ کی طرح بذریعہ وحی نازل نہیں ہوتے تھے بلکہ حضور ﷺ نے اس کو اپنی زبان میں ادا کیا تھا۔ پھر اس کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا تھا کہ جسے حضور ﷺ کے ہم عصروں نے اپنے الفاظ میں بیان کیا تھا۔ مثلاً یہ کہ حضور ﷺ کے اخلاق ایسے تھے۔ آپ ﷺ کی زندگی ایسی تھی اور فلاں موقع پر حضور ﷺ نے ایسے عمل کیا۔ آنحضرت ﷺ کے اقوال اور تقریریں نقل کرنے کے بارے میں بھی یہ پابندی نہ تھی کہ سننے والے انہیں لفظ بلفظ نقل کریں بلکہ اہلِ زبان سامعین کے لیے جائز تھا اور وہ اس پر قادر بھی تھے کہ آپ ﷺ سے ایک بات سن کر معنی و مفہوم بدلے بغیر اسے اپنے الفاظ میں بیان کر دیں حضور ﷺ کے الفاظ کی تلاوت مقصود نہ تھی بلکہ اس تعلیم کی پیروی مقصود تھی جو آپ ﷺ نے دی ہو
احادیث میں قرآن کی آیتوں اور سورتوں کی طرح یہ ترتیب محفوظ کرنا بھی ضروری نہ تھا کہ فلاں حدیث پہلے ہو اور فلاں اس کے بعد۔ اس بنا پر احادیث کے معاملے میں یہ بالکل کافی تھا کہ لوگ انہیں یاد رکھیں اور دیانت کے ساتھ انہیں لوگوں تک پہنچائیں۔ ان کے معاملے میں کتابت کی وہ اہمیت نہ تھی جو قرآن کے معاملے میں تھی۔"

سری بات جسے خوب سمجھ لینا چاہیے وہ یہ ہے کہ کسی چیز کی سند و حجت ہونے کے لیے اس

کا لکھا ہوا ہونا قطعاً ضروری نہیں۔ اعتقاد کی اصل بنیاد اس شخص یا ان اشخاص کا بھروسے کے قابل ہونا ہے۔ جس کے یا جن کے ذریعے سے کوئی بات دوسروں تک پہنچے خواہ وہ مکتوب ہو یا غیر مکتوب۔ خود قرآن کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے لکھوا کر نہیں بھیجا بلکہ نبی کی زبان سے اس کو بندوں تک پہنچایا۔ اللہ نے پورا انحصار اس بات پر رکھا کہ جو لوگ نبی کریم ﷺ کو سچا مانیں گے وہ نبی کے اعتماد پر قرآن کو بھی ہمارا کلام مانیں گے۔ نبی نے بھی قرآن کی جتنی تبلیغ و اشاعت کی زبانی ہی کی۔ آپ ﷺ کو جو صحابہ مختلف علاقوں میں جا کر تبلیغ کرتے تھے وہ بھی قرآن کی سورتیں لکھی ہوئی نہیں لے جاتے تھے۔ لکھی ہوئی آیات اور سورتیں تو اس تھیلے میں پڑی رہتی تھیں جس کے اندر آپ ان کو کاتبان وحی سے لکھوا کر ڈال دیا کرتے تھے۔ باقی ساری تبلیغ و اشاعت زبانی ہوا کرتی تھی اور ایمان لانے والے اس ایک صحابی کے اعتماد پر یہ بات تسلیم کرتے تھے کہ جو کچھ وہ سنا رہا ہے وہ خدا کا کلام ہے یا رسول اللہ کا، جو حکم وہ پہنچا رہا ہے وہ حضور ﷺ ہی کا حکم ہے۔

تیسرا اہم نکتہ اسی سلسلے میں یہ ہے کہ لکھی ہوئی چیز بجائے خود کبھی قابل اعتماد نہیں ہوتی جب تک کہ زندہ اور قابل اعتماد انسانوں کی شہادت اس کی توثیق نہ کرے۔ محض لکھی ہوئی کوئی چیز اگر ہمیں ملے اور ہم اصل لکھنے والے کو نہ جانتے ہوں یا لکھنے والا خود نہ بتائے کہ یہ اس کی تحریر ہے یا ایسے شاہد موجود نہ ہوں جو اس امر کی تصدیق کر سکیں کہ یہ تحریر اس شخص کی ہے جس کی طرف منسوب کی گئی ہے تو ہمارے لیے محض وہ تحریر یقینی تو درکنار ظنی حجت بھی نہیں رکھتی۔ یہ ایک ایسی اصولی حقیقت ہے جسے موجودہ زمانے کا قانون شہادت بھی تسلیم کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن حکیم کے محفوظ ہونے پر جو یقین ہم رکھتے ہیں کیا اس کی بنیاد یہی ہے کہ وہ لکھا گیا تھا؟ کاتبین وحی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے صحیفے جو حضور ﷺ نے املا کرائے تھے آج اس دنیا میں کہیں موجود نہیں ہیں۔ اگر موجود ہوتے بھی تو آج یہ کون تصدیق کرتا کہ یہ وہی صحیفے ہیں جو حضور ﷺ نے لکھوائے تھے۔ خود یہ بات بھی کہ حضور اکرم ﷺ قرآن کو نزول وحی کے ساتھ ہی لکھوا لیا کرتے تھے زبانی روایات ہی سے معلوم ہوئی ہے ورنہ اس کے جاننے کا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ پس قرآن کے محفوظ ہونے پر ہمارے یقین کی اصل وجہ اس کا لکھا ہوا ہونا نہیں ہے بلکہ یہ

ہے کہ زندہ انسان زندہ انسانوں سے مسلسل اس کو سنتے اور آگے زندہ انسانوں تک اسے پہنچاتے چلے آرہے ہیں۔ لہٰذا یہ خیال دل سے نکال دینا چاہیے کہ کسی چیز کے محفوظ ہونے کی واحد سبیل بس اس کا لکھا ہوا ہونا ہے۔ (۴۲)

اس بحث سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوتی ہے کہ حافظہ بالذات علوم کو محفوظ کرنے کا زبردست ذریعہ ہے اور مسلمانوں نے اس سے خوب کام لیا ہے۔

۲۔ کتابت

باوجود یہ کہ حافظہ اک زبردست ذریعۂ تحفظ ہے اور بالخصوص عرب اس میدان میں بہت آگے تھے، یہ کہنا صریح زیادتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے عہد میں کتابت حدیث کا انتظام نہیں ہوا۔ حالانکہ عہدِ رسالت میں کتابت حدیث کا بھی اہتمام ہوا ہے۔

آپ ﷺ نے جس زمانہ میں کتابت حدیث کی ممانعت فرمائی تھی وہ نزول وحی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اگر اس دور میں قرآن مجید کی طرح حدیث کی کتابت کا بھی اہتمام کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ دونوں میں التباس واقع نہ ہو جائے پھر جب التباس کا اندیشہ جاتا رہا تو آپ ﷺ نے لکھنے کی اجازت دے دی۔

تاریخ وسیرت کی کتابوں سے خوب پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ نے مسلمانوں میں فن کتابت کو عام کرنے کے لیے خاص اہتمام فرمایا تھا۔ اس ضمن میں چند مثالیں خوب وکالت کرتی ہیں۔

۱۔ عبداللہ بن سعید بن العاص کو حضور ﷺ نے حکم دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو لکھنا سکھائیں۔ وہ بڑے خوش نویس تھے اور زمانۂ جاہلیت میں بھی کاتب کی حیثیت سے مشہور تھے۔ (۴۳)

۲۔ عبادہ بن الصامت سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں صفہ میں لوگوں کو لکھنا سکھانے اور قرآن پڑھانے پر مامور فرمایا تھا۔ (۴۴)

۳۔ مدینہ منورہ آنے کے بعد نبی کریم ﷺ نے پہلا کام جو کیا وہ مسجد نبوی کی تعمیر تھی۔ اس عمارت کے ایک حصے میں سائبان اور چبوترہ بنایا گیا۔ یہ سب سے پہلی درسگاہ تھی۔ آپ

ﷺ نے اساتذہ مقرر کیے جو طلباء کو اس درس گاہ میں لکھنا پڑھنا سکھاتے اور مسائل دین کی تعلیم دیتے تھے۔

۴۔ جنگ بدر میں جو قیدی آئے تھے ان کے بارے میں یہ فیصلہ ہوا کہ وہ فدیہ دیں اور رہائی حاصل کریں۔ آپ ﷺ کا اعلان تھا کہ جو شخص فدیہ ادا نہیں کرسکتا اور فن کتابت سے آشنا ہے وہ دس مسلمان بچوں کو فن کتابت سکھا کر رہائی پا سکتا ہے۔ (۴۵)

نبی کریم ﷺ کی انہی ترغیبات کا نتیجہ تھا کہ صحابہ میں سے کئی لوگ کتابت سے واقف ہو گئے جن میں حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اور حضرت عبداللہ بن عباس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مردوں کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ عورتوں کو بھی لکھنے پڑھنے کی تلقین فرماتے تھے اور ان کے لیے آپ ﷺ نے ایک دن مخصوص کر رکھا تھا۔ حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ عورتوں نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ مردوں نے آپ ﷺ سے تعلیم و تعلم میں ہماری نسبت زیادہ حصہ لیا ہے۔ اس مقصد کے لیے آپ ہمارے واسطے بھی ایک دن مقرر کریں اس پر آپ ﷺ نے ایک دن کا وعدہ فرمایا۔

حضور اکرم ﷺ نے ابتدا میں جس اندیشے کے تحت حدیث لکھنے سے منع کیا تھا اس سے آپ ﷺ کا یہ منشا ہرگز نہیں تھا کہ احادیث کو محفوظ نہ کیا جائے یا انہیں قابلِ استناد ہی نہ سمجھا جائے۔ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ اس امر میں کس قدر محتاط تھے کہ کہیں کلام الٰہی اور کلام رسول کو اس طرح یکجا نہ کر دیا جائے کہ آئندہ نسلیں ان دونوں میں تمیز ہی نہ کر سکیں اور غلو کر کے دونوں کو ہم مرتبہ سمجھنے لگیں۔ آپ ﷺ کلام الٰہی اور کلام رسول میں الفاظ کے لحاظ سے بھی اور مرتبہ کے اعتبار سے بھی ایک فرق قائم رکھنا ضروری خیال فرماتے تھے۔ چنانچہ یہ فرق آج بھی قرآن کے اول اور حدیث کے دوسرے ماخذ قانون ہونے کی حیثیت سے واضح ہے۔ جو لوگ عدم کتابت کی روایت کو حدیث کی عدم صحت و حجیت پر دلیل بناتے ہیں وہ عقل و منطق اور آثار صحابہ کی رو سے ناقابل اعتبار ہے۔ پھر استدلال کا یہ طریقہ کہ حضور ﷺ نے چونکہ کتابت سے منع فرمایا تھا اس لیے حفاظت حدیث کا کوئی انتظام نہ ہو سکا اور بعد کے لوگوں نے اپنے اندازے سے سلسلہ ہائے سند

مرتب کیے ہیں بڑا سطحی اور نہایت بے وزن موقف معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ حفاظت کا ذریعہ صرف تحریر ہی نہیں بلکہ حافظہ بھی تھا۔ پھر ہم حضور اکرم ﷺ کے ان ارشادات و مساعی کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو فن کتابت حدیث کے سلسلے میں آپ نے انجام دیے۔ مثلاً کتابت کی اجازت میں مندرجہ ذیل احادیث قابلِ غور ہیں۔

۱۔ رافع بن خدیج سے روایت ہے انہوں نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ ہم آپ سے بعض چیزیں سنتے ہیں کیا ہم ان کو لکھ لیا کریں آپ ﷺ نے فرمایا لکھ لیا کرو کوئی حرج نہیں۔ (۴۶)

۲۔ عمر بن سفیان بیان فرماتے ہیں کہ انہوں نے عمر بن خطابؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ علم کو لکھ کر محفوظ کر لیا کرو۔ (۴۷)

ان روایات سے یہی ثبوت ملتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی حدیث کو لکھنے کی اجازت بھی دی تھی۔

اس کے بعد دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ حضور ﷺ کے اپنے عہد میں کتابت حدیث کا کیا نظام تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ آنحضرت ﷺ کے اپنے زمانہ میں کچھ بھی نہ لکھا گیا ہو اور جو کچھ موجود ہے وہ بعد کے لوگوں کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہو۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں کہ حضور ﷺ کے عہد مبارک میں کتابت حدیث کا کام ہوا ہے اور کافی کچھ ہوا ہے۔ اس کے لیے شواہد موجود ہیں کہ جن سے انکار ممکن نہیں ہے۔

بقول سید منت اللہ رحمانی عہد نبوی میں کتابت حدیث تین طریقوں پر ہوئی۔

۱۔ احادیث کا وہ ذخیرہ جو خود حضرت رسالت مآب ﷺ کے حکم سے قلم بند کیا گیا۔

۲۔ وہ ذخیرہ جو صحابہ کرام نے قلم بند کیا اور پھر دربار رسالت میں بغرض تصحیح پیش کیا اور آپ ﷺ نے سننے کے بعد اس کی تصدیق اور توثیق فرمائی۔

۲۔ وہ ذخیرہ جو صحابہ کرام نے خود زبان مبارک سے سن کر یا صحابہ سے پوچھ کر رسول اللہ ﷺ کی حیات میں یا آپ ﷺ کے بعد قلم بند کیا۔

اسی بات کو سید ابوبکر غزنوی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

۱۔ وہ احادیث جو خود رسول اللہ ﷺ کے حکم سے لکھی گئیں۔

۲۔ وہ احادیث جن کو صحابہ نے حضور ﷺ کی اجازت سے آپ ﷺ کی مجلس میں بیٹھ کر لکھا۔

۳۔ وہ احادیث جنہیں صحابہ کرام نے مجلس نبوی میں سنا اور مجلس برخاست ہونے کے بعد قلم بند کیا۔

کتابت حدیث کے ضمن میں نبی ﷺ کے ذاتی اقدامات

۱۔ نبی کریم ﷺ نے زکوٰۃ، صدقات اور خون بہانے کے احکام پوری وضاحت کے ساتھ عمرو بن حزمؓ کو لکھوا دیے تھے۔ (۴۸) یہ تحریر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمرو بن حزمؓ کے خاندان میں موجود تھی اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور میں عمرو بن حزم کے خاندان کا وہ مجموعۂ احکام مل گیا تھا۔ حافظ ابن قیم نے اپنی کتاب زادالمعاد میں لکھا ہے۔

> ''ان گرامی ناموں میں سے ایک گرامی نامہ جو زکوٰۃ کے متعلق تھا حضرت ابوبکرؓ نے حضرت انس بن مالک کے لیے اس وقت لکھا تھا کہ جب انہیں بحرین روانہ کیا گیا تھا۔ آج جمہور علما کا عمل اس خط کے مطابق ہے۔ اور ایک گرامی نامہ اہل یمن کی طرف ارسال کیا۔ یہ وہ خط ہے جسے تابعی ابوبکر نے اپنے والد عمر سے انہوں نے اپنے والد حزم سے روایت کیا ہے اور یہ بہت ہی عظیم الشان خط ہے۔ اس میں فقہ کے کثیر التعداد مسائل ہیں۔ زکوٰۃ، دیت اور احکام کے علاوہ کبیرہ گناہوں، طلاق، غلاموں کی آزادی، ایک کپڑے میں نماز پڑھنے، ایک ہی کپڑا اوڑھنے اور مصحف کو چھونے وغیرہ کے مسائل مذکور ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ یہ حضور ﷺ نے لکھوایا ہے۔ تمام فقہاء اس خط میں درج شدہ دیتوں کی مقدار پر عمل پیرا ہیں۔ ایک وہ خط ہے جو بنی زبیر کو بھیجا گیا

اور ایک وہ خط ہے جو خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق ؓ کے پاس تھا۔ اس میں زکوٰۃ کے نصاب اور دوسرے امور کے متعلق احکام تھے۔ (۴۹)

عہدِ رسالت میں تحریر شدہ نسخے

ا۔ صحف نبوی:

نبی کریم ﷺ نے بعض لوگوں کو بعض مخصوص حالات میں جو چیزیں لکھوائی تھیں وہ سب کی سب ان حضرات کے پاس محفوظ تھیں مثلاً عبداللہ بن حکیم کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک تحریر ہمارے قبیلہ جہینہ کو پہنچی جس میں مختلف احادیث تھیں۔ (۵۰)

اسی طرح حضرت وائل بن حجر کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں نماز، روزہ، شراب اور سود وغیرہ کے احکام تھے۔ یہ صحیفہ انہیں رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی حاضری کے وقت دیا تھا۔ (۵۱)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں عاملوں کو بھیجنے کے لیے کتاب الصدقہ لکھوائی لیکن اسے بھیجنے سے پہلے رحلت فرما گئے پھر آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے وہ کتاب عاملوں کے پاس بھیجی۔ اس کتاب میں جانوروں کی زکوٰۃ کے متعلق مسائل تھے۔ (۵۲)

اسی طرح حضرت علیؓ کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا جسے رسول اللہ ﷺ نے لکھوایا تھا۔ حضرت جحیفہؓ کہتے ہیں میں نے حضرت علیؓ سے پوچھا اس صحیفے میں کیا ہے۔ آپؓ نے بتایا اس میں قیدیوں کے آزاد کرنے کے احکام اور یہ کہ مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے۔ (۵۳) ابراہیم تیمی نے اپنے والد سے روایت کیا کہ حضرت علیؓ نے اک دن ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا۔ اس صحیفے میں جراحات اور دیت کے احکام کے علاوہ اونٹوں کی زکوٰۃ کا بیان ہے اور یہ کہ مدینہ عائر سے ثور تک حرم ہے جس نے اس میں کوئی بدعت پیدا کی یا کسی بدعتی کو پناہ دی تو اس پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے اور ایسے شخص کے فرائض و نوافل قبول نہیں کیے جائیں گے اور اس صحیفہ میں یہ بھی تھا کہ جو شخص اپنے موالی کے سوا اپنے کو کسی اور کی طرف منسوب کرے گا تو اس پر اسی

طرح لعنت ہے اور یہ کہ جو کسی مسلمان کا عہد توڑے گا اس پر اسی طرح لعنت ہے۔ (۵۴) ابوطفیل کہتے ہیں کہ جب حضرت علیؓ سے یہ دریافت کیا گیا کہ آپ کو رسول اللہ ﷺ نے خاص طور پر کیا عطا کیا تو آپؓ نے اس صحیفہ کا خاص ذکر کیا۔ جس میں لکھا تھا۔ " اللہ نے اس پر لعنت کی جس نے غیر اللہ کے لیے ذبح کیا، جس نے اپنے والد پر لعنت کی اور جس نے کسی بدعتی کو پناہ دی۔ (۵۵)

یہ صحیفہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو از خود عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ ابن شہابؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا تھا۔ واللہ ہمارے پاس پڑھنے کی کوئی کتاب نہیں ہے سوائے اللہ کی کتاب اور اس صحیفہ کے۔ یہ صحیفہ مجھے حضور ﷺ نے عطا کیا تھا اور اس میں احکام زکوۃ ہیں۔ (۵۶)

ان صحیفوں کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے وہ خطوط و وثائق ہیں جو آپ ﷺ نے مختلف اوقات میں بادشاہوں، قبیلوں کے سرداروں اور دوسرے لوگوں کے نام لکھوائے اور خود ان پر مہر تصدیق ثبت کی۔ ان خطوط میں مقوقس شاہ مصر، نجاشی اور منذر بن ساوی کے نام لکھے جانے والے خطوں کی نقلیں بھی محفوظ ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود یہ چیزیں اہتمام سے لکھوائی تھیں۔ اگر آپ ﷺ کتابت حدیث کے مخالف ہوتے تو کبھی ایسی چیزیں نہ لکھواتے۔ ان دستاویزات سے آنحضرت ﷺ کے رجحانات کا بین ثبوت ملتا ہے۔ اور اس سلسلے کی اہم کڑی وہ دستاویز ہے جو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ تشریف لانے کے بعد اہل مدینہ کے ساتھ معاہدہ کی صورت میں لکھوائی۔ حضور اکرم ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو وہاں سخت انتشار تھا۔ عرب اور یہود مدینے کے شہری تھے۔ لیکن عرب اوس و خزرج کے بارہ قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے جب کہ یہودی قبیلہ بنو نضیر، بنی قریظہ وغیرہ دس قبیلوں میں منقسم تھے۔ ان سب قبائل میں باہمی چپقلش نے کئی بار جنگ وجدل کی صورت اختیار کی تھی۔ ان میں کوئی متفقہ شہری اصول نہیں تھے۔ ہر قبیلہ اپنے اصول وقواعد کے مطابق امور طے کرتا تھا اور کوئی اجتماعی قاعدہ نہیں تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ میں پہلی اجتماعیت کی بنیاد رکھی۔ یثاق مدینہ کی دفعات بتاتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کتنے تدبر کے ساتھ امن کو برقرار رکھنے کا اہتمام فرمایا۔ کیا آپ ﷺ نے اس معاہدے کو محض

قلب ودماغ تک محدود رکھا۔ ہرگز نہیں، بلکہ اسے لکھوایا اور تحریر میں پانچ مرتبہ اہل ھذا الصحیفہ کے الفاظ دہرائے۔ احادیث وسیرت کی کتابوں میں اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے علاوہ ایسی احادیث بھی ملتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے لکھنے کا حکم دیا۔

بعض اوقات حضور ﷺ کچھ ارشاد فرما رہے ہوتے اور حاضرین میں سے کوئی صاحب ان ارشادات کو محفوظ کرنے کی اجازت چاہتے تو آپ ﷺ اجازت دے دیتے یا اسے لکھوا دیتے تھے۔ اس سلسلے میں نہایت عمدہ مثال ابوشاہ کی ہے۔ آنحضرت ﷺ جب خطبہ حجۃ الوداع سے فارغ ہوئے تو ابوشاہ یمنی نے لکھنے کی اجازت چاہی۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔

اکتبوا لابی شاہ۔ (۵۷)

ابوشاہ کے لیے لکھ دو۔

بقول سید ابوبکر غزنویؒ "معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کتابت حدیث کا انداز یہ ہوتا تھا کہ آپ ﷺ درمیان میں تشریف فرما ہیں صحابہ کی جماعت آپ ﷺ کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھی ہے اور جو کچھ آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں صحابہ لکھتے جاتے ہیں"۔

حضرت انسؓ بھی فرماتے ہیں "کہ رسول اللہ ﷺ ہر بات کو دو مرتبہ دھراتے تا کہ لوگوں کو سمجھنے میں سہولت ہو۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام کو صحت وتعین کے ساتھ احادیث قلم بند کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی"۔ (۵۸)

ڈاکٹر صبحی صالح لکھتے ہیں "بہر کیف یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بعض صحابہ نے آنحضرت ﷺ کی زندگی میں حدیثیں لکھیں البتہ یہ درست ہے کہ کتابت حدیث کا عہد نبوی میں زیادہ کام آنحضرت ﷺ کے آخری برسوں میں اس وقت ہوا جب آپ ﷺ نے اس کی کھلی اجازت مرحمت فرما دی۔ جو صحابہ آنحضرت ﷺ کے دور میں احادیث لکھا کرتے تھے۔ ان میں حضرت سعد بن عبادہؓ، حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ، حضرت سمرہ بن جندبؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اور حضرت انس بن مالکؓ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

امام ترمذیؒ نے سعد بن عبادہؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے ایک صحیفہ میں احادیث نبویہ جمع کی ہوئی تھیں۔ (۵۹) حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ سعد بن عبادہؓ دور جاہلیت کے کاتبوں میں سے تھے۔ (۶۰) بعد میں مسلمان ہوئے تو بہت ممکن ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے ارشادات کو بااحسن وخوبی قلم بند کیا ہو۔

حضرت سمرہ بن جندب متوفی ۶۰ ہجری نے بھی ایک صحیفہ میں حدیثیں جمع کی تھیں۔ ان کے بعد یہ صحیفہ ان کے بیٹے سلمان کو ملا اور وہ اس کی روایتیں بیان کرتے رہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ متوفی ۷۱ ہجری نے بھی ایک صحیفہ رقم کیا تھا۔ امام مسلم فرماتے ہیں کہ یہ صحیفہ مناسک حج سے متعلق تھا۔ حضرت جابر کے متعلق ابن جوزی نے لکھا ہے کہ ان کی احادیث کی تعداد ایک ہزار پانچ سو چھ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو (متوفی ۶۵ ہجری) مہاجر صحابہ میں سے تھے۔ انہیں تحصیل علم کا بڑا شوق تھا۔ یہ تورات وانجیل کے بھی عالم تھے۔ ان کا زہد وتقویٰ اور عبادت وریاضت عہد رسالت میں ہی مسلم تھی۔ تذکرہ نگاروں نے انہیں ''عالم ربانی'' کے لقب سے یاد کیا ہے۔ آپؓ خود فرماتے ہیں کہ میں ایک دن رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں آپ ﷺ کی حدیثیں روایت کروں اور ارادہ ہے کہ یاد کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ہاتھ سے لکھنے کی مدد لوں اگر آپ ﷺ پسند فرمائیں تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا اگر میری حدیث ہو تو اپنے دل کے ساتھ ہاتھ سے بھی مدد لے لو۔ (۶۱)

٭ حضور ﷺ کی اجازت کے بعد جب انہوں نے انہماک سے حدیثیں لکھنا شروع کیں تو بعض حضرات نے انہیں کتابت حدیث سے منع کیا۔ حضرت عبداللہ نے آنحضرت ﷺ سے اس کا ذکر کیا لیکن آپ ﷺ نے اپنی اجازت کو بحال رکھا۔ اس واقعہ کو حضرت عبداللہ خود اس طرح بیان کرتے ہیں:

''میں رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے جو لفظ سنتا تھا اسے اس ارادہ سے لکھ لیا کرتا تھا کہ یاد کرلوں گا لیکن قریش نے مجھے منع کیا اور کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ سے جو سنتے ہو وہ لکھ لیتے ہو

اور رسول اللہ ﷺ تو بشر ہیں۔ وہ غصہ میں بھی کچھ فرما دیتے ہیں (ان کی اس بات کا اثر لے کر میں نے لکھنا ترک کر دیا)۔ پھر میں نے اس کا ذکر بارگاہِ رسالت میں کیا تو سرور عالم ﷺ نے فرمایا جو مجھ سے سنا کرو وہ ضرور لکھا کرو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میری زبان سے حق کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا’’۔

صحیفۂ صادقہ

انہی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے حضور اکرم ﷺ کی احادیث پر مشتمل ایک صحیفہ تیار کیا جسے ‘‘صحیفہ صادقہ’’ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر صبحی صالح اگرچہ یہ صحیفہ اصلاً ہم تک نہیں پہنچا مگر مسند احمد میں یہ جوں کا توں محفوظ ہے۔ ابن الاثیر کے مطابق اس میں ایک ہزار حدیثیں تھیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ انہوں نے یہ صحیفہ خود رقم کیا ہے، فرماتے ہیں:

> ‘‘صادقہ ایک صحیفہ ہے جو میں نے نبی کریم ﷺ سے سن کر لکھا ہے’’۔ (۶۲)

ڈاکٹر صبحی صالح کہتے ہیں اس صحیفہ میں فتاویٰ ہیں جو حضرت عبداللہؓ کے سوال کے جواب میں آنحضرت ﷺ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ اس سے اس صحیفہ پر ہمارا اعتقاد مزید بڑھ جاتا ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرو کے صحیفہ صادقہ اور دیگر صحف لکھنے کی سب سے بڑی دلیل حضرت ابو ہریرہؓ جیسے جلیل القدر صحابی کا یہ قول ہے۔

> ‘‘صحابہ میں مجھ سے زیادہ کثیر الروایت کوئی نہ تھا البتہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا معاملہ مجھ سے جداگانہ نوعیت کا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا’’۔ (۶۳)

مجموعۂ حضرت انسؓ بن مالک

حضرت انسؓ بن مالک رسول اللہ ﷺ کے جاں نثار خادم تھے۔ آنحضرت ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو ان کے والدین نے آپ ﷺ کے ساتھ والہانہ عقیدت اور

محبت کی بنا پر انہیں آپ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اور کہا تھا:

یارسول اللہ! ھذا ابنی وھو غلام کاتب۔ (۶۴)

یارسول اللہ ﷺ! یہ میرا بیٹا ہے یہ ابھی بچہ ہے مگر فن کتابت جانتا ہے۔

حضرت انسؓ کا شمار بھی مکثرین صحابہ میں ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت انسؓ آپ ﷺ کے خادم خاص تھے۔ اس لیے ان سے زیادہ اور کس کو قرب نبوی حاصل ہو سکتا تھا؟ لہٰذا آپ خدمت اقدس میں حاضر رہ کر جہاں سردار کائنات کی خدمت کرتے وہاں آپ ﷺ کے ارشادات عالیہ کو بھی لکھ کر محفوظ کرتے تھے۔

روایات سے ثابت ہے کہ حضرت انسؓ نہ صرف احادیث کو لکھتے تھے۔ بلکہ آپؓ اصلاح و تصحیح کے لیے ان لکھی ہوئی احادیث کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھی پیش کرتے تھے۔ اس طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت انسؓ کی روایت کردہ احادیث کو رسول اللہ ﷺ کی تصدیق و تائید بھی حاصل ہے کیونکہ وہ زمانۂ نبوت میں قلمبند ہو کر حضور ﷺ کے سامنے پیش کی جا چکی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تختیاں

حضرت عبداللہ بن عباسؓ جلیل القدر صحابی ہیں۔ ۶۹ ہجری میں آپؓ کی وفات ہوئی۔ آپؓ کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے دعا فرمائی تھی:

"اے اللہ اسے دینی بصیرت عطا کر۔ اے اللہ اسے حکمت والہام عطا کر اور اسے تعبیر کا علم دے"۔ (۶۵)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے آنحضرت ﷺ کی حدیث و سیرت کے متعلق بہت سی تختیوں کو بڑے اہتمام کے ساتھ تحریر کر کے تیار کر رکھا تھا۔ آپ جب کسی محفل میں جاتے تو یہ تختیاں ساتھ لے جاتے۔

خلاصہ

ان تمام حالات و قرائن سے یہ حقیقت صاف ثابت ہوتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے

حفاظت حدیث کا اہتمام فرمایا تھا۔ آپ ﷺ نے اپنے دور میں حدیث یاد کرنے اور لکھنے دونوں کی اجازت بھی دی اور ترغیب بھی۔ یہ تمام قسم کی ترغیب وتدبیر یقیناً اسی لیے تھی کہ رسول اللہ ﷺ خود اپنی حدیث کو اس طرح محفوظ کرنا چاہتے تھے کہ آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کر سکیں۔

عہدِ رسالت میں حدیث کم لکھنے کی وجوہ

اگر ہم خلاصے کے طور پر اس ساری بحث کا جائزہ لیں کہ عہدِ رسالت میں حدیث کو لکھا تو گیا مگر شروع میں اس کی اجازت کیوں نہیں دی گئی، یا آخر پر کیوں دی گئی تو ہمارے سامنے یہ نکات آتے ہیں۔

۱۔ اہل عرب نے پہلے پہل اپنے قوی الحافظہ ہونے کی وجہ سے حدیث کو لکھنے کی بجائے یاد کرنے پر زیادہ توجہ دی۔

۲۔ اس وقت عرب میں علمی تحریک کی ابتدا تھی، مگر اس سے قبل وہاں لکھنے پڑھنے کا عام رواج نہیں تھا۔ اس وجہ سے صحابہ تصنیف وتالیف کے رموز سے اچھی طرح واقف نہیں تھے کیوں کہ ابھی تو نبی ﷺ کے ذریعے ان کی اپنی تعلیم وتربیت بھی شروع ہوئی تھی جب یہ تربیت ہوگئی پھر لکھنے کی اجازت مل گئی۔

۳۔ اکثر صحابہ اس وقت علم رسم الخط سے بھی پوری طرح آشنا نہیں تھے۔

۴۔ اس وقت اول قرآن حکیم کے حفظ اور اس کے لکھنے کا شوق زیادہ تھا۔

۵۔ اس وقت شروع میں حدیث کے لکھنے سے اس لیے بھی احتراز کیا گیا کہ قرآن اور حدیث کا متن خلط ملط نہ ہو جائے۔

۶۔ نیز اس سے قرآن اور حدیث کے مرتبے اور مقام میں امتیاز واضح رکھنا بھی مقصود تھا۔

۷۔ جنگ و جہاد کا بھی اس وقت بے پایاں سلسلہ قائم تھا جس کی وجہ سے کتاب حدیث کی طرف اتنی توجہ نہیں ہو سکی۔

۸۔ تبلیغ و تنظیم کے بھی ضروری انتظامات درپیش تھے جو ابتداء میں کتاب حدیث کی راہ میں

مانع ہوئے۔

تعلیم حدیث کی حوصلہ افزائی

جب مذکورہ بالا مشکلات آسان ہوگئیں تو نہ صرف حدیث کو لکھ کر محفوظ کیا جانے لگا بلکہ آگے دوسروں کو بھی حدیث پہنچانے اور روایت کرنے کی حوصلہ افزائی کی گئی اس امر کی وکالت پر حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت پیش ہے۔ آپؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> "اللہ اس بندے کو تروتازہ رکھے جس نے مجھ سے حدیث کو سنا اور جس طرح اس نے مجھ سے سنا تھا اسی طرح دوسروں کو پہنچایا"۔ (٦٦)

حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم ﷺ کو یہ کہتے سنا "اللہ اس بندے پر رحمت فرمائے جس نے میری حدیث سنی اور یاد رکھا اور اسے دوسروں تک پہنچایا"۔ (٦٧)

حضور اکرم ﷺ جب دعا فرماتے تھے تو اپنے دعائیہ ارشادات میں ان صحابہ کے لیے خاص دعا فرماتے تھے جو آپ ﷺ کی حدیث کی حفاظت کرتے، ضبط میں رکھتے اور پوری صحت کے ساتھ اس کو دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ حفاظت حدیث اور مبلغینِ حدیث کے لیے بھی حضور ﷺ کی دعا یہ ثابت کرتی ہے کہ حفظ حدیث اور اس کی روایت و تبلیغ حضور ﷺ کی منشاء قلبی تھی۔

روایت میں جھوٹی حدیث پر وعید

جہاں حضور اکرم ﷺ نے حدیث کی حفاظت اور اس کی تبلیغ کی تاکید و تلقین کی وہیں آپ ﷺ نے جھوٹی حدیث روایت کرنے والے کے لیے جہنم کی وعید بھی سنائی ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب تعلیم و تربیت سے لوگ جنت و دوزخ کو ایک حقیقت مانتے تھے اور آخرت کے عذاب سے کانپ اور لرز جاتے تھے۔ آج کا ذہن اپنی بے باکی کے باعث شائد اسے اتنی اہمیت نہ دے لیکن اس وقت کسی مسلمان کو دوزخ کی وعید سنانا ایک ہولناک بات تھی۔ اسلام پر یقین بھی رکھنا اور دوزخ میں جانے سے نہ ڈرنا دو متضاد باتیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حکمت پیغمبرانہ کے تحت حدیث کی نشر و اشاعت کی تلقین کی اور ان میں جھوٹ کی آمیزش سے احتراز کی بھی

سخت تاکید فرمائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

”جو شخص میرا نام لے کر قصداً جھوٹی بات میری طرف منسوب کرے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے“۔ (۶۸)

حضرت ابو سعید خدریؓ سے بھی ایک روایت ہے کہ آپؓ کہتے ہیں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

”میری باتیں روایت کرو، اس میں کوئی حرج نہیں مگر میری طرف جو جان بوجھ کر جھوٹی بات منسوب کرے گا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے“۔ (۶۹)

حضرت جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

میری طرف سے کوئی بات بیان نہ کرو جب تک تمہیں یہ علم نہ ہو جائے کہ میں نے وہ بات کہی ہے۔ کیوں کہ میری طرف جو کوئی جھوٹی بات منسوب کرے گا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے گا۔ (۷۰)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ”میرا نام لے کر جھوٹ نہ بولو کیونکہ جو شخص میرا نام لے کر جھوٹ بولے گا وہ آگ میں داخل ہوگا“۔ (۷۱)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں:

”حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ جو سنے اسے بلا تحقیق آگے بیان کردے“۔

الغرض زبانی روایت کی اجازت، کتابت کی اجازت اور جھوٹی روایتوں پر سخت وعید یہ تمام حفاظت حدیث ہی کے اقدامات ہیں۔

حفاظت حدیث عہد صحابہ میں

لفظ صحابہ ''صاحب'' کی جمع ہے، جس کے لغوی معنی ''رفیق، ساتھی، ایک ساتھ زندگی گزارنے والے یا صحبت میں رہنے والے'' کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں صحابہ سے مراد آنحضرت ﷺ کے رفقائے کرام ہیں یعنی وہ بزرگ ہستیاں جنہوں نے حالت ایمان میں حضرت محمد ﷺ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا اور اسلام کی حالت میں وفات پائی۔ صاحب کی جمع اور بھی کئی اوزان پر آتی ہے لیکن آپ ﷺ کے ساتھیوں کے لیے بطور جمع صحابہ کے علاوہ اصحاب اور صحب کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ اسی طرح واحد کے لیے ''صاحب'' کے علاوہ صحابی کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا تعریف کے مطابق صحابہ کے زمرے میں داخل ہونے کے لیے تین شرطیں بنیادی ہیں۔

۱۔ آپ ﷺ پر ایمان

۲۔ اسی ایمان کی حالت میں آپ ﷺ سے ملاقات

۳۔ اسلام کی حالت میں ہی وفات

ان میں سے کوئی ایک شرط بھی کم ہو تو وہ شخص اس زمرے میں نہیں آتا۔ یوں وہ سب لوگ صحابیت کے دائرے سے نکل جاتے ہیں جنہوں نے آپ ﷺ سے ملاقات تو کی مگر ایمان نہیں لائے، جیسے کفار مکہ میں سے ابوجہل، ابولہب وغیرہ۔ جب کہ جن وانس میں وہ تمام صحابیت کے دائرے میں داخل ہوئے جن کی طرف آپ مبعوث کیے گئے اور ان میں سے جو بھی حالت ایمان میں آپ ﷺ سے ملے۔

دوسری شرط یعنی ملاقات (القاء) سے ایسے افراد بھی اس زمرے میں شامل ہو گئے جو آپ ﷺ سے ملے مگر آنکھوں سے آپ ﷺ کو نہ دیکھ سکے، جیسے نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام

مکتوم۔ اس طرح اس سے وہ لوگ خارج ہو گئے جنہوں نے آپ ﷺ کو وفات کے بعد تدفین سے قبل دیکھا۔ جیسے شاعر ابو ذویب الھذلی۔

تیسری شرط یعنی موت علی الاسلام سے ایسے لوگ اس زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں جو ایمان کی حالت میں آپ ﷺ سے ملے پھر اسلام سے پھر گئے اور بعد میں پھر اسلام لا کر ایمان کی حالت میں فوت ہوئے، جیسے حضرت اشعث بن قیسؓ اور اس زمرے سے وہ شخص خارج ہو گیا جو حالت ایمان میں آپ ﷺ سے ملا مگر مرتد ہو کر مر گیا، جیسے عبداللہ بن جحش الاسدی جو ہجرت حبشہ کے بعد عیسائی ہو گیا اور اس نے حالتِ ارتداد میں ہی وفات پائی۔

علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ صحبت رسول اللہ ﷺ ایک ایسا شرف ہے جس کے برابر کوئی اور شرف و بزرگی نہیں ہے۔ شرف صحبت کے علاوہ استحکام دین، تبلیغ اسلام اور خدمت شریعت کے سلسلے میں اپنی جانفشانیوں کی بدولت مسلمانوں کی نظر میں صحابۂ کرام کو خاص تقدس اور علو مرتبت حاصل ہے۔

حافظ عبدالبر نے فضائل صحابہ کے ضمن میں بیان کیا ہے کہ صحبت نبوی اور سنت نبوی کی حفاظت و اشاعت کا اعزاز اللہ تعالیٰ نے ان ہی ہستیوں کے لیے مقرر فرمایا تھا۔ اسی لیے وہی خیر القرون اور خیر امت کے مستحق قرار پائے ہیں۔ (۷۲)

اللہ اور رسول کی طرف سے صحابہ کی مدحت سرائی

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کی مدح فرمائی ہے اور کہا ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھی ہیں وہ کفار کے لیے سخت ہیں اور آپس میں مہربانی سے پیش آنے والے ہیں، اللہ کی رضا اور اس کے فضل کی خاطر رکوع و سجود میں مشغول رہتے ہیں اور ان کی پیشانیوں پر عبادت کے اثرات ہیں۔ (سورۂ الفتح۔ ۲۹)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”میری امت میں میرے صحابہ کا مرتبہ وہی ہے جو کھانے میں نمک کا ہوتا ہے اور کوئی کھانا نمک کے بغیر اچھا نہیں لگتا“۔

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’’میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جس کی اقتدا کرو گے راہِ ہدایت پاؤ گے‘‘۔

حافظ ابن حجر نے ابو محمد ابن حزم کا قول نقل کیا ہے کہ

الصحابہ کلھم من اھل الجنة قطعاً کہ صحابہ تمام کے تمام قطعی جنتی ہیں۔ (۷۳)

درجات صحابہ

جمہور اہل اسلام کے نزدیک جس طرح رسولوں میں سے بعض رسول افضل ہیں، (سورۃ البقرہ۔ ۲۵۳) اسی طرح بعض صحابہ کو بھی بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ’’تم (اصحاب رسول اللہ ﷺ) میں سے جن لوگوں نے فتح مکہ سے قبل خرچ کیا اور جہاد کیا وہ بعد میں خرچ کرنے والوں کے مساوی نہیں ہیں‘‘۔ (سورۃ الحدید۔ ۱۰)

رسول اللہ ﷺ نے بیعتِ رضوان اور جنگ بدر میں شریک ہونے والوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ ہرگز آگ میں داخل نہیں ہوں گے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے عشرہ مبشرہ کو جنت کی قطعی بشارت دی ہے۔

اسی طرح بعض صحابہ خاص باتوں میں ایک دوسرے سے خود رسول اللہ ﷺ کی زبانی ممتاز قرار پائے۔ مثلاً رحم دلی میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، قوت دینی میں حضرت عمرؓ، حیا میں حضرت عثمانؓ، قضا میں حضرت علیؓ، علمی میراث میں حضرت زید بن ثابتؓ، قرأت میں حضرت ابی بن کعبؓ، حلال وحرام کے علم میں حضرت معاذؓ، امانت امت میں حضرت ابوعبیدہؓ اور صداقت میں حضرت ابوذر غفاریؓ۔

خود قرآن مجید نے **والسبقون الاولون من المھاجرین و الانصار۔**

(سورۃ توبہ۔ ۱۰۰)

فرما کر صحابہ کے ایک ایسے طبقے کی نشاندہی فرمائی جو ایمان واسلام لانے میں سبقت لے گئے اور اپنے کردار عمل اور ایثار وقربانی کی بدولت صحابہ میں سرفہرست شمار ہوئے۔ اس بزرگ طبقے

کے چیدہ اور نامور صحابہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت بلالؓ، حضرت زید بن حارثؓ اور حضرت خدیجہؓ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

امام حاکم نے صحابہ کے یہ طبقات بیان کیے ہیں۔

۱۔ وہ لوگ جو مکہ میں سب سے پہلے اسلام لائے۔
۲۔ مکہ کے رہنے والے وہ صحابہ جو مشاورۃ دارالندوہ سے پہلے ایمان لائے۔
۳۔ مہاجرین حبشہ۔
۴۔ اصحاب عقبہ اولیٰ۔
۵۔ اصحاب عقبۂ ثانیہ۔
۶۔ وہ مہاجرین جو مدینے میں نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے پر قبا میں ملے۔
۷۔ اہل بدر۔
۸۔ وہ جنہوں نے بدر و حدیبیہ کے درمیان ہجرت کی۔
۹۔ حدیبیہ کی بیعت رضوان کے شرکاء۔
۱۰۔ وہ جنہوں نے حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان ہجرت کی جیسے خالد بن ولیدؓ، عمرو بن العاصؓ اور ابوہریرہؓ وغیرہ۔
۱۱۔ وہ لوگ جو فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے۔
۱۲۔ وہ بچے اور لڑکے جنہوں نے فتح مکہ اور حجۃ الوداع وغیرہ کے مواقعوں پر رسول اللہ ﷺ کو دیکھا۔ (۷۴)

قرآن حکیم گواہی دیتا ہے

۱۔ مہاجرین وانصار میں سے جنہوں نے اسلام میں سبقت کی اور وہ لوگ جنہوں نے خلوصِ قلب سے ان کا اتباع کیا۔ خدا ان سے راضی ہے اور وہ لوگ خدا سے راضی ہیں اور ان کے لیے ایسے باغ تیار کرائے گئے ہیں جن کے اندر نہریں جاری ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ

رہیں گے۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔ (سورۂ توبہ۔۱۰۰)

۲۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور جان و مال سے اللہ کے راستے میں جہاد کیا یہ لوگ اللہ کے نزدیک بہت بلند مرتبے والے ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ ان کا رب ان کو اپنی خوشنودی اور رحمت اور ایسے باغوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کو دائمی آسائش ہے اور یہ لوگ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ (سورۂ توبہ۔۲۰۔۲۱)

۳۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ اور ان مہاجرین و انصار پر اپنا فضل و کرم کیا جنہوں نے عسرت کی گھڑیوں میں نبی ﷺ کا ساتھ دیا۔ (سورۂ توبہ۔۱۱۷)

۴۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور خدا کے راستے میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے ان کو جگہ دی اور ان کی مدد کی یہی لوگ پکے ایمان والے ہیں اور ان کے لیے مغفرت اور عزت کی روزی ہے۔ (سورۂ الانفال۔۷۴)

۵۔ اے پیغمبر جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا اور جو صدق و خلوص ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا تو ان پر تسلی نازل فرمائی۔

(سورۂ الفتح۔۱۸)

قرآن مجید کی ان آیات میں خاص طور پر مہاجرین و انصار اور بیعت رضوان والے صحابہ کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

مثلاً جو صحابہ دین کی خاطر اپنا گھر بار، عزیز و اقربا اور مال و دولت سب کو چھوڑ کر مدینہ منورہ آئے وہ مہاجرین صحابہ کہلائے اور جو لوگ اہل مدینہ میں سے اسلام لائے اور انہوں نے مہاجرین سے بھرپور تعاون کیا وہ انصار کہلائے۔

غزوۂ بدر میں شرکت کرنے والوں کا ایک الگ طبقہ قرار دیا گیا جو البدری یا اصحاب بدر کہلائے۔ ایک طبقہ عشرہ مبشرہ کہلایا۔ یہ طبقہ ان دس صحابہ کرام پر مشتمل ہے جن کو دنیا میں ہی جنت کی بشارت دی گئی۔ ایک طبقہ ان صحابہ کرام پر مشتمل ہے جنہوں نے حدیبیہ کے مقام پر ایک درخت کے نیچے آنحضرت ﷺ کی بیعت کی۔ انہیں اہل بیعت رضوان کہا جاتا ہے۔

اسی طرح ایک طبقہ ان صحابہ کا ہے جنہوں نے زبان مبارک نبوی ﷺ سے قرآن حکیم کو سنا، سیکھا اور پھر لکھ کر محفوظ کیا یہ صحابہ کاتبین وحی کہلائے۔

صحابہ اور حدیث

صحابہ کرام میں ایک طبقہ ان صحابہ کا ہے جنہوں نے حدیث رسول ﷺ کو سنا، سمجھا، یاد کیا، لکھا، محفوظ کیا اور آگے روایت کیا۔ آیات قرآن کا شان نزول، ان کی تفسیر، احکام القرآن کی تشریح، تعین، اجمال کی تفصیل، عموم کی تخصیص سب علم حدیث کے ذریعے اور صحابہ کے ذریعے امت تک پہنچی ہیں۔ اسی طرح حامل قرآن محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور حیات طیبہ، اخلاق و عادات مبارکہ، اقوال و افعال اور احکام و ارشادات اسی علم حدیث کے ذریعے صحابہ کرام اور تابعین کے واسطے سے ہم تک پہنچے ہیں۔ صحابہ کرام اسلام کا سرمایہ تھے ان کے صحیح اور مستند حالات بھی علم حدیث کی بدولت ہی کتب حدیث میں موجود ہیں جو روز قیامت مسلمانوں کے لیے ہدایت و روشنی کا مینار ثابت ہوں گے۔

صحابہ کرام آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال، اخلاق و عادات، رفتار و گفتار، رہن سہن اور طرز معاشرت کے عینی شاہد تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس مثالی پیکر کے قالب میں ڈھالنے کی نہ صرف کوشش کی بلکہ آپ ﷺ کے ہر قول و فعل کو آئندہ نسلوں تک پہنچایا۔ ان نفوس قدسیہ کا رہتی دنیا تک امت پر یہ احسان رہے گا کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ کا ادنیٰ سے ادنیٰ واقعہ بھی ہماری نظروں سے اوجھل نہیں رہنے دیا۔

اگرچہ صحابہ کی تعداد لاکھوں سے متجاوز تھی لیکن امام ذہبی کی رائے کے مطابق ان صحابہ کی تعداد صرف ایک سو پانچ ہے جن سے صحاح میں احادیث مروی ہیں۔ ان میں اٹھائیس صحابہ ایسے ہیں جن کے نام سے علم حدیث کے اکثر صفحات مزین ہیں۔ ان اٹھائیس میں بھی عام محدثین کی تصریح کے مطابق سات صحابہ سب سے زیادہ کثیر الروایۃ ہیں جن صحابہ کے نام یہ ہیں:

۱۔ حضرت ابو ہریرہؓ

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ

۳۔ حضرت انس بن مالکؓ

۴۔ حضرت عائشہؓ

۵۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ

۶۔ حضرت ابوسعید الخدریؓ

۷۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ

صحابہ کی فضیلت

رسول کریم ﷺ نے جس بے نظیر اور اعلیٰ معاشرے کی بنیاد رکھی تھی اس کے اولین نمونہ صحابہ کرام ہی تھے۔ یہ ایسے افراد تھے جو آنحضرت ﷺ کے فیض صحبت سے شرف انسانی کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ اس جماعت کا ہر فرد عدل، تقویٰ، دیانت، احسان اور خوف خدا کا پیکر تھا۔ اور اسے اپنی اس ذمہ داری کا احساس تھا کہ اسلام دنیا بھر میں کلمۃ اللہ کو بلند کرنے اور نسل انسانی میں مساوات اور عدل پھیلانے کے لیے آیا ہے اور اسے خلافت الٰہی کا امین بن کر خدا کا منشا پورا کرنا ہے۔

دلوں کا جو انقلاب صحابہ کرام میں سے ہر ایک صحابی میں نظر آتا ہے وہ ثابت کرتا ہے کہ وہ دیانت، بے غرضی، حق گوئی اور قربانی و ایثار کے لیے دلی طور پر آمادہ تھے اور اس کے لیے خوف خدا اور اطاعت رسول کے سوا اسے کسی تحریک کی ضرورت نہ تھی۔

اسی پاکیزگی اور طہارت نے ان میں وہ پاک دلی اور انسان دوستی پیدا کر دی تھی کہ حق و انصاف کے معاملے میں وہ اپنی ذات کو خدا کے سامنے جواب دہ سمجھتے تھے۔ ان میں سے بعض ایسے تھے جو بلند منصب پر فائز تھے اور اس کے باوجود وہ اپنے بیٹوں اور عزیزوں کو قانون شریعت کی تعزیزوں سے نہ بچا سکے اور نہ بچانے کی کوشش کی۔

غرض یہ کہ ایمان و ایقان نے ان کی جملہ صلاحیتوں کو اجاگر کر دیا تھا۔ انہوں نے نہایت ہی

لیل مدت میں دنیا کے بڑے حصے کو متاثر کیا۔ ان کی عسکری اور انتظامی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا بوت ان کی کشور کشائی ہے۔

ان میں نور ایمان نے تفقہ فی الدین پیدا کیا اور اقامت دین کو ایک عملی شکل دی۔ انہوں نے الہامی علوم کی بنیاد رکھی۔ تعلیم قرآن کے علاوہ تفسیر، حدیث، فقہ، علم اسرار دین، علم تصوف، علم ا انساب اور علم تاریخ کی عمارت کے اولین معمار یہی صحابہ تھے۔ ان میں بڑے بڑے قاضی، ے بڑے مفتی اور بڑے بڑے فقیہہ پیدا ہوئے۔ علم حدیث کی حفاظت میں ان مقدسین کی ساعی نہایت قابل قدر ہے۔ انہوں نے رسول خدا کے فرامین اپنے کانوں سے سنے اور آپ ﷺ ے اعمال و کردار کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کیا۔ انہی صحابہ کرام کی مرویات پر سنت اور اسوۂ سول ﷺ کا مدار ہے۔ سنت کی تعزیر و حدود کے اصولوں کو عملی شکل دینے کی منظم سعی بھی انہی نے ں۔ فن روایت انہی کا کارنامہ ہے۔ عمل بالقرآن و رسول کے نمونے انہوں نے ہی پیش کیے۔ وہ لیٰ اخلاق، حسن معاملت اور حسن معاشرت کے پیکر تھے۔ مشرق و مغرب کے بعض مؤرخوں ر مصنفوں نے تعجب کا اظہار کیا ہے کہ عہد جاہلیت کی سادہ معاشرت سے ابھری ہوئی جماعت س طرح اٹھی اور قیصر و کسریٰ کی ایسی حکومتوں سے کس طرح ٹکرا گئی۔ جن کی تہذیبیں قدیم اور ن کے نظامات پختہ تھے تو اس کا جواب صرف یہ ہے کہ وہ ہادیٔ برحق حضرت محمد ﷺ کے فیض بت سے علم و عمل کے روشن چراغ بن گئے تھے۔ (۷۵)

حابۂ کرام کی تحصیل حدیث کی کیفیت

صحابہ کرامؓ سفر و حضر، بازار و مسجد میں رہتے تھے اور آپ ﷺ کی حیات طیبہ کے مطابق اپنے آپ کو رنگنے میں فکر مند رہتے تھے۔ یہ تمام صحابہ آنحضرت ﷺ کی زبان اقدس سے نکلے ہوئے الفاظ اور آپ ﷺ کے ہر عمل کو امت کے دوسرے افراد تک منتقل کرنا اپنی زندگی کا مقصد و مدعا سمجھتے تھے۔ جن صحابہ نے آپ ﷺ کو دیکھا اور آپ ﷺ سے کوئی نہ کوئی روایت کی ان کی تعداد حافظ ابو زرعہ کے مطابق ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ (۷۶) ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی

تھیں۔ سب حضور اکرم ﷺ کو دیکھ کر یا سن کر روایت کرتے تھے۔ ظاہر بات ہے کہ صحابہؓ کی اتنی تعداد بیک وقت اور ہر جگہ آپ ﷺ کے ساتھ نہیں رہتی تھی۔ اگرچہ حجۃ الوداع میں ایک لاکھ سے زائد صحابہ جمع ہو گئے تھے۔ لیکن عموماً مدینہ منورہ میں صحابہ کی جو تعداد رہتی تھی وہ اتنی تعداد میں کبھی اکٹھی نہیں ہوئی تھی۔ گرد و پیش کے ہزاروں مرد اور عورتوں کے نبی ﷺ کے پاس آنے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں حضور اکرم ﷺ کے کسی نہ کسی قول و فعل کو محفوظ کرنے کا موقع مل گیا اور اس امر کی اہمیت کے پیش نظر بعض صحابہ نے خدمت اقدس میں حاضری کے لیے باری مقرر کر لی تھی۔ بخاری شریف میں حضرت عمرؓ کی یہ روایت موجود ہے:

> ”میں اور میرا پڑوسی ہم دونوں امیہ بن ترید والوں کی بستی میں رہتے تھے ہم دونوں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں باری باری حاضر ہوتے تھے۔ پس جب میں حاضر ہوتا تو آنحضرت ﷺ سے وحی وغیرہ کے بارے میں معلومات لے کر آتا اور جب وہ حاضر ہوتا تو وہ بھی ایسے ہی کرتا“۔

چونکہ حضور اکرم ﷺ کی اتباع کو صحابہ کرام تمام اوامر و نواہی میں واجب سمجھتے تھے۔ اس لیے مدینہ طیبہ سے دور کے قبائل اپنے نمائندوں کو بارگاہ رسالت میں اسلام کے احکام سیکھنے کے لیے بھیجتے تھے تاکہ وہ وفد واپس آ کر تعلیم و ارشاد کی خدمت سر انجام دے سکیں۔

ایک مرتبہ ایک صحابی کو حضور اکرم ﷺ نے کچھ فرمایا۔ لہجہ دھیمہ تھا دوسرے صحابہ اس بات کو سن نہ سکے۔ جب وہ حضور اکرم ﷺ سے جدا ہوئے تو صحابہ نے ان کو گھیر لیا تاکہ حضور ﷺ کا وہ ارشاد معلوم کر سکیں۔ (۷۷)

حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے سوالات کیا کرتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ ان کو جواب دیا کرتے تھے ایک مرتبہ فرمایا تم حدیث میں بڑے حریص ہو۔ آپؓ کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ سے میری وابستگی کا حال چونکہ لوگوں کو معلوم تھا۔ اس لیے سب لوگ آنحضرت ﷺ کی حدیثیں مجھ سے سنا کرتے تھے۔ ان سننے اور پوچھنے والوں میں عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کے علاوہ طلحہؓ و زبیرؓ بھی شامل تھے۔

علم حدیث کے شوق تحصیل میں صحابہ نے سینکڑوں میل کے سفر بھی کیے۔ امام بخاری نے

الادب المفرد میں اور امام احمد و طبرانی نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے، جو مدینہ منورہ میں مقیم تھے یہ بیان نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مجھے آنحضرت ﷺ کے صحابہ میں سے ایک کے متعلق یہ اطلاع ملی کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی ایک حدیث سنی ہے۔ میں نے اسی وقت ایک اونٹ خریدا اور اس پر اپنا کجاوہ کس کر ایک ماہ تک چلتا رہا اور ملک شام پہنچا وہاں عبداللہ بن انیس (جن سے حدیث پہنچی تھی) کے گھر پہنچا اور اندر آدمی بھیجا کہ جا کر کہو کہ دروازہ پر جابر کھڑا ہے۔ انہوں نے سننے کے ساتھ ہی پوچھا جابر بن عبداللہ؟ کہا جی ہاں! وہ فوراً باہر آئے اور گلے ملے پھر میں نے پوچھا کہ مجھے آپ کے ذریعے ایک حدیث پہنچی ہے۔ مجھے ڈر لگا ہوا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو میری موت آ جائے اور اس حدیث مبارک کے سننے سے محروم ہو جاؤں۔ یہ سن کر حضرت عبداللہ بن انیس نے وہ حدیث بیان کر دی یہ حدیث قصاص کے متعلق تھی۔

اس طرح حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے براہ راست حضور اکرم ﷺ کی زبان سے ایک حدیث سنی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سماعت میں کچھ فرق رہ گیا، اس لیے بے چینی پیدا ہو گئی۔ حدیث کے سنتے وقت حضرت عقبہ بن عامرؓ بھی دربار رسالت میں موجود تھے لیکن وہ مصر میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ اب حضرت ابو ایوب انصاریؓ معمولی تردّد مٹانے کے لیے مصر روانہ ہو جاتے ہیں اور عقبہ بن عامرؓ کے پاس حاضر ہو کر کہتے ہیں کہ مجھ سے وہ حدیث بیان کرو جو مسلمانوں کی پردہ پوشی کے بارے میں تھی اور جسے آنحضرت ﷺ کی زبان سے ہم دونوں نے سنا تھا۔ حضرت عقبہؓ بن عامر اس حدیث کو دہراتے ہیں۔

امام داری نے اپنی سنن میں عبداللہ بن ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ ایک صحابی سفر کر کے حضرت فضالہ بن عبیدؓ کے پاس مصر پہنچے۔ اس وقت وہ اپنی اونٹنی کو چارہ کھلا رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر فرمایا مرحبا۔ صحابی مذکور نے حضرت فضالہ سے کہا کہ میں آپ کی زیارت کے لیے نہیں آیا بلکہ بات یہ ہے کہ میں نے اور آپ نے حضور اکرم ﷺ کی زبانی ایک حدیث سنی تھی پس میرے سامنے اس حدیث کو دہرا دیجیے۔

نبی کریم ﷺ کے جلیل القدر صحابی ابو درداءؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے قرآن مجید کی کوئی

آیت نہ مل سکے اور مجھے پتہ چلے کہ برک الغماد نامی شہر کا کوئی شخص اسے جانتا ہے تو مجھے اس کی خدمت میں حاضر ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں ہوگی۔

قبول حدیث میں صحابہ کی احتیاط

ابتدا میں صحابہ کرامؓ جب ایک دوسرے کو نبی کریم ﷺ کی کوئی حدیث سناتے تو قطعاً اس کی تصدیق کی ضرورت محسوس نہ کرتے کہ یہ حدیث سنانے والے نے از خود زبان نبوی سے سنی ہے یا کسی دوسرے صحابی سے سن کر روایت کی ہے مگر جب وضع حدیث کی شروعات ہوئیں تو ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ اس وقت تک کوئی حدیث قبول نہ کی جائے جب تک اس کے راوی کی ثقاہت اور عدالت کا یقین نہ ہو جائے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں جب تک رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ نہیں باندھا جاتا تھا ہم حدیث کو بلا تامل قبول کر لیتے تھے لیکن جب لوگ اس طرح کی باتیں کرنے لگے تو ہم نے بغیر سند کے حدیث کو قبول کرنا اور روایت کرنا ترک کر دیا۔ بشیر العدوی کہتے ہیں کہ ”میں ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس آیا اور ان کے سامنے حدیث روایت کرنے لگا۔ لیکن میں نے دیکھا حضرت ابن عباسؓ اس پر کوئی توجہ نہیں دے رہے۔ میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ ایک زمانہ تھا، جب کوئی شخص ہمارے سامنے قال رسول اللہ ﷺ کہتا تو ہماری نگاہیں فوراً اس کی طرف اٹھ جاتیں تھیں اور ہم بڑی توجہ سے حدیث سنا کرتے تھے۔ اب جب لوگوں نے نبی کریم ﷺ کے بارے میں خود سے باتیں کرنا شروع کر دیں تو ہم صرف وہی حدیثیں اور روایتیں قبول کرتے ہیں جن کو ہم جانتے ہیں۔

اسی احتیاط کی وجہ سے اگر کوئی صحابی ان کے پاس لکھی ہوئی حدیثیں بھی لاتا تو وہ جتنے سے کو صحیح سمجھتے اسے قبول کر لیتے اور باقی کو قلم زد کر دیتے تھے۔ (۷۸)

صحابہ کے قبول حدیث میں احتیاط کی چند مثالیں

☆ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سامنے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے دادی کی میراث کے متعلق

حدیث بیان کی تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا گواہ لاؤ۔ حضرت محمد بن مسلمہؓ نے شہادت دی تو حضرت صدیق اکبرؓ نے حدیث قبول کر لی۔

- اس طرح حضرت عمرؓ کے سامنے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے دیت اسقاط حمل کی حدیث بیان کی تو حضرت عمرؓ نے شہادت مانگی۔ وہاں بھی حضرت محمد بن مسلمہؓ نے شہادت دی تو آپؓ نے قبول کر لی۔
- ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت عمرؓ سے ملنے گئے۔ تین بار اجازت طلب کی، جواب نہ ملا تو لوٹ آئے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے واپسی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے "تین بار اجازت مانگو، نہ ملے تو واپس لوٹ آؤ۔ حضرت عمرؓ نے کہا اس پر کوئی شہادت لاؤ ابوسعید خدریؓ نے شہادت دی تو حضرت عمرؓ نے یہ حدیث قبول کر لی۔
- ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے حضرت عائشہؓ سے ایک حدیث بیان کی۔ اتفاق سے ایک سال بعد حضرت عائشہؓ نے پھر انہی سے وہ حدیث دریافت کی۔ انہوں نے اسی طرح بیان کی تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا خدا کی قسم عبداللہ کو خوب بات یاد رہی۔"
- حضرت عمرو بن امیہ الضمری ایک چادر خرید رہے تھے۔ کسی نے پوچھا کیا کرو گے۔ کہا، صدقہ کروں گا۔ حضرت عمرؓ یہ سن رہے تھے۔ پوچھنے لگے بیوی کو صدقہ دینے کا کیا جواز ہے۔ کہا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بیوی کو جو کچھ دو گے وہ صدقہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ پر افترا نہ کرو اور ان کو حضرت عائشہؓ کے پاس لائے۔ حضرت عائشہؓ نے اس روایت کی تصدیق کی جس پر حضرت عمرؓ کو اطمینان ہو گیا۔ (۷۹)

بیان حدیث میں صحابہ کی احتیاط

چونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد تھا کہ جو میری طرف جھوٹی روایت منسوب کرے گا اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حدیث روایت کرتے ہوئے بہت ڈرا کرتے تھے

اور قال رسول اللہ ﷺ کہتے ہوئے گھبرایا کرتے تھے۔

بعض صحابہ اس ڈر سے کہ کہیں بیان میں کچھ کمی بیشی نہ ہو جائے روایت ہی نہیں کرتے تھے۔ عمر میمونہ کا بیان ہے کہ میں ہر جمعرات کو عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ میں نے کبھی ان کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ آنحضرت ﷺ نے یوں فرمایا ہے۔ ایک دن ان کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے تو دفعتاً سر جھکا لیا۔ پھر میری نظر ان پر پڑی تو دیکھا کہ آنکھوں سے آنسو رواں ہیں، رگیں پھولی ہوئی ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس طرح فرمایا یا اس سے کچھ کم یا اس سے زیادہ یا اس کی مثل۔ (۸۰)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جب قال رسول ﷺ کہتے تو بدن کانپنے لگتا۔ حضرت زید بن ارقم نے تو روایت کرنا ہی ترک کر دیا تھا۔ لوگوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بھولنے لگا ہوں مجھے ڈر ہے کہ بیان حدیث میں مجھ سے کوئی کمی بیشی نہ ہو جائے۔

حضرت عمرؓ سے لوگوں نے درخواست کی حدیث بیان کیجیے تو فرماتے کہ اگر مجھ کو یہ ڈر نہ ہو کہ بیان میں کمی بیشی ہو جائے گی تو میں ضرور حدیث بیان کرتا۔

صالح کا قول ہے کہ میں نے حضرت جابر بن زیدؒ کو کبھی کسی حدیث کو رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب کرتے نہیں سنا کہ کہیں نسبت کرنے میں جھوٹ کا شائبہ یا غلط فہمی کا ارتکاب نہ ہو جائے۔ (۸۱)

صحابہ کے تحریری مجموعہ ہائے احادیث

☆ علامہ ذہبی لکھتے ہیں حضرت ابو بکر صدیقؓ نے پانچ سو احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا جسے بعد میں آپ نے تلف کر دیا۔ (۸۲)

☆ سمرہ بن جندب نے بھی ایک کتابچے میں کچھ احادیث ضبط کی تھیں جنہیں حسن بصری نے بھی روایت کیا ہے۔

☆ ترمذی نے جابر بن عبداللہ کے ایک صحیفے کے متعلق لکھا ہے کہ ”میں نے وہ صحیفہ قتادہؒ کے

سامنے صرف ایک مرتبہ پڑھا اور یاد ہو گیا''۔ (۸۳) حضرت علیؓ کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا جس میں اونٹوں کی زکوٰۃ، جراحات، حدود حرام اور معاہدات وغیرہ کے متعلق کچھ ہدایت دی تھیں۔ جو آپ نے حضور ﷺ سے لی تھیں۔ (۸۴)

☆ ایک مرتبہ رافع بن خدیج نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا کہ ہم آپ کے ارشادات قلم بند کر سکتے ہیں۔ فرمایا اکتبوا لا حرج یعنی لکھ لیا کرو کوئی حرج نہیں۔ (۸۵)

☆ عمرؓو بن حزم نے (جن کو حضور اکرم ﷺ نے یمن کا عامل مقرر کیا تھا) حضور اکرم ﷺ کے اکیس فرامین کتابی صورت میں جمع کیے تھے جو ابن طولون کی کتاب اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین کے ساتھ بطور ضمیمہ شامل ہیں۔

☆ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے بھی ہزاروں احادیث پر مشتمل مجموعہ حدیث تیار کیا تھا جس کا نام صحیفہ صادقہ تھا۔

☆ جابر بن عبداللہؓ نے احکام حج پر ایک رسالہ مدوّن کیا تھا جس میں متعدد احادیث درج تھیں۔ (۸۶)

☆ حضرت عائشہؓ کے بھانجے عمر بن زبیرؓ کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ تھا جس میں حضرت عائشہؓ اور دیگر صحابہ کی احادیث درج تھیں۔ (۸۷)

☆ سعد بن عبادہ انصاری کے پاس بھی احادیث نبوی کا ایک رسالہ تھا۔ (۸۸)

☆ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق ان کے شاگرد عکرمہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ طائف کے کچھ لوگ آپ کے پاس احادیث سننے کے لیے آئے تو آپ نے ایک جزداں نکالا اور انہیں چند احادیث املا کروائیں۔ (۸۹)

☆ ایک مرتبہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے بھی چند احادیث لکھ کر حضرت امیر معاویہؓ کو بھیجی تھیں۔ (۹۰)

☆ جب مروان بن حکم ۶۴ ہجری میں مدینہ کا گورنر مقرر ہوا تو اس نے حضرت ابو ہریرہؓ کو طلب کیا اور ان سے حدیثیں سنیں۔ ایک کاتب نے انہیں لکھ بھی لیا۔

☆ معن بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود راوی ہیں کہ ایک دن میرے والد نے ایک کتاب مجھے دکھائی اور حلفاً فرمایا کہ یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی لکھی ہوئی ہے۔ (۹۱)

☆ ایک مرتبہ کسی نے حضرت ابو ہریرہؓ کو ایک حدیث سنائی۔ انہوں نے سن کر کہا کہ مجھے اس حدیث کا علم نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ یہ میں نے آپ سے ہی سنی ہے۔ فرمایا اگر تم نے مجھ سے سنی ہے تو میرے پاس لکھی ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد اندر گئے اور ایک طومار اٹھا لائے اور وہ حدیث نکل آئی۔ مشہور ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے ۵۳۷۴ احادیث لکھ رکھی تھی۔ ان میں سے ۱۳۸ احادیث آپ کے شاگرد ہمام بن منبہ یمنی نے لکھ لی تھیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس نسخے کا ایک مخطوطہ ۱۹۳۳ میں برلن کی لائبریری سے ڈھونڈ نکالا ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ دمشق میں بھی تھا۔ جسے وہاں کی عربی اکیڈمی نے اپنے ایک رسالے میں قسط وار شائع بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کا ایک نیا ایڈیشن تیار کر کے ۱۹۵۵ میں حیدر آباد سے نکالا۔ اس کے ساتھ ۳۲ صفحات کا ایک فاضلانہ مقدمہ بھی لکھا۔

☆ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ قول درج ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی احادیث مجھ سے زیادہ تھیں کیونکہ وہ لکھ لیا کرتے تھے۔

☆ حضرت انس کی مرویات ۱۲۸۶ تھیں۔ آپؓ اپنی اولاد کو کہا کرتے تھے کہ انہیں لکھ لیا کرو۔ حاکم کی مستدرک میں سعید بن بلال کا یہ قول ہے کہ جب ہم حضرت انسؓ کے پاس جایا کرتے تھے تو وہ ایک بستہ نکال لاتے تھے اور فرماتے تھے یہ وہ حدیثیں ہیں جو میں نے حضور اکرم ﷺ سے سنیں اور پھر برائے تصدیق ان کو سنائی تھیں۔

خلفائے اربعہ اور حفاظت حدیث

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

حضرت ابو بکر صدیقؓ رسول اللہ ﷺ کے رفیق عزیز تھے۔ جتنا قرب اور رفاقت رسول اللہ ﷺ سے آپ کو نصیب ہوئی کسی اور کو نہیں ہوئی۔ حضور اکرم ﷺ کے احوال و کیفیات اور ارشادات وفرمودات سے جس قدر آپ مستفید ہو سکتے تھے اور کوئی نہیں۔

صدیق اکبرؓ کو رسول اللہ ﷺ سے گہرا تعلق ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کی احادیث اور ان کی حفاظت سے بھی گہرا شغف تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عمال کو دینے کے لیے زکوٰۃ کی ایک کتاب لکھوائی اور یہ کتاب ابھی عمال کو دینے بھی نہ پائے تھے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے یہ کتاب ان کو دے دی۔ صدیق اکبرؓ نے اسی کتاب کو اپنے پاس رکھ لیا اس کے بعد حضرت عمرؓ نے اسے اپنے پاس رکھا۔ بخاری میں حضرت انسؓ سے وہ طویل حدیث مروی ہے جس میں حضرت ابو بکرؓ کا وہ خط مذکور ہے جس میں انہیں بحیثیت حاکم بحرین بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اس خط میں زکوٰۃ کا پورا نصاب مذکور ہے۔ (۹۲)

صدیق اکبرؓ کا طرز عمل شاہد ہے کہ آپ کو احادیث رسول یاد بھی تھیں اور وقتاً فوقتاً آپ ان سے استدلال بھی کرتے تھے۔ آپ آنحضرت ﷺ کی سنت اور حدیث کو فیصلہ کی بنیاد بناتے ہے۔ آپ حضور ﷺ کے فیصلوں کے بارے میں ایسا نقطۂ نظر رکھتے تھے جس میں مصلحت اور نیاوی ملحوظات کو دخل نہیں تھا۔ وفات نبی کریم ﷺ کے بعد آپ نے جس طرح منکرین احادیث ورمنکرین زکوٰۃ کا مقابلہ کیا وہ صدیق اکبرؓ کی محبت حدیث اور اس کی حفاظت کو برقرار رکھنے کی لیل کے طور پر کافی ہے۔

مجموعہ احادیث

حضور اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ بہت غمگین رہتے۔ اگرچہ آپ نے اس اندوھناک گھڑی میں صبر وثبات اور استقلال و استقامت کا بے مثال مظاہرہ کیا۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی فرقت آپ کے لیے ایک مستقل بے چینی و بے قراری کا باعث تھی۔ شاید اسی غم کو مٹانے کے لیے آپؓ نے یہ تدبیر سوچی کہ آنحضرت ﷺ سے متعلق جو بھی معلومات آپؓ کے حافظے میں محفوظ تھیں ان کو قلم بند کرلیا جائے۔ اس طرح مصروفیت کی ایک صورت بھی بنتی تھی اور ذکر حبیب بھی ہوتا تھا۔ آپ کی بیٹی عائشہؓ فرماتی ہیں:

"میرے والد محترم نے نبی کریم ﷺ کی حدیثیں جمع کی تھیں اور وہ پانچ سو تھیں"۔ (۹۳)

لیکن کے بعد کے حالات سے ہم واقف ہوتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آنحضرت ﷺ کی احادیث کے اس لکھے ہوئے مجموعے کو جلا دیا۔ اس ضمن میں بھی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ:

> "ایک دن میں نے اپنے ابا جان کو سخت بے چین و مضطرب دیکھا۔ پھر ایک شب انہوں نے زیادہ کروٹیں لے کر بسر کی۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ اس دن مجھ سے اپنے ابا جان کی یہ کیفیت دیکھی نہ گئی۔ میں اٹھ کر ان کے سرہانے بیٹھ گئی اور عرض کی۔ کیا یہ کروٹیں آپ کسی جسمانی تکلیف کی وجہ سے لے رہے ہیں یا کوئی خبر آپ تک پہنچی ہے۔"

حضرت صدیق اکبرؓ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا غالباً وہ جس فیصلہ پر پہنچ چکے تھے اس پر کسی مشورے کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔ جب صبح ہوئی تو سیدنا ابوبکرؓ نے فرمایا، بیٹی ان احادیث کو لاؤ جو تمہارے پاس ہیں۔ ام المومنینؓ نے وہ مجموعہ پیش کر دیا۔ صدیق اکبرؓ نے اسے آگ میں جلا دیا۔ حضرت عائشہؓ نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ مجھے ڈر ہے کہ میں مر جاؤں گا اور وہ نسخہ میرے پاس ہوگا اور اس میں ایسے آدمی سے حدیثیں مروی ہوں گی جسے میں نے معتبر اور ثقہ سمجھا ہوگا مگر

حقیقت میں وہ ایسا نہ ہو جس طرح اس نے مجھ سے بیان کیا ہو اور میں نے اسے نقل کیا ہو۔ اس لیے ڈرتا ہوں۔

مجموعہ حدیث کو جلانے کا واقعہ بہت اہم ہے۔ لیکن کیا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ روایت حدیث اور حفاظت حدیث کو ناپسند کرتے تھے؟ یا اس واقعہ سے کوئی اور چیز مستنبط ہوتی ہے۔

ڈاکٹر خالد علوی حفاظت حدیث میں لکھتے ہیں کہ اس واقعہ سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ آپ روایت حدیث کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس روایت میں اس چیز کا احتمال نہیں ہے کہ آپ نے ان احادیث کو شبہ کی وجہ سے ناقابل قبول قرار دیا ہو۔ اگر ان کا یہ مطلب ہوتا تو شروع سے ہی آپؓ ان احادیث کو جمع کرنے کا ارادہ نہ فرماتے۔ غیر معصوم انسانوں کی خبر کے بارے میں شبہ کا احتمال رہتا ہے لیکن آنحضرت ﷺ کی حدیث کے سلسلے میں تو خصوصی وعید آ چکی تھیں اس لیے قرن خیر کے فیض یافتہ افراد سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ آپ ﷺ کی طرف جھوٹی بات منسوب کرتے۔ (۹۴)

مولانا مناظر احسن گیلانی اس واقعہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حدیثوں کے کتابی ذخیرے کی تحریک یا نذر آتش کرنے کا پہلا واقعہ عہد نبوت میں اس وقت پیش آیا تھا کہ کتاب کی کمیت اور کثرت تعداد سے خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ عمومیت کا رنگ پیدا کر کے آئندہ مسلمانوں کی زندگی کی وجہ یہی احادیث نہ بن جائیں۔ دین کے دونوں حصوں میں مراتب کے فرق کو باقی رکھنے کے لیے خود پیغمبر خدا کے زمانے میں احادیث کے اس ذخیرے کو جلا کر ختم کر دیا گیا تھا۔ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے زمانے میں اگرچہ کتاب تو ایک ہی تھی لیکن جس نے مرتب کی تھی اس کی ذاتی خصوصیات کا نفسیاتی اثر بھی اس فرق کو ختم کرنے کے لیے کافی تھا جیسے بالارادہ دین کے دونوں حصوں میں باقی رکھنا مقصود تھا۔ اس لیے ابوبکر صدیقؓ نے بھی نبی کریم ﷺ کی سنت کی پیروی کی اور اس کتاب کو جلا کر خطرے کا انسداد کیا۔ گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ جیسے عہد نبوت میں اس فرق کو باقی رکھنے کے لیے پیغمبر ﷺ نے جو طرز عمل اختیار کیا تھا اسی طرز عمل کی تجدید و احیا کا قدرتی موقع ابوبکر صدیقؓ (۹۵) کو بھی مل گیا۔

مولانا کی اس توجیہہ سے واضح ہوتا ہے کہ صدیق اکبرؓ کے پیش نظر احتیاط تھی کہ آنحضور ﷺ کی طرف جھوٹی بات منسوب نہ ہو جائے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا قاعدہ تو یہاں تک تھا کہ جب کوئی صورت حال پیش آئی جس کے متعلق کتاب اللہ میں کوئی اصل اور رسول کریم ﷺ کی سنت میں کوئی حل نہ ملتا تو فرماتے اب میں اپنی رائے سے اجتہاد کرتا ہوں اگر صحیح ہوا تو اللہ کی طرف اگر غلط ہوا تو میری طرف سے، اور اس پر میں اللہ سے معافی چاہتا ہوں۔ (۹۶)

ایک رائے یہ بھی ہے مجموعہ حدیث جلانے کا واقعہ درست نہیں ہے کیوں کہ اس قول کے سلسلہ میں سند میں علی بن صالح، مفصل بن غسان اور موسیٰ بن عبداللہ نامعلوم اور غیر معتبر ہیں۔ اس لیے سرے سے یہ واقعہ پیش ہی نہیں آیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ حدیث کو ماخذ ماننے اور جاننے کے باوجود استشہاد اور روایت میں بہت محتاط روش اختیار کرتے تھے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ مسلک دینی میں اختلاف راہ نہ پائے اور مسلم معاشرے کو متحد کرنے والے اصولی اختلاف و انتشار کی نذر نہ ہو جائیں۔ کیونکہ اگر ہر شخص آنحضور ﷺ کے حوالہ سے اپنی بات کرتا تو اختلافات بڑھنے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا۔ اگر حضرت ابوبکر صدیقؓ یہ احتیاط نہ کرتے تو ملت کا شیرازہ بکھر جاتا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

حضرت عمرؓ نے ہر کام کے لیے ایک ضابطہ مقرر کر رکھا تھا۔ انہوں نے اپنی حکومت کو تمام دینی اور دنیاوی ضروریات کا کفیل بنایا تھا۔ اس لیے وہ گوارہ نہیں کرتے تھے کہ کوئی شخص ان امور کو اختیار کرے جن کو حکومت نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ انہوں نے تعلیم، حدیث اور فقہ کے لیے الگ مدارس قائم کر دیے تھے۔ اس لیے ان کا منشا تھا کہ ان کے مقرر کردہ محدثین کے سوا عام طور پر تمام لوگ روایت حدیث نہ کریں اور ایسا کرنے کو وہ قانون شکنی سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی جن کے تفقہ اور علم کی رسول اللہ ﷺ نے تعریف فرمائی تھی اور حضرت

عمرؓ خود بھی ان کو خزینۃ العلم کہا کرتے تھے نیز جو حضرت ابو بکرؓ کے دور میں بھی فتوے دیا کرتے تھے اور مجلس شوریٰ کے رکن بھی تھے لیکن اس سب کے باوجود وہ حضرت عمرؓ کے نامزد کردہ مفتیوں میں سے نہ تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے فتویٰ کیا تو حضرت عمرؓ نے ان کو روک دیا۔

اصحاب رسول کریم ﷺ کثرت سے تھے۔ ان کی تعداد ایک لاکھ اور کئی ہزار تک پہنچتی ہے۔ ان میں صاحب فتویٰ فقیہہ ایک سو سے زیادہ تھے۔ ان میں ستائیس ممتاز تھے۔ پھر ان ستائیس میں بھی سات اس خدمت پر مامور تھے۔ حضرت عمرؓ کے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو روکنے کا صرف یہ باعث تھا کہ جب حکومت نے اس مقصد کے لیے باقاعدہ مفتی مقرر رکھے ہیں تو اس کے علاوہ کوئی شخص کیوں فتویٰ دے۔

غرض حضرت عمرؓ کی روک تھام ایک ضابطہ تھی اور چند مصالح کے تحت تھی۔ وہ مخالفت حدیث نہیں تھی کیوں وہ تو خود حدیث کے بہت بڑے راویوں میں سے ہیں۔ بخاری کی سب سے پہلی حدیث کے راوی حضرت عمرؓ خود ہیں۔ ان کی روک تھام غیر احکامی احادیث کے متعلق تھی۔ ایک گروہ غیر احکامی حدیث کی روایت کا مخالف تھا۔ اس میں حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ بھی تھے۔ (۹۷)

اب اگر کوئی یہاں یہ الزام لگائے کہ (معاذ اللہ) حضرت عمرؓ منکر حدیث تھے تو اسے اس شخص کی کم فہمی اور کم علمی تو قرار دیا جا سکتا ہے مگر انکار حدیث کا طرز عمل نہیں۔ اگر ہم غور کریں تو ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا یہ طرز عمل جس احتیاط پسندانہ حکمت عملی پر مبنی تھا یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ امت کے اندر قرآن و حدیث کا فرق نمایاں ہے نیز قرآن کی حفاظت اور احادیث کی تنقیح و تعدیل بھی بنیادی طور پر حضرت عمرؓ کے طرز عمل کا نتیجہ تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا طرز عمل دراصل ہادی کونین ﷺ کے عمل کا اتباع تھا کیونکہ خود حضور اکرم ﷺ حفاظت قرآن کی بڑی کوشش کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ تو متن حدیث کو فقیہانہ اور محدثانہ نظر سے جانچا بھی کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا امت مسلمہ پر یہ احسان ہے کہ انہوں نے کھرے اور کھوٹے، صحیح اور غلط کے درمیان تمیز کرنے کا قرینہ سکھایا ہے۔ علامہ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کا کثرت روایت سے منع کرنا اور کم روایت کا حکم دینا یہ صرف آنحضور ﷺ پر جھوٹ گھڑے جانے کا خوف تھا اور اس خطرہ کے پیش نظر کہ کثرت روایت میں اس کے امکانات ہیں۔''

آگے چل کر علامہ عبدالبرؒ لکھتے ہیں:

اگر آپ روایت کو ناپسند ہی کرتے تو قلت و کثرت دونوں کے متعلق نہی وارد ہوتی (۹۸)

علامہ کہتے ہیں کہ کثرت روایت کی مخالفت اور قلت روایت کا حکم حضرت عمرؓ نے اس لیے دیا تھا کہ کثرت کی صورت میں آنحضرت ﷺ کی طرف غلط بات منسوب ہو جانے کا اندیشہ تھا اور یہ خوف بھی تھا کہ جو حدیثیں لوگوں کے پاس اچھی طرح محفوظ نہ ہوں اور حافظے پر بھی بھروسہ نہ ہو تو لوگ محض قول بیان کرنے میں جری ہو جائیں گے۔

حضرت عمرؓ کا یہ طرز عمل ان کا اپنا اختیار کردہ نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں وہ خاص تربیت کام کر رہی تھی جو نبی کریم ﷺ نے اپنے رفقاء کی فرمائی تھی۔ اس کا اثر تقریباً ہر فیض یافتہ صحابی پر تھا۔ حضرت عمرؓ چونکہ منتظم تھے اور باقی لوگوں سے نسبتاً زیادہ ذمہ دار تھے اس لیے آپ کی تدابیر زیادہ نمایاں ہو گئیں ورنہ روایت حدیث میں احتیاط کا رویہ ہمیں دیگر صحابہ کی زندگیوں میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات زیادہ حدیثیں بیان کرنے سے روکتی ہے کہ نبی کریم نے فرمایا جو کوئی مجھ پر عمداً جھوٹ گھڑے گا اسے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنانا چاہیے۔ (۹۹)

صحابہ کرام کو جہاں ارشادات نبوی پھیلانے اور اپنے محبوب رہنما کے اقوال و افعال کے تذکرے کا اشتیاق تھا وہاں یہ احتیاط بھی ان کے پیش نظر تھی کہ جھوٹی بات منسوب کرنے سے ایمان و آخرت دونوں ضائع ہو جائیں گے۔ یہ ہے وہ پس منظر جس میں حضرت عمرؓ ہی نہیں بلکہ ہر صحابی محتاط تھا اور محتاط رویہ اختیار کرنے پر مجبور تھا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ لوگ جھوٹ اور سچ ملا کر حضور اکرم ﷺ کی طرف منسوب کرتے جیسا کہ بعد میں ہوا۔ لیکن حضرت عمرؓ کی اس پالیسی کا کم از کم یہ اثر ضرور رہا کہ کوئی شخص بغیر احتیاط کے حدیث بیان نہیں کرتا تھا۔

جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے کہ حدیث روایت کرنے والے صحابہ کو حضرت عمرؓ نے قید

کر دیا تھا محققین کے مطابق یہ روایت موضوع ہے۔ یہ واقعہ ہرگز نہیں ہوا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا مقصد قطعاً یہ نہیں تھا کہ لوگوں کو روایت حدیث سے کلیۃً روک دیا جائے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ لوگ اپنے بیان کو صرف انہی حدیثوں تک محدود رکھیں جن کے متعلق انہیں پورا اطمینان ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے خود اشاعت حدیث میں بہت دلچسپی لی تھی۔ انہوں نے مختلف علاقوں میں خود جلیل القدر صحابہ کو طریق تعلیم کے متعلق ہدایات دیں آپ رضی اللہ عنہ کا خود اپنا ارادہ تھا کہ احادیث و سنن کتابی شکل میں جمع کر دی جائیں لیکن آپ نے اس خیال سے کہ کہیں اس وجہ سے قرآن حکیم کی جانب سے التفات کم نہ ہو جائے، اس پر عمل نہیں کیا لیکن بعد میں جب یہ شبہ جاتا رہا تو اس امر کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا۔ ڈاکٹر خالد علوی نے حفاظت حدیث میں امام شاطبی کی تحقیق پر قاضی شریح کے نام حضرت عمرؓ کے مکتوبات کے اقتباس بھی درج کیے ہیں جس سے حضرت عمرؓ کے دل میں مقام حدیث کا نہایت واضح ثبوت ملتا ہے مثلاً:

''جب تمہارے پاس کوئی آدمی آئے تو تم جو کچھ کتاب اللہ میں ہے اس کے مطابق فیصلہ کرو۔ اگر تمہارے پاس کوئی ایسی چیز آئے جو کتاب اللہ میں نہیں ہے تو تم اس طریق پر فیصلہ کرو جو رسول اللہ ﷺ کا اس میں تھا۔ تم دیکھو جو چیز تمہارے لیے کتاب اللہ میں واضح ہے اس بارے میں کسی سے مت سوال کرو اور جو چیز کتاب اللہ میں واضح نہیں ہے۔ اس میں سنت رسول کا اتباع کرو۔''(۱۰۰)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ داماد رسول تھے۔ شرافت و تقویٰ کے اعتبار سے بھی حضور ﷺ کے ممتاز صحابہ میں سے تھے۔ آنحضرت ﷺ سے اکتساب علم اور فیضِ تربیت میں دیگر خلفائے راشدین کی طرح انہیں بھی خصوصیت حاصل تھی۔ حدیث کی روایت میں آپ نے دوسرے صحابہ کرام کی نسبت زیادہ احتیاط کی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جملہ مرویات کی تعداد ایک سو چھیالیس ہے جن میں تین

متفقہ علیہ ہیں، آٹھ صرف بخاری میں اور صرف پانچ مسلم میں ہیں۔

یہ قلت روایت بھی محض احتیاط کا نتیجہ ہے ورنہ آپ سنت کو دین میں حجت مانتے تھے اور خود احادیث بیان فرماتے تھے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے پہلے خطبے میں ارشاد فرمایا ''خبردار رہو میں پیروی کرنے والا ہوں، نئی راہ نکالنے والا نہیں۔ مجھ پر کتاب اللہ اور سنت نبوی کی پیروی کے بعد تمہارے تین حق ہیں۔ ایک یہ کہ میرے پیش رو خلفاء کے زمانے میں تمہارے اتفاق و اجماع سے جو فیصلے اور طریقے ہو چکے ہیں، ان کی پیروی کروں گا۔ دوسرا یہ کہ جو امور اہل خیر کے اجماع و اتفاق سے طے ہوں گے ان پر عمل درآمد کروں گا، تیسرا یہ کہ تم پر دست درازی کرنے سے باز رہوں گا تاوقتیکہ تم از روئے قرآن مواخذہ کے مستوجب نہ ہو جاؤ۔ (۱۰۱)

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت عثمانؓ سنت رسول اور حدیث رسول کو دین میں حجت تسلیم کرتے تھے لیکن تمام صحابہ کی طرح ان پر بھی احتیاط کا پہلو غالب تھا۔ عبدالرحمٰن بن حاطبؓ کہتے ہیں کہ میں نے کسی صحابی کو حضرت عثمانؓ سے زیادہ پوری بات کرنے والا نہیں دیکھا لیکن وہ حدیث بیان کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ (۱۰۲) اس کے باوجود آپ نے حدیث روایت کی، ان سے استدلال کیا اور مسائل کا استنباط کیا خصوصا حج کے مسائل میں انہیں بڑا ادراک حاصل تھا۔ یہاں تک کہ شیخین کے عہد میں بھی ان سے فتوے پوچھے جاتے اور پیچیدہ مسائل میں ان کی رائے دریافت کی جاتی تھی۔ ظاہر بات ہے کہ یہ تفقہ اور اجتہاد قرآن و سنت کے گہرے شغف کے بغیر نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ثابت ہے کہ استخراج مسائل میں سنت ایک ماخذ تھی۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی احتیاط کا مقصد بھی انکار حدیث نہیں تھا بلکہ ان کے پیش نظر بھی ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرح یہ بات تھی کہ کہیں کوئی سہو نہ ہو جائے۔ الفاظ و معانی کی ادائیگی میں معمولی سا شبہ بھی ان کے نزدیک بڑا جرم تھا۔ مسند احمد کی درج ذیل روایت سے حضرت عثمانؓ کی احتیاط کا خوب اندازہ ہوتا ہے:

''رسول اللہ کی حدیثوں کے بیان کرنے میں مجھے یہ چیز نہیں روکتی کہ میں دوسرے صحابہؓ سے حدیثوں کے یاد رکھنے میں کچھ کم ہوں مگر بات یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ

جس نے میری طرف کوئی ایسی بات منسوب کی جسے میں نے نہ کہا ہو تو اسے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لینا چاہیے۔ (۱۰۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کو کافی احادیث یاد تھیں لیکن ان کی عمومی اشاعت سے پرہیز کرتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ آپؓ حضور اکرم ﷺ کی طرف غلط بات منسوب ہونے کے اندیشے کی وجہ سے محتاط تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ حدیث کو اس قدر حجت مانتے تھے کہ اس کے مقابلے میں اپنے ذاتی اجتہاد اور رائے کو بھی ترک کر دیتے تھے۔ مسند احمد میں ہی ایک واقعہ مذکور ہے کہ حضرت عثمانؓ حالت احرام میں تھے کہ آپ کے سامنے شکار کا گوشت لایا گیا۔ آپ اسے کھانے ہی لگے تھے کہ حضرت علیؓ نے بتایا کہ احرام کی حالت میں شکار کا گوشت نہیں کھانا چاہیے۔ حضرت عثمانؓ نے استدلال کیا تو جناب علیؓ نے حضور اکرم ﷺ کا ایک واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے شکار کے گوشت کی ران کا تحفہ فقط اس لیے رد کر دیا تھا کہ آپ ﷺ احرام میں تھے۔ یہ سن کر حضرت عثمانؓ دستر خوان سے اٹھ گئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنحضرت ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے ہیں۔ آپ رسول اکرم ﷺ کے چچا زاد بھی ہیں اور داماد بھی۔ آپؓ کی تعلیم و تربیت آغوش نبوت میں ہوئی۔ آپؓ سیدہ فاطمہؓ کے شوہر، عشرہ مبشرہ، اصحاب بدر اور اصحاب بیعت ارضوان میں سے ہیں۔ کاتب وحی ہونے کا بھی شرف آپؓ کو حاصل ہے۔

روایت حدیث میں طریقہ

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ۵۸۶ احادیث مروی ہیں لیکن حدیث کے معاملے میں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طریقہ کار یہ تھا کہ جب کوئی آپؓ کے سامنے حدیث رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے بات کرتا تو اس سے قسم لیتے تھے۔ شاید اس کی وجہ عہد عثمانی میں برپا ہونے

والے فتنے اور فساد بھی ہوں۔ یوں بھی اسلام کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا۔ مختلف اقوام وطبقات، کے لوگ مسلمان ہو کر اسلامی جماعت میں جوق در جوق شریک ہو رہے تھے۔ ان سب کے ایمان واسلام کی حالت وہی نہ تھی جو صحابہ کرام کی تھی غالباً یہی وجوہات تھیں جس کی احتیاط کے سبب حضرت علیؓ صحت حدیث کی بابت قسم کا طریقہ اختیار کرتے تھے:

آپ آنحضرت ﷺ کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنے سے لوگوں کو ہی نہیں ڈراتے تھے بلکہ خود بھی ڈرتے تھے۔ آپ کئی مواقع پر فرمایا کرتے تھے۔

> ”آسمان سے گرنا مجھے اس سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ میں حضور ﷺ کی طرف غلط بات منسوب کروں۔“

جس طرح آپؓ حدیث بیان کرنے والے سے قسم لیتے تھے اسی طرح جب کوئی پوچھنے والا آپؓ سے کسی حدیث سے متعلق پوچھتا کہ آپ نے رسول اللہ ﷺ سے یہ بات سنی ہے تو جواب میں خود بھی قسم کھاتے اور فرماتے ”ہاں رب کعبہ کی قسم یہ رسول اللہ ﷺ نے ہی فرمایا ہے۔“

حضرت علیؓ کے عہد خلافت تک زمانہ نبوت کافی دور ہو چکا تھا۔ تاہم نبی کریم ﷺ کی جو باتیں احادیث کی شکل میں حضرت علیؓ تک پہنچی تھیں وہ آپؓ کے پاس محفوظ تھیں۔ اس کے علاوہ ایک نوشتہ بھی آپ کے پاس محفوظ تھا جو آپؓ نے اپنی تلوار کے نیام میں محفوظ رکھا ہوا تھا۔

کثیر الروایت صحابہ کرام

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں کچھ خوش نصیب وہ بھی ہیں جن کی مرویات کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ یہ وہ خوش نصیب ہیں جن کو صحبت رسول میں رہنے کے بار بار مواقع حاصل ہوئے۔ ان کو اصطلاح میں کثیر الروایت یا مکثرین صحابہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان مکثرین صحابہ کا مختصر تعارف وتذکرہ درج ذیل ہے۔

۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام عبدالرحمٰن بن صخر الدوسی الیمانی ہے۔ آپ کا اصل وطن یمن تھا اور آپ قبیلۂ دوس سے تعلق رکھتے تھے۔ جاہلیت میں نام عبدالشمس تھا۔ مسلمان ہونے پر آنحضرت ﷺ نے آپ کا نام عبدالرحمٰن رکھ دیا۔ والد کا نام صخر تھا اور ابو ہریرہ کنیت تھی۔ ہریرہ عربی زبان میں چھوٹی بلی کو کہتے ہیں۔ اس کنیت کی وجہ خود بیان کرتے ہیں کہ ”میں اپنے گھر والوں کی بکریاں چراتا تھا۔ میرے پاس ایک بلی تھی اسے میں رات کے وقت ایک درخت میں رکھ دیتا تھا اور دن کو اپنے ساتھ چراہ گاہ میں لے جاتا تھا، اس بنا پر لوگ مجھے ابو ہریرہ کہنے لگے۔ (۱۰۴)

۷ ہجری میں خیبر کے مقام پر اپنے قبیلہ کی ایک جماعت کے ساتھ حضور اکرم ﷺ کے دست اقدس پر دولت اسلام سے بہرہ اندوز ہوئے۔ آپ کو علم کی جستجو تھی۔ ہر وقت اسی دھن میں مصروف رہتے تھے اور اس بنا پر آنحضرت ﷺ سے سوالات کرنے میں بھی بڑے جری تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کسی نے بطور شکایت کہا کہ ابو ہریرہؓ آنحضرت ﷺ سے بہت کثرت سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا بخدا ان کی روایات میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ کرنا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ سرکار رسالت مآب ﷺ سے سوال کرنے میں بہت جری تھے اور اسی لیے ایسے

ایسے سوالات کرتے تھے جن کو ہم پوچھ بھی نہیں سکتے تھے۔ (۱۰۵)

علمی مقام

آنحضرت ﷺ کو بھی حضرت ابو ہریرہؓ کی اس جستجوئے علمی اور ذوق تحقیق و تلاش کا پورا احساس تھا لہٰذا آپ ﷺ ان کے علم کی پختگی اور قوت حافظہ کے لیے دعا بھی کیا کرتے تھے اور آپ ﷺ کی انہی شفقتوں اور دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ وہ علم حدیث کے سب سے بڑے حافظ بن گئے۔ اس کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو خود بھی صحابہ میں بڑے پائے کے محدث ہیں بیان کرتے ہیں کہ ابو ہریرہؓ ہم سب میں اعلم الحدیث ہیں۔ (۱۰۶)

حافظ ذھبی، جو تنقید رواۃ میں بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں، فرماتے ہیں کہ ابو ہریرہؓ علم کا ظرف تھے اور صاحب فتویٰ ائمہ کی جماعت میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ (۱۰۷)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابو ہریرہؓ اپنے ہم عصر روایوں میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے اور تمام صحابہ میں کسی نے حدیث کا اتنا ذخیر فراہم نہیں کیا۔ (۱۰۸)

روایات

حضرت ابو ہریرہؓ کی مجموعی روایات کی تعداد ۵۳۷۴ ہے ان میں ۳۲۵ متفق علیہ ہیں، ۷۹ میں امام بخاری اور ۹۳ میں امام مسلم منفرد ہیں۔

کثرت رواۃ کا سبب

حضرت ابو ہریرہؓ کو نبی کریم ﷺ سے بے پناہ محبت تھی۔ یہ اکثر وقت آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ ﷺ جہاں بھی جاتے حضرت ابو ہریرہؓ اکثر ساتھ ہوتے۔ اس طرح آپ نے سید الکونین سے علم کثیر حاصل کیا۔ آپؓ اہل صفہ کے سربراہ بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چار برس تو اسی طرح رہے کہ حصول علم سے ایک لمحہ بھی غافل نہ رہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ خود بھی بیان کرتے ہیں کہ ''لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ابو ہریرہؓ بہت سی حدیثیں بیان کرتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میرے مہاجر بھائی بازاروں میں اپنے کام میں لگے

رہتے تھے اور انصار صاحب جائیداد تھے وہ اس کے انتظامات میں مصروف رہتے تھے۔ میں فارغ البال تھا ہر وقت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہتا تھا۔ جن اوقات میں لوگ موجود نہیں ہوتے تھے میں ان میں بھی حاضر رہتا تھا۔ دوسرے لوگ جن چیزوں کو فراموش کر دیتے تھے میں یاد رکھتا تھا۔ (۱۰۹)

حضرت ابو ہریرہؓ کی اس خصوصیت کو دوسرے صحابہ بھی تسلیم کرتے تھے اور آپؓ کی احادیث پر اعتماد کرتے تھے۔ ابو عامر روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت طلحہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا ابو محمد! ہم کو نہیں معلوم کہ یہ یمنی (ابو ہریرہ) رسول اللہ ﷺ کو زیادہ جانتا ہے یا تم۔ حضرت طلحہ نے فرمایا کہ اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے وہ حدیثیں سنی ہیں جو ہم نے نہیں سنیں اور انہیں وہ چیز معلوم ہے جسے ہم نہیں جانتے۔ ہم لوگ مالدار تھے۔ ہمارے اپنے گھر تھے، بال بچے تھے۔ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس صبح و شام آتے اور چلے جاتے تھے۔ ابو ہریرہؓ خوش نصیب تھے ہر وقت خدمت رسول ﷺ میں رہتے تھے۔ جہاں سرکار جاتے وہ بھی ساتھ جاتے تھے۔ اسی کا سبب ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے ایسی حدیثیں سنی ہیں جو ہم نے نہیں سنیں۔

ایک مرتبہ فرمایا! جب میں مدینہ آیا اس وقت میری عمر تین سال سے کچھ اوپر تھی۔ اس وقت حضور اکرم ﷺ خیبر میں تشریف رکھتے تھے۔ پھر میں سایہ کی طرح نبی کریم ﷺ کے ساتھ رہا۔ اس لیے میں دوسرے لوگوں سے زیادہ حدیثیں جانتا تھا۔

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ سے سوال کیا کہ قیامت کے دن کون خوش قسمت آپ کی شفاعت کا زیادہ حق دار ہوگا۔ فرمایا کہ حدیث میں تمہاری حرص کو دیکھ کر مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ یہ سوال تم سے پہلے کوئی نہیں کرے گا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا خاص امتیاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس فیاضی سے علم کی دولت عطا کی، اسی فیاضی سے آپؓ نے اس کو مسلمانوں کے لیے وقف عام کر دیا۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے جہاں بھی کچھ مسلمان مل جاتے ان کے کانوں تک اقوال نبوی ﷺ پہنچا دیتے۔ جمعہ کے دن

،نماز سے قبل کا وقت حدیث کے لیے مخصوص تھا۔ لہٰذا ہر جمعہ کو پہلے حدیثیں بیان کرتے پھر نماز پڑھتے۔ آپ کے دامنِ کمال میں جتنے علمی جواہر تھے سب عام مسلمانوں میں تقسیم کر دیے۔ لیکن وہ احادیث جن کو آنحضرت ﷺ نے پیشین گوئی کے طور پر بیان کیا تھا زبان سے نہ نکالیں۔ (۱۱۰)

حدیث کے بیان کے ضمن میں قرآن حکیم کی اس آیت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے تھے۔

> "جو لوگ ہمارے احکام و ہدایات کو جو ہم نے نازل کی ہیں (کسی غرض فاسد سے) چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم نے ان لوگوں کے (سمجھانے) کے لیے اپنی کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیا ہے، ایسوں پر اللہ اور تمام لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔" (سورۃ البقرہ۔ ۱۵۹)

فرمایا کرتے تھے اگر قرآن کی یہ آیت نازل نہ ہوئی ہوتی تو میں کبھی کوئی حدیث بیان نہ کرتا۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

سیدنا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا شمار اساطین امت میں ہوتا ہے۔ آپ عام طور پر ابن عمرؓ کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ ان خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے فرزند ہیں جن کے بارے میں سید الانبیاء ختم المرسلین حضرت محمد ﷺ کا ارشاد ہے:

> "اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتا لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے"

ام المومنین حضرت حفصہ بنتِ عمرؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حقیقی بہن تھیں۔ آپؓ ۲ نبوی میں پیدا ہوئے۔ ۶ نبوی میں حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا تو اس وقت ابن عمرؓ ابھی تقریباً پانچ سال کے بچے تھے۔ والد گرامی کے قبول اسلام کے ساتھ وہ خود بخود ہی اسلام کے دامنِ رحمت کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ ۱۳ نبوی میں حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ مدینہ ہجرت کی تو حضرت عبداللہ بھی والد گرامی کے ساتھ مدینہ پہنچ گئے۔ اس وقت ان کی عمر گیارہ برس تھی۔ غزوات کا آغاز ہوا اور سرور عالم غزوۂ بدر کے لیے روانہ ہوئے تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے شوق جہاد سے بے تاب ہو کر حضور اکرم ﷺ سے لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت مانگی لیکن

آپ ﷺ کا معمول تھا کہ پندرہ سال سے کم عمر لڑکوں کو لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت نہیں یتے تھے۔ چونکہ حضرت ابن عمرؓ کی اس وقت عمر ۱۳ برس تھی اس لیے حضور اکرم ﷺ نے انہیں اپس بھیج دیا۔ غزوہ احد میں وہ ۱۴ برس کے تھے اس لیے اس میں بھی شریک نہ ہو سکے۔

لہٰذا سب سے پہلے جس غزوے میں انہیں شریک ہونے کی سعادت ملی وہ غزوۂ احزاب ھا۔ ۶ ہجری میں صلح حدیبیہ سے پہلے انہیں بیعت رضوان میں بھی شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس طرح وہ اصحاب الشجر میں بھی داخل ہو گئے جنہیں اللہ تعالیٰ نے کھلے لفظوں میں اپنی خوشنودی کی بشارت دی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حسن اتفاق سے بیعت رضوان کا شرف انہیں اپنے جلیل القدر والد سے پہلے حاصل ہو گیا تھا۔ وہ اس طرح کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہؓ کو ایک نصاری سے گھوڑا لانے کے لیے بھیجا۔ حضرت عبداللہ باہر نکلے تو سرور عالم ﷺ صحابہ کرام سے یعت لے رہے تھے۔ انہوں نے لپک کر پہلے خود بیعت کی اور پھر والد گرامی کو جا کر اطلاع دی وہ بھی فوراً بارگاہِ رسالت میں پہنچے اور بیعت کی سعادت حاصل کی۔

بیعت رضوان کے بعد حضرت ابن عمرؓ نے خیبر، فتح مکہ، حنین، طائف اور تبوک کے غزوات میں سرور عالم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔ (۱۱۱)

آنحضرت ﷺ سے حضرت ابن عمرؓ کو بے پناہ محبت تھی۔ اسی باعث آپ کو حدیث نبوی سے بھی گہرا عشق تھا۔ آپ کی مرویات کی تعداد ۲۶۳۰ ہے۔ آپ حضور ﷺ کے نہ صرف ان رشادات کو حرز جان بنا لیتے تھے جو آپ ﷺ سے براہ راست سنتے تھے بلکہ ان ارشادات و مودات کو بھی جان سے عزیز بناتے تھے جو آپ دوسرے سے سنتے تھے۔ البتہ روایت حدیث یں حضرت ابن عمرؓ خوب احتیاط فرماتے تھے۔ اس وقت تک کوئی حدیث بیان نہیں کرتے تھے ب تک نہیں پورا یقین نہیں ہو جاتا تھا کہ اب اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہے۔ اس شدت حتیاط کی وجہ سے آپ کی احادیث کو بہت مستند سمجھا جاتا ہے۔

آپ نے آنحضرت ﷺ سے براہ راست حدیثیں بیان کیں اور حضرت ابوبکرؓ، حضرت ثمانؓ، حضرت ابوذرؓ، حضرت معاذؓ اور حضرت عائشہؓ سے بھی بیان کی ہیں۔ آپؓ سے بہت سے

لوگوں نے بھی حدیث بیان کی جن میں خاص طور پر حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت سالمؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آپ علم سے رغبت اور دنیا سے بے رغبتی کے باعث بھی بہت مشہور تھے۔

ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ قریش کے نوجوانوں میں دنیا سے بے رغبتی کے سلسلے میں نفس پر سب سے زیادہ قابو پانے والے عبداللہ بن عمرؓ تھے۔

جابرؓ کہتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں کہ اس نے دنیا کو پایا ہو اور وہ دنیا کی طرف اور دنیا اس کی طرف مائل نہ ہوئی ہو لیکن عبداللہ بن عمرؓ اس سے محفوظ رہے۔

چونکہ آپ کی ہمشیرہ حضرت حفصہؓ حضور اکرم ﷺ کی اہلیہ محترمہ تھیں اس لیے آپ ﷺ سے قریبی تعلق کی بنیاد پر حضرت ابن عمرؓ کو بیت نبوی میں آنے جانے کی سہولت میسر تھی۔ اس لیے بھی حضرت ابن عمرؓ کو رسول اللہ کی صحبت اقدس میں رہنے کا خاصا موقع نصیب ہوا۔ خدمت حدیث کرتے کرتے آخر ۷۳ ہجری میں آپؓ نے وفات پائی۔ آپ کے پاس احادیث کا لکھا ہوا ذخیرہ بھی موجود تھا۔

۳۔ حضرت انسؓ بن مالک

حضرت انسؓ بن مالک بن النضر بن ضمضم بن زید بن حرام بن جندب بن عامر بن غنم بن عدی بن النجار مشہور صحابی رسول ہیں۔ آپؓ خادم رسول، امام، مفتی، قاری و معلم قرآن، محدث، جلیل القدر اور نامور راوی تھے۔ آپؓ خزرجی اور مدنی نسبت رکھتے تھے اور ابوثمامہ اور ابوحمزہ کنیت۔ آپؓ ہجرت سے نو دس برس پہلے پیدا ہوئے۔ آپؓ کا والد مالک، قبولیت اسلام سے محروم رہا لیکن والدہ ام سلیم بنت ملحان مشرف بہ اسلام ہو کر مدینے میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرا بیٹا انس بن مالک تحفہ کے طور پر قبول فرمایئے۔ یہ آپ کی خدمت کیا کرے گا۔ چنانچہ وہ مدینے میں نو دس برس تک آنحضرت ﷺ کی خدمت کرتے رہے۔ حضرت ام سلیم نے ابوطلحہ انصاری کے اسلام لانے کے بعد ان سے

شادی کر لی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے ام سلیم کے لیے جنت کی بشارت بھی دی تھی۔ ام سلیمؓ ہی نے ام المومنین حضرت صفیہؓ کی شادی کے موقع پر ان کے بال سنوارنے اور عطر لگانے کا شرف بھی حاصل کیا تھا۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نو دس سال حضور اقدس کی خدمت میں رہا لیکن اس تمام عرصے میں آنحضرت ﷺ نہ تو کبھی مجھ سے ناراض ہوئے اور نہ ہی برا بھلا کہا۔ یہاں تک کہ کبھی یہ بھی نہ کہا کہ یہ کام کیوں کیا اور یہ کیوں نہ کیا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے لیے دعا کی تو انؓ کے مال و جان میں بڑی برکت ہوئی، یوں انہوں نے لمبی عمر پائی۔

حضرت انسؓ نے آنحضرت ﷺ اور کبار صحابہ کرام سے بکثرت احادیث روایت کی ہیں اور تقریباً ایک سو راویوں نے ان سے روایت کی ہے۔ آپؓ کی مرویات کی تعداد ۲۲۸۶ ہے۔ متفق علیہ احادیث ۱۸۰، البخاری میں منفرد ۸۰ اور مسلم میں منفرد ۷۰ ہیں۔ حدیث روایت کرنے کے بعد حضرت انسؓ احتیاطاً کہا کرتے تھے اور کما قال رسول اللہ ﷺ (یا جیسے رسول خدا نے فرمایا)۔ (۱۱۲)

حضرت انسؓ بہت کم گو اور کثرت سے عبادت کرنے والے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ام سلیم کے بیٹے سے زیادہ حضور اکرم ﷺ کے مشابہ نماز پڑھنے والا نہیں دیکھا۔ آپ ۹۳ ہجری میں بصرہ میں فوت ہوئے۔ آپؓ کے بارے میں قتادہؒ کہتے ہیں کہ جب انسؓ بن مالک فوت ہوئے تو مورق نے کہا کہ آج آدھا علم چلا گیا۔ کیوں کہ اگر علم حدیث میں ہماری کوئی مخالفت کرتا تو ہم اسے کہتے کہ آؤ اس شخص سے تصدیق کریں جس نے نبی سے براہ راست سنا ہے اور یہ خوش نصیب حضرت انسؓ ہوتے تھے۔ وہ حدیثیں لکھ کر بھی محفوظ کرتے تھے۔ جب سیکھنے کے لیے زیادہ لوگ آجاتے تو صحیفہ لے آتے اور کہتے یہ وہ احادیث ہیں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے براہِ راست سنی ہیں اور ان احادیث کو نہ صرف لکھا ہے بلکہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں تصدیق کے لیے پیش بھی کیا ہے۔

۴۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ بنت ابی بکرؓ

آپؓ کا نام عائشہ اور لقب صدیقہ تھا۔ آپؓ رسول اللہ ﷺ کی شریک حیات تھیں۔ آپؓ نبوت کے پانچویں سال یعنی شوال ۵ نبوی بمطابق جولائی ۶۱۴ عیسوی کو مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی کنیت ان کے بھانجے عبداللہ بن زبیرؓ کے نام پر ام عبداللہ رکھی، جنہیں حضرت عائشہؓ نے متبنیٰ بنا لیا تھا۔ آپ کے والد خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ اور والدہ ام رومانؓ ہیں۔

والد کی جانب سے سلسلہ نسب ساتویں پشت میں اور والدہ کی طرف سے گیارہویں پشت میں رسول اللہ ﷺ سے جا ملتا ہے۔

آنحضرت ﷺ سے ان کے نکاح کی تحریک مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعونؓ کی بیوی خولہ بنت حکیمؓ نے کی۔ حضرت خدیجہ جیسی رفیق و غمگسار بیوی کی وفات کے بعد آنحضرت ﷺ اکثر غمگین و پریشان رہا کرتے تھے۔ اس پر حضرت خولہ بنت حکیمؓ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ ﷺ دوسرا نکاح کر لیں اور اس سلسلے میں سودہ بنت زمعہؓ جو کہ مہاجرین حبشہ میں شامل تھیں اور جن کے خاوند سکرانؓ بن عمرو مکہ واپسی پر انتقال کر چکے تھے کا نام اور ساتھ ہی دوسرا نام حضرت عائشہ بن ابی بکر کا پیش کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس تجویز سے اتفاق فرمایا۔ اس سے پہلے حضرت عائشہؓ جبیر بن مطعم بن عدی سے منسوب تھیں۔ ان کا خاندان تاحال مسلمان نہیں ہوا تھا۔ بہر حال رسول اللہ ﷺ کا پیغام ملنے پر حضرت ابوبکرؓ نے مناسب سمجھا کہ پہلے ان لوگوں سے پوچھ لیا جائے۔ مطعم کی بیوی نے اس بنا پر کہ یہ لڑکی بیٹے سے نکاح کے بعد میرے گھر آ گئی تو یہاں اسلام کو قدم جمانے کا موقع مل جائے گا، خود ہی اس رشتے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ یہ نسبت منسوخ کر دی گئی۔

رسول اللہ ﷺ سے حضرت عائشہؓ کا نکاح نبوت کے دسویں برس ہوا۔ مہر کی رقم پانچ سو درہم مقرر کی گئی۔ حضرت عائشہؓ کی رخصتی ہجرت کے چند ماہ بعد شوال ۱ ہجری بمطابق اپریل ۶۲۳

عیسوی مدینہ منورہ میں نہایت سادگی کے ساتھ ہوئی۔ روایات کے مطابق اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر نو برس تھی لیکن بعض مؤرخین اور سیرت نگاروں نے یہ عمر پندرہ برس بھی ثابت کی ہے۔ اس شادی کے ذریعے عربوں کی کئی لغو یعنی بے ہودہ اور احمقانہ خیالات کی اصلاح ہو گئی۔ مثلاً وہ لوگ منہ بولے بھائی کی بیٹی سے شادی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کو انت اخی فی الاسلام‘‘ فرمایا تھا۔ اس شادی سے اس تصور کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اسی طرح اہل عرب ماہِ شوال کو منحوس سمجھتے تھے کیونکہ قدیم زمانے میں شوال کے دوران طاعون کی وبا پھیلی تھی۔ حضرت عائشہؓ کا نکاح اور رخصتی دونوں اسی مہینے میں عمل میں آئے اور اس طرح یہ تصور بھی باطل قرار دے دیا گیا۔

مدینہ منورہ میں حضرت عائشہؓ نے مسجد نبوی کے اردگرد بنے ہوئے حجروں میں سے ایک میں قیام کیا۔ یہی حجرے ازواج مطہرات کے مستقل گھر تھے۔ حضرت عائشہؓ زندگی بھر مسجد نبوی کے اس حجرے میں مقیم رہیں۔ حضرت ابو بکرؓ کا گھرانہ چونکہ سب سے پہلے نور اسلام سے فیض یاب ہوا تھا اس لیے حضرت عائشہؓ نے مسلمان باپ کی گود میں آنکھیں کھولیں۔ بچپن ہی سے انتہائی ذہین، عقل مند، باریک بین اور دوررس نگاہ کی مالک اور دینی مسائل کے فہم وشعور اور احکام کے اجتہاد واستنباط میں ازواجِ مطہرات میں امتیاز رکھتی تھیں۔ دین کی خدمت اور مسائل شریعہ کی تبلیغ وترویج کے لیے اعلیٰ قابلیتوں کی مالک تھیں اور اسی بنا آنحضرت ﷺ کی نگاہ میں بہت محترم تھیں۔

تفسیرِ قرآن، علمِ حدیث، فقہ وقیاس، عقائد، علم اسرار دین، اسلامی تاریخ، افتا اور ارشاد اور خصوصاً عورتوں سے متعلق دینی مسائل پر جس قدر گہری نظر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تھی، ان کے علاوہ چند ایک کبار صحابہ کرام ہی کا حصہ ہے۔ (۱۱۳)

آپؓ کی زندگی ایک ایسی خانہ دار مسلمان خاتون کے لیے نمونہ ہے جو اپنے گھر کی مکمل نگہداشت کرتی ہے اور اپنے ماحول کو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق ایک مثالی صورت دینے کی تگ ودو کرتی ہے۔ آپؓ تربیت اور رفاقت رسول کی بنا پر اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر فائز تھیں اسی وجہ سے زہد وتقویٰ کا بھی نمونہ تھیں۔ سنجیدگی، فیاضی، قناعت پسندی، اللہ کی عبادت

گزاری اور انسانی ہمدردی کے اوصاف ان کی ذات میں بکمال احسن موجود تھے۔

آپؓ کا شمار حدیث میں کثیر الروایت صحابہ میں ہوتا ہے۔ آپ سے مروی احادیث کی کل تعداد دو ہزار دو سو دس ہے۔ ان میں سے دو سو چھیاسی احادیث صحیحین میں شامل ہیں۔ قرأت کے بعض طریقے بھی انہی سے مروی ہیں۔ اکابر صحابہ کی اکثریت آپؓ کے شاگردوں کی صف میں شامل ہے۔ ان میں عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن، صفیہ بنت شیبہ اور عائشہ بنت طلحہ رضی اللہ عنہم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جلیل القدر صحابہ نے ان کے مقام علمی کا اعتراف بھی کیا ہے۔

علی بن مسہر کہتے ہیں کہ ہشام نے اپنے والد (عروہ) سے روایت کی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے کسی شخص کو عائشہؓ سے زیادہ قرآن اور اس کے فرائض، حلال و حرام، عربوں کی روایات اور انساب کے بارے میں علم رکھنے والا نہیں دیکھا۔

ابن ذویب کہتے ہیں کہ عائشہؓ تمام لوگوں سے زیادہ عالم تھیں۔ اکابر صحابہ بھی آپ سے مسائل دریافت کرتے تھے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ ہم اصحاب رسول کو کوئی مشکل ایسی پیش نہ آئی جس کا علم عائشہؓ کے پاس نہ ہو۔

ایک تہائی علم فقہ آپ کی احادیث پر مشتمل ہے۔ آپؓ نے ۶۶ سال کی عمر میں ۱۷ رمضان المبارک ۵۷ ہجری کو مدینہ میں وفات پائی، حضرت ابو ہریرہؓ نے نماز پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہیں۔

۵۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ

آپؓ رسول اللہ ﷺ کے عم زاد ام المومنین حضرت میمونہؓ کے سگے بھانجے اور دور اول کے جلیل القدر صحابی تھے۔ امام المفسرین والحدیث حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہجرت سے تین سال قبل مکہ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت بنو ہاشم شعب ابی طالب میں قید کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ والدہ

نے ہجرت سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس لیے آپ پیدائش کے وقت ہی سے مسلمان تسلیم کیے جاتے ہیں۔

مزاج اور طبیعت میں لڑکپن ہی سے تحقیق علمی کا رجحان موجود تھا۔ ابھی نوعمر ہی تھے کہ معلم بن گئے اور حصول علم کے خواہش مند لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ حضرت ابن عباسؓ کا علم و فضل صرف زبانی یادداشتوں پر مشتمل نہ تھا بلکہ ان کے پاس تحریری یادداشتوں کا بھی ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا، چنانچہ انہوں نے نہ صرف عوام میں درس دینا شروع کر دیا۔ بلکہ تعلیم کے لیے باقاعدہ جماعتیں بنا دیں اور تقریباً معین نظام الاوقات کے مطابق ہفتے کے مختلف دنوں میں مختلف موضوعات، مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ زمانہ قبل از اسلام وغیرہ پر باقاعدہ درس دینے لگے۔ چونکہ حضرت ابن عباسؓ کو مستند عالم دین سمجھا جاتا تھا اس لیے لوگ ان سے فتوے بھی لینا شروع ہو گئے تھے۔

آپؓ نے عہد طفلیت سے وفات نبوی تک آٹھ دس سال کی مدت رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں بسر کی۔ اس کے بعد کبار صحابہؓ کی صحبت اختیار کی اور ان سے آنحضرت ﷺ کی احادیث سننے اور یاد کرنے کا خاص اہتمام فرمایا۔ کتب حدیث میں آپ سے ایک ہزار چھ سو ساٹھ احادیث مروی ہیں۔

خوش اخلاقی، وجاہت اور تفقہ فی کتاب اللہ کے باعث صحابہ ان سے مشورے کیا کرتے تھے اور اکثر ان کی رائے پر عمل بھی کرتے اور کہتے تھے کہ ابن عباس تم بہت بڑے عالم ہو۔

محمد حسین ذھبی نے آپ کے بلند مرتبہ علمیت کے پانچ اسباب بتائے ہیں۔

۱۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے دعا فرمائی تھی کہ یا اللہ ابن عباس کو کتاب و حکمت کا علم عطا فرما، دین کی سمجھ اور تاویل کا فہم عطا کر۔

۲۔ خانوادۂ نبوت میں تربیت ہوئی۔

۳۔ کبار صحابہ کی صحبت نصیب ہوئی۔

۴۔ قوت حافظہ کے ساتھ لغت و ادب عرب کا حفظ ہونا۔

۵۔ اجتہاد کا مرتبہ حاصل ہو جانا۔ (۱۱۴)

حدیث میں مقام

حضرت ابن عباسؓ کا شمار ان خاص صحابہ میں ہوتا ہے جو علم حدیث کے اساطین سمجھے جاتے ہیں۔ اگر حدیث کی کتابوں سے ان کی روایتیں علیحدہ کر لی جائیں تو ان کے بہت سے اوراق سادہ رہ جائیں گے۔ ان کی ۲۶۶۰ مرویات میں ۷۵ متفق علیہ ہیں یعنی بخاری اور مسلم دونوں میں ہیں۔ ان کے علاوہ ۱۸ روایات میں بخاری منفرد ہیں اور ۴۹ میں مسلم۔

ان کی روایات کی کثرت اور معلومات کی وسعت خود ان کی ذاتی کاوش و جستجو کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے بہت سی روایتیں براہِ راست خود زبان وحی و الہام سے لی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے وقت ان کی عمر ۱۳ سال سے زائد نہ تھی اور اس چھوٹی سی عمر میں انہوں نے جستجوئے علم کی بنا پر علم و حکمت کا بہت سا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔

ابو سلمہؓ روایت کرتے ہیں کہ ابن عباسؓ کہتے تھے کہ جس شخص کے متعلق مجھے پتہ چلتا کہ اس نے آنحضرت ﷺ سے کوئی حدیث سنی ہے تو میں خود اس کے مکان پر جا کر حاصل کرتا۔

ابو رافعؓ آنحضرت ﷺ کے غلام تھے۔ اس لیے ان کو آنحضرت ﷺ کے اقوال سننے اور افعال دیکھنے کا زیادہ موقع ملتا تھا۔ ابن عباسؓ ان کے پاس کاتب لے کر جاتے اور پوچھتے کہ آنحضرت ﷺ نے فلاں فلاں دن کیا کیا۔ ابو رافع بیان کرتے اور کاتب لکھتا جاتا۔

اس تلاش و جستجو نے ان کو اقوال و افعال نبوی کا بہت بڑا حافظ بنا دیا تھا۔ اکثر اکابر صحابہؓ کو جو عمر اور مرتبہ میں ان سے کہیں زیادہ تھے، بھی ان کے مقابلے میں کمی علم کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔ جب صحابہ کرام میں آنحضرت ﷺ کے کسی قول و فعل کے بارے میں اشکال ہوتا تو وہ ابن عباسؓ کی طرف رجوع کرتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ کا حلقہ درس بہت وسیع تھا۔ سینکڑوں طلب گار روزانہ ان کے خرمن کمال سے خوشہ چینی کرتے تھے۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ درس و تدریس کے لیے وقف تھا۔ کبھی کوئی

شخص ان کے چشمۂ فیض سے ناکام نہیں لوٹا۔ اس فیض عام کے علاوہ بعض مجلسیں خصوصیت کے ساتھ درس وتدریس اور علمی مذاکروں کے لیے مخصوص تھیں اور ان میں باقاعدہ ہر علم وفن کی جدا جدا تعلیم ہوتی تھی۔ ابوصالح تابعی بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابن عباسؓ کی طرف ایک ایسی علمی مجلس دیکھی کہ اگر سارا قریش اس پر فخر کرے تو بھی بجا ہوگا۔ اس مجلس کا یہ حال تھا کہ عبداللہ بن عباسؓ کے مکان کے سامنے آدمیوں کا اتنا اژدھام تھا کہ ان کی کثرت سے آمد ورفت مشکل تھی۔ میں نے جا کر اس اژدھام کی اطلاع دی تو مجھ سے پانی مانگا۔ میں نے پانی لا کر دیا، انہوں نے وضو کیا، وضو کر کے بیٹھ گئے۔ پھر مجھ سے کہا جاؤ قرآن کے جس شعبہ سے متعلق جو سائل ہوں ان کو اطلاع دو۔ میں نے اطلاع دی۔ دیکھتے دیکھتے سائلوں سے سارا گھر اور تمام حجرے بھر گئے۔ جس نے جو سوال کیا اس کے سوال سے زیادہ اس کو جواب دے کر رخصت کیا۔ پھر مجھ سے کہا جاؤ حرام وحلال اور فقہ کے سائلوں کو بلاؤ۔ میں نے ان لوگوں کو اطلاع کی۔ چنانچہ ان کا جم غفیر آ گیا اور جن کو جو سوالات کرنا تھے پیش کیے، فرداً فرداً سب کو نہایت تشفی عطا کی۔ اس کے بعد فرائض کے سائلوں کو بلایا۔ ان کی تعداد بھی اتنی بڑی تھی کہ پورا گھر بھر گیا ان کی بھی تسلی وتشفی فرما کر فارغ ہوئے تو مجھ سے کہا کہ عربی زبان، شعروشاعری اور ادب وانشا کے سائلوں کو بلاؤ۔ چنانچہ میں نے اطلاع دی۔ یہ لوگ آئے۔ ان کے ہجوم کا بھی وہی حال تھا ان لوگوں نے جو سوالات کیے ان کے سوالات سے زیادہ جوابات دیے۔ ابوصالح یہ واقعہ بیان کر کے کہتے ہیں کہ میں نے کسی شخص کی اتنی بڑی مجلس نہیں دیکھی۔

درس کے ان مستقل حلقوں کے علاوہ کبھی کسی نماز کے بعد تقریر اور خطبہ کے ذریعے تعلیم دیتے۔ عبداللہ بن شقیق بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ابن عباسؓ نے عصر کے بعد ہم لوگوں کے سامنے تقریر کی اور اتنی دیر تک کرتے رہے کہ آفتاب غروب ہو گیا۔ یہاں تک کہ نماز بھی دیر سے پڑھی گئی۔ حضر کے علاوہ سفر میں بھی ان کا یہ چشمۂ فیض جاری رہتا تھا۔ چنانچہ جب چند دنوں کے لیے حج کی غرض سے مکہ معظمہ تشریف لے جاتے تو اس وقت بھی ان کی قیام گاہ طالبان علم کی درس گاہ بن جاتی۔

حضرت ابن عباسؓ کی اس فیض رسانی اور علم وعرفان کی بارش کی وجہ سے ان کے تلامذہ کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور ان تلامذہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے۔

عبید اللہ بن عبد اللہ کہا کرتے تھے کہ اس زمانہ میں علوم کے لحاظ سے کوئی عبد اللہ بن عباس کا ہمسر نہیں تھا۔ معاملہ فہمی اور اصابت رائے میں وہ سب پر فائق تھے۔ نسب دانی اور تاویل قرآن کے بڑے ماہر تھے۔ احادیث نبوی اور حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے فیصلوں کا ان سے زیادہ کوئی واقف کار نہیں تھا۔ ادب، تفسیر، حدیث، حساب اور فرائض میں ممتاز درجہ رکھتے تھے اور ان سب معاملات میں ان کی رائے بے نظیر ہوتی تھی۔ ان کے علمی مذاکروں کے دن مقرر ہوتے تھے۔ کسی دن قرآن کی تفسیر کا درس دیتے تھے، کسی دن حدیث کا، کسی دن مغازی کے واقعات کا تذکرہ کرتے، کسی دن ایام عرب کی داستانوں کا۔ غرض ان کا چشمۂ فیض ہر دن نئے رنگ سے ابلتا تھا۔ میں نے کسی بڑے سے بڑے عالم کو نہیں دیکھا جو تھوڑی دیر کے لیے ان کی صحبت میں بیٹھا ہو اور کمال علم کے سامنے اس کی گردن نہ جھک گئی ہو۔

حضرت ابن عباسؓ صحابہ کی جماعت میں عمر میں چھوٹے تھے مگر علم میں بہت بڑے تھے۔ مجاہد تابعی کہتے تھے۔ میں نے ابن عباسؓ کے فتاویٰ سے بہتر کسی کا فتویٰ نہیں پایا۔ طاؤس کہتے تھے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کے پانچ سو اصحاب کو دیکھا ہے، سب ابن عباسؓ کی رائے کو فوقیت دیتے تھے۔ حضرت زید بن ثابت کا انتقال ہوا تو حضرت ابوہریرہؓ نے کہا آج اس امت کا عالم اٹھ گیا امید ہے کہ اللہ رب العزت ابن عباسؓ کو ان کا قائم مقام بنائے گا۔ مشہور صحابی ابی ابن کعبؓ کے بیٹے محمد روایت کرتے ہین کہ ابن عباسؓ ایک دن میرے والد کے پاس بیٹھے تھے۔ جب وہ اٹھ کر چلے تو میرے باپ نے کہا کہ ایک دن یہ شخص اس امت کا حبر یعنی زبردست عالم ہوگا۔ حضرت ابی بن کعبؓ کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ (۱۱۵)

۶۔ حضرت جابر بن عبد اللہ انصاریؓ

ابو عبد اللہ جابر بن عبد اللہ عمرو بن حزام انصاری اپنے زمانے میں مفتی مدینہ تھے بیعت عقبہ

کے ستر انصار میں آپ بھی شامل تھے۔

حضور اکرم ﷺ کے ساتھ بے حد محبت کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ صرف بدر اور احد میں اس لیے نہیں شریک ہو سکے تھے کہ ان کے والد انہیں بہن بھائیوں کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ جب یہ مقروض تھے تو حضور اکرم ﷺ نے ازراہِ شفقت ان کا قرض ادا کیا۔ عسرت کی زندگی کے باوجود تحصیل علم میں پیچھے نہیں ہے۔ جب تک رسول اللہ حیات رہے آپ ﷺ سے علم حاصل کیا۔ آپ ﷺ کی وفات کے ہند صحابہ سے اکتساب علم کرتے رہے۔ ۹۴ سال کی عمر پائی اور غالباً آپ ہی آخری صحابی تھے، نہوں نے ۷۸ ہجری میں وفات پائی۔

آپ نے نبی کریم ﷺ کے علاوہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوسعیدؓ اور حضرت عبداللہ بن انیسؓ وغیرہ سے روایت کی۔

جن لوگوں نے آپؓ سے روایت کی ان میں آپ کی اولاد میں سے عبدالرحمان، عقیل ئمہ، سعید بن المسیبؒ، محمود بن لبیدؒ، ابوجعفر الباقر، محمد بن عمرو بن الحسن، عامر الشعبی مشہور ہیں۔

آپؓ کی مرویات کی تعداد ۱۵۴۰ ہے۔ شیخین نے ۲۱۲ احادیث کی تخریج کی ہے۔ ساٹھ تفق علیہ ہیں۔ بخاری کی ۲۶ اور مسلم کی ۱۲۶ ہیں۔

حضرت جابر کا اپنا صحیفہ بہت مشہور ہے۔ اسے امام مسلم نے کتاب الحج میں اور ابن سعد نے مجاہد کے ترجمہ میں نقل کیا ہے۔ (۱۱۶)

۷۔ حضرت ابوسعید الخدریؓ

سعید بن مالک بن سنان بن عبید بن ثعلبہ الخدریؓ کے بارے میں روایت ہے کہ آپؓ اہل حفہ میں سے تھے۔ احد کے موقع پر کم سنی کے باعث شریک نہ ہو سکے۔ اس کے بعد تمام بڑے زوات میں شریک ہوئے۔ آپؓ حضور اکرم ﷺ کے حلقہ ہائے علم میں شامل ہوتے اور احادیث

یاد کرتے۔ آپؓ کے والد نے غزوہ احد کے دن انہیں حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۳ سال تھی، لہٰذا جنگ میں شریک ہونے سے منع کر دیے گئے۔ اس پر والد مکرم نے ابو سعید کی قوت و طاقت کی تعریف کرتے ہوئے کہا یا رسول اللہ ﷺ! ابو سعید کم عمر ضرور ہے مگر فربہ اندام ہے۔ مگر ہم قربان جائیں رسول اللہ ﷺ کی حکمت و تدبر کے کہ ان جیسے ہیروں کو آپ ﷺ قرآن و حدیث کی خدمت کے لیے محفوظ کرتے چلے گئے۔

ابو سعید خدریؓ ان صحابہ میں شامل تھے جنہوں نے سرور کائنات ﷺ سے عہد کیا تھا کہ وہ دینی امور میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے۔ اس بیعت میں ابو ذر غفاریؓ، سہل بن سعدؓ، عبادہ بن صامتؓ اور محمد بن مسلمہؓ شریک تھے۔ حضرت سعید الخدریؓ نہایت عابد، زاہد، متقی اور پرہیزگار تھے۔ آپ نے ۷۴ ہجری میں وفات پائی۔

آپؓ نے رسول اللہ ﷺ کے علاوہ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ او حضرت زید بن ثابتؓ وغیرہ سے روایت کی۔

آپؓ سے جن لوگوں نے روایت کی ان میں ابن عباسؓ عبد اللہ بن عمرؓ، جابرؓ، سعید بن المسیبؓ، ابو عثمان الہندیؒ، طارق بن شہاب، عیاض بن ابی سرح اور مجاہد وغیرہ شامل ہیں۔

آپ کی مرویات ۱۱۷۰ ہیں۔ شیخین نے ۱۱۱ حدیثیں نقل کی ہیں جن میں متفق علیہ ۴۳ ہیں اور بخاری نے ۱۶ اور مسلم نے ۵۲ نقل کی ہیں۔

صحاح ستہ کے علاوہ مسانید اور سنن میں بھی آپ کی مرویات شامل ہیں۔ (۱۱۷)

۸۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ

نام نامی اسم گرامی عبد اللہ، ابو عبد الرحمٰن کنیت، والد کا نام مسعود اور والدہ کا نام ام عبد تھا۔ شجرہ نسب یہ ہے:

عبد اللہ بن مسعود بن غافل بن حبیب بن شمخ بن فار بن مخزوم بن صاہلہ بن کاہل بن الحارث بن تمیم بن سعد بن ہذیل بن مدرکہ بن الیاس بن مضر۔

آپ ۱۲ عام الفیل میں پیدا ہوئے۔ ایام جاہلیت کے دوران عہد بچپن میں عقبہ کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد آپ شب و روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چشمہ علم سے مستفیض ہونا شروع ہو گئے۔ خلوت، جلوت، سفر، حضر غرض ہر موقع پر ساقی علم و حکمت کی خدمت میں حاضر رہتے تھے لیکن طالب صادق تھے کہ پیاس بجھنے ہی نہ پاتی تھی۔

حضور اکرم ﷺ کے پاس آپؓ صرف اپنی علمی پیاس ہی نہیں بجھاتے تھے بلکہ خدمت خاص کی سعادت حاصل کرنے میں بھی پیچھے نہیں رہتے تھے۔ مسواک اٹھا رکھنا، جوتا پہنانا، سفر کے موقع پر کسادہ کسنا، عصا لے کر آنحضرت ﷺ کے آگے آگے چلنا آپؓ کی ہر ممکن کوشش و سعی ہوتی تھی۔ اس خدمت گذاری کے ساتھ وہ آنحضرت ﷺ کے ہمدم و ہمراز بھی تھے۔

مسجد نبوی کی پشت پر رہتے تھے۔ آپ اور آپ کی والدہ اکثر بیت مکرم میں اتنا آتے جاتے کہ ناواقف لوگ انہیں آپ ﷺ کے گھر کا فرد سمجھتے تھے۔

آپؓ کا جسم لاغر، قد کوتاہ، رنگ گندم گوں اور سر پر کانوں تک نہایت نرم و خوبصورت زلفیں تھیں۔ حضرت عبداللہ انہیں اس طرح سنوارتے کہ ایک بھی بال بکھرنے نہیں پاتا تھا۔

آپؓ کی ٹانگیں نہایت پتلی تھیں۔ حضرت عبداللہ ہمیشہ انہیں چھپائے رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ رسول اللہ ﷺ کے لیے مسواک توڑنے کے لیے پیلو کے درخت پر چڑھے تو ان کی پتلی ٹانگیں دیکھ کر لوگوں کی بے اختیار ہنسی نکل گئی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا! تم ان کی پتلی ٹانگیں دیکھ کر ہنستے ہو حالانکہ یہ قیامت کے روز میزان عدل میں کوہِ احد سے بھی زیادہ بھاری ہوں گی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس وقت ایمان لائے تھے جب مومنین کی جماعت صرف چند اصحاب پر مشتمل تھی اور مکہ کی سرزمین میں رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی نے اعلانیہ بلند آہنگی کے ساتھ تلاوت قرآن کی جرأت نہیں کی تھی۔ ایک روز مسلمانوں نے باہم مجتمع ہو کر اس مسئلہ پر گفتگو کی اور سب نے بالاتفاق کہا کہ خدا کی قسم! قریش نے اب تک بلند آواز سے قرآن کو سنا ہی نہیں ہے۔ لیکن پھر سوال پیدا ہوا کہ اس پُر خطر فرض کو انجام کون دے گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آگے بڑھ کر اپنے آپ کو پیش کیا۔ لوگوں نے کہا کہ تمہارا خطرہ میں پڑنا مناسب نہیں۔ اس کام

کے لیے تو ایک ایسا شخص درکار ہے جس کا خاندان وسیع ہو اور وہ اس کی حمایت میں مشرکین کے دستِ ستم سے محفوظ رہے۔ لیکن حضرت عبداللہ نے جوش ایمان سے برانگیختہ ہو کر کہا ”مجھے چھوڑ دو خدا میرا محافظ ہے۔“

دوسرے روز چاشت کے وقت جب کہ تمام مشرکین قریش حاضر تھے، آپؓ نے ایک طرف کھڑے ہو کر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد قرآن کی تلاوت کا جادو جگایا تو مشرکین نے تعجب اور غور سے سن کر پوچھا ”ابن ام عبد کیا کہہ رہا ہے“؟ کسی نے کہا محمدؐ پر جو کتاب اتری ہے، اس کو پڑھتا ہے۔ یہ سننا تھا کہ تمام مجمع غیظ و غضب سے مشتعل ہو کر ٹوٹ پڑا اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اس قدر مارا کہ چہرہ متورم ہو گیا۔ لیکن جس طرح پانی کے چند چھینٹے آگ کو اور زیادہ مشتعل کر دیتے ہیں اسی طرح حضرت عبداللہ کا شعلۂ ایمان اس ظلم و تعدی سے اور بھڑک اٹھا، مشرکین مارتے گئے لیکن ان کی زبان بند نہ ہوئی۔

حضرت عبداللہ جب اس فرض کو انجام دے کر شکستہ حالی کے ساتھ اپنے احباب میں واپس آئے تو لوگوں نے کہا کہ ہم اسی ڈر سے تمہیں جانے نہیں دیتے تھے۔ کہنے لگے ”خدا کی قسم! اللہ اور قرآن کے دشمن آج سے زیادہ میری نظروں میں کبھی ذلیل نہیں تھے۔ حضرت عبداللہ کے اس جوش اور غیرت ایمان نے مشرکین مکہ کو دشمنی پر آمادہ کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کی مسلسل و پیہم ایذا رسانیوں سے تنگ آ کر دو مرتبہ سرزمین حبش جانا پڑا۔ پھر تیسری مرتبہ دائمی ہجرت کا ارادہ کر کے یثرب کی راہ لی اور یہاں پہنچ کر حضرت معاذ بن جبلؓ کے مہمان ہوئے۔

یہاں حضور اکرم ﷺ کے سایہ میں رہتے ہوئے تمام اہم اور مشہور جنگوں میں جانبازی اور پامردی کے ساتھ سرگرم رہے۔ غزوہ احد، خندق، حدیبیہ، خیبر اور فتح مکہ میں بھی رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب رہے۔

فطری رحم دلی، نرمی، عفو، درگزر آپؓ کی خاص صفات و عادات تھیں۔ زہد و بے نیازی میں ثانی نہیں رکھتے تھے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی نعمتوں کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیتے تھے۔ لیکن قومی سرمایہ کے تحفظ میں اس قدر سخت تھے کہ اعزہ، احباب، افسر اور والی حکومت کے ساتھ کسی قسم کی

رعایت نہیں فرماتے تھے۔

حدیث سے تعلق خاص

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زیادہ شہرت بحیثیت محدث اور مفسر قرآن ہے۔ روایت حدیث میں حد درجہ محتاط تھے۔ جب کبھی قال رسول اللہ ﷺ زبان سے نکلتا تو جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ خود بھی محتاط تھے اور شاگردوں کو بھی احتیاط کا سبق دیتے تاکہ رسول اللہ ﷺ کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے۔

آپ کی مرویات کی تعداد ۸۴۸ ہیں، جن میں بخاری اور مسلم میں ۶۴ ہیں، ان کے علاوہ ۲۱ بخاری میں اور ۳۵ مسلم میں ہیں۔

مذاکرہ حدیث کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ بسا اوقات مذاکرۂ حدیث کے شوق میں تلامذہ و احباب کے گھر پر تشریف لے جاتے اور دیر تک عہد نبوت کا اثر رہتا۔ وابصہ اسدی فرماتے ہیں کہ میں کوفہ میں دوپہر کے وقت اپنے گھر میں تھا کہ یکایک دروازہ سے السلام علیکم کی آواز بلند ہوئی۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا تو عبداللہ بن مسعودؓ تھے۔ میں نے پوچھا کہ ابن مسعودؓ! اس وقت کیسے یاد کیا۔ فرمانے لگے، آج بعض مصروفیات کی وجہ سے دن چڑھ گیا اور اب فرصت ملی تو یہ خیال آیا کہ کسی سے باتیں کر کے عہد مقدس کی یاد تازہ کر لوں۔ غرض وہ بیٹھ کر حدیثیں بیان فرمانے لگے اور دیر تک پر لطف صحبت رہی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حدیث بیان کرتے وقت نہایت مؤدب، متین اور سنجیدہ بن جاتے تھے اور اس طرح نقشہ کھینچ دیتے تھے کہ گویا سامع خود حضرت رسول اللہ ﷺ کی زبانِ فیض ترجمان سے سن رہا ہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک طولانی حدیث بیان فرمائی۔ جس میں قیامت، جنت اور مومنین و سبحان رب العزت کے سوال و جواب کا تذکرہ تھا۔ حدیث ختم کر کے متبسم ہوئے اور کہا کہ تم پوچھتے نہیں کہ میں کیوں ہنستا ہوں۔ لوگوں نے کہا کہ بتایئے آپ کیوں ہنستے ہیں۔ فرمایا، اس لیے کہ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح تبسم فرمایا تھا۔

تلامذہ کے علاوہ احباب کا ایک بڑا مجمع بھی ہر وقت حاضر رہتا تھا۔ شفیق کا بیان ہے کہ "ہم لوگ مسجد میں بیٹھ کر عبداللہ بن مسعودؓ کے مکان سے باہر نکلنے کا انتظار کرتے رہتے تھے کہ وہ باہر نکلیں تو کب فیض حاصل کریں۔ (۱۱۸)

۹۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ

عبداللہ آپ کا نام، ابومحمد اور ابوعبدالرحمٰن کنیت تھی۔ قریش کے خاندان بنوسہم سے آپؓ کا تعلق تھا۔ آپؓ کا شمار شمع رسالت کے ان پروانوں میں ہوتا ہے جو آسمان علم وفضل کے آفتاب و ماہتاب سمجھے جاتے تھے۔

آپؓ بلند قامت، سرخ وسپید اور فربہ اندام تھے۔ آپؓ کے والد کا نام عمرو بن العاصؓ اور والدہ کا نام ریطہ بنت منبہ تھا۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے فتح مکہ سے چھ مہینے پہلے اسلام قبول کیا لیکن سعادت مند فرزند حضرت عبداللہ ان سے پہلے ہی مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔

آپ کے والد حضرت عمروؓ بن العاص فاتح مصر اپنی شجاعت اور بہادری، تدبیر وحکمت، عسکری مہارت اور بصیرت وذکاوت کی بنا پر تاریخ اسلام کے نہایت قد آور سپوت ہیں جب کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اپنے علم وفضل اور ذوقِ عبادت کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ وارفع مقام رکھتے ہیں۔ وہ قریش کے ان گنے چنے لوگوں میں سے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ دربار رسالت میں حاضر ہو کر رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے جو سنتے اسے لکھ لیتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ رئیس ابن رئیس تھے۔ قبول اسلام کے بعد عبادت کی کثرت کا یہ حال تھا کہ صحیح معنوں میں دائم الصوم اور قائم اللیل ہو گئے۔ دنیاوی معاملات سے یکسر بے نیازی اختیار کر لی تھی۔ حضرت عمروؓ بن العاص ہجرت کر کے مدینہ آئے اور بیٹے کا یہ رنگ دیکھا تو ان کو سمجھایا کہ دنیا کو مکمل ترک کر کے عبادت میں اتنی شدت مناسب نہیں لیکن حضرت عبداللہ اپنی روش

پر قائم رہے۔ اس پر حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے بیٹے کے حالات کو عرض کیا جس پر حضور اکرم ﷺ نے حضرت عبداللہ کو بلایا اور فرمایا کہ مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ تم نے یہ معمول بنا رکھا ہے کیا یہ درست ہے کہ تم دن کو ہمیشہ روزہ رکھتے ہو اور رات بھر نوافل پڑھتے ہو۔ عرض کیا، جی یا رسول اللہ! حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

> ''یہ طریقہ چھوڑ دو۔ روزے بھی رکھا کرو اور ناغہ بھی کیا کرو، اس طرح رات کو نماز بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو۔ کیوں کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، اسی طرح تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے اسی طرح تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے مہمانوں اور ملاقاتیوں کا بھی تم پر حق ہے۔ رمضان کے روزں کے علاوہ ہر مہینے تین دن کے نفلی روزے رکھنا ہمیشہ روزہ رکھنے کے حکم میں ہے''۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓو بن العاص نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پھر تم داؤدؑ کی طرح روزے رکھا کرو یعنی ایک دن روزہ اور ایک روز افطار۔ اس پر حضرت عبداللہ نے سر تسلیم خم کر دیا اور آئندہ ایسے ہی کیا۔ آپؓ اکثر جہاد کے مواقع پر آنحضرت ﷺ کے ہم رکاب رہے۔

حفاظت حدیث

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کا حاصل زندگی حفاظت اور کتابت حدیث تھا۔ کیونکہ اکثر بارگاہ نبوی میں حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوتی تھی لہٰذا جو کچھ لسان رسالت سے سنا کرتے تھے، اسے لکھ لیا کرتے تھے۔ بعض اصحاب نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا میں آپ کی ہر بات نہ لکھا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''لکھو! اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اس منہ سے حق کے سوا کبھی کچھ نہیں نکلتا۔

رسالت مآب ﷺ سے اجازت ملنے کے بعد حضرت عبداللہ نے پورے اعتماد کے ساتھ احادیث لکھنی شروع کر دیں اور ان کا ایک مجموعہ مرتب کیا جس کا نام ''الصادقہ'' رکھا۔ اس مجموعے کو وہ نہایت عزیز رکھتے تھے اور کسی حالت میں بھی اس کی مفارقت گوارہ نہ کرتے تھے۔ آپؓ فرماتے تھے کہ ''مجھے زندگی کی خواہش مند یہی کتاب ''صادقہ'' بنا رہی ہے۔ یہ نہ ہو تو مجھے جینے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ آپؓ فرماتے تھے کہ یہ وہ صحیفہ ہے جسے میں نے آنحضرت ﷺ سے سن سن کر لکھا ہے۔ (۱۱۹)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اپنے علم و فضل کے لحاظ سے طبقہ اصحاب میں ایک خاص امتیاز رکھتے تھے۔ آپ کو اپنی مادری زبان کے علاوہ عبرانی میں بھی دسترس حاصل تھی۔ آپ نے توریت اور انجیل کا بھی نہایت غور سے مطالعہ کیا تھا۔ احادیث نبوی کا کثیر ذخیرہ آپ کے پاس تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ یہ اعتراف کیا کرتے تھے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کو ان سے زیادہ حدیثیں یاد ہیں کیوں کہ عبداللہ بن عمروؓ حضور اکرم ﷺ سے جو کچھ سنتے تھے اسے لکھ لیتے تھے لیکن ابو ہریرہؓ لکھتے نہیں بلکہ زبانی یاد کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص مجموعہ حدیث کے سب سے پہلے باقاعدہ مدوّن ہیں۔ آپ کا حلقہ درس نہایت وسیع تھا۔ لوگ دور دراز سے ان کے پاس تعلیم حدیث لینے آیا کرتے تھے اور شائقین علم کا ایک مجمع ان کے گرد و پیش رہتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے خرمن علم سے سب سے زیادہ اہل بصرہ نے خوشہ چینی کی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا اگرچہ یہ خیال تھا کہ عبداللہ بن عمروؓ کی حدیثیں زیادہ ہیں لیکن حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی مرویات کی تعداد سات سو ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی مرویات زیادہ تعداد میں پہنچ نہیں پائیں۔ ان میں سترہ متفق علیہ ہیں، آٹھ بخاری میں منقول ہیں اور بیس مسلم میں نقل ہیں۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر فاروقؓ، حضرت ابو الدرداءؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ وغیرہ سے روایت کی اور آپؓ سے روایت کرنے والوں میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت سائب بن یزیدؓ، حضرت سعید بن المسیبؓ اور طاؤس و عکرمہ وغیرہ شامل ہیں۔ (۱۲۰)

عہد تابعین اور خدمت حدیث

صحابہ کے بعد تابعین عظام کا دور آیا۔ انہوں نے بکمال مشقت ومحنت قرآن وحدیث کے علوم کی ترویج واشاعت کو مقصد زندگی بنا کر اسے آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ومدوّن کر دیا۔

تابعین کون ہوتے ہیں

خطیب بغدادی کا قول ہے۔

التابعی من صحب صحابیا۔ (۱۲۱)

یعنی تابعی وہ ہے جس کو صحابی کی رفاقت حاصل ہو۔

تابعین جمع ہیں جبکہ اس کا واحد تابع یا تابعی ہے۔ ان کے بہت سے درجے ہیں۔ بعض تو ایسے ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کے صحابہ کو دیکھا تھا۔ بعض لوگ آپ ﷺ کے زمانے کے بعد ہوئے لیکن صحابہ میں سے ایک یا چند سے ملے۔ کچھ ایسے بھی ہیں کہ جو نبی کریم ﷺ کی حیات میں پیدا ہوئے اور کم سنی کے باعث براہ راست آپ ﷺ سے حدیث یاد رکھنے کے قابل نہیں تھے۔ (۱۲۲)

اکثر محدثین کی رائے ہے کہ بلاشبہ تابعی وہ ہے جس نے صحابہ میں سے محض ایک یا زیادہ صحابہ کو دیکھا ہو۔ ان کے نزدیک طویل صحبت شرط نہیں۔

ڈاکٹر صبحی صالح نے لکھا ہے کہ تابعی وہ ہے جو کسی صحابی سے اس حالت میں ملا ہو کہ وہ صاحب ایمان ہو اور اس حالت میں اس کی موت واقع ہوئی ہو۔

تابعین کی فضیلت

قرآن حکیم کی سورۃ توبہ کی آیت ۱۰۰ سے تابعین کی فضیلت کا واضح پہلو نکلتا ہے۔

''اور مہاجرین وانصار میں سے سابقین واولین اور وہ (تابعین) جو بھلائی کرنے میں ان

کے بعد تھے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے۔ (سورۃ توبہ۔۱۰۰)

احادیث میں بھی تابعین کی فضیلت وستائش کے صاف ارشادات ملتے ہیں۔ مثلاً ارشاد رسول ﷺ ہے۔

خیر امتی القرن الذین یلوننی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم۔ (۱۲۳)

میری امت میں اس زمانہ کے لوگ یعنی صحابہ بہتر ہیں جو مجھ سے ملے ہیں پھر وہ لوگ جو ان سے ملے ہوں (یعنی تابعین) پھر وہ لوگ جو ان سے ملے ہوں (یعنی تبع وتابعین)۔

ایک اور روایت میں اس مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

خیر الناس قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم۔ (۱۲۴)

سب سے بہتر میرے زمانے کے لوگ (یعنی صحابہ کرام) ہیں۔ پھر وہ جو اس سے متصل ہیں (یعنی تابعین) اور پھر وہ لوگ جو ان سے متصل ہیں (یعنی تبع وتابعین)۔

- نبی کریم ﷺ کے دار فانی سے رخصت ہونے کے وقت ایک لاکھ سے زیادہ ایسے لوگ موجود تھے جنھوں نے آپ ﷺ کی زیارت کی تھی اور یہ لوگ تمام اطراف میں پھیل گئے تھے۔ اور وہاں جن جن صاحب ایمان حضرات نے صحابہ کو دیکھا، ان سے سیکھا، ان کی صحبت اختیار کی وہ تمام مقدسین تابعین کہلاتے ہیں اور ان کا بھی تاریخ حدیث میں مقام اور احترام یہ ہے کہ رسول خاتم النبیین کے اقوال اور افعال کی حفاظت اور تدوین وترتیب میں اپنی زندگیوں کے آخری سانس تک کو قربان کر دیا۔ اب تک گو کتابت حدیث کا رواج روبہ ترقی تو تھا تاہم ابھی تک اصل اعتماد حافظے یعنی ذہنی یاداشت پر ہی تھا۔

تحریک تدوین حدیث

۱۰۰ ہجری سے ۱۵۰ ہجری تک

۹۹ ہجری میں حضرت عمر بن عبدالعزیز مسند خلافت پر بیٹھے تو آپؒ نے محسوس کیا کہ جن بزرگوں کے سینوں میں اقوال و افعال نبوی کا ذخیرہ ہے وہ یکے بعد دیگرے اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آنے والی نسلیں ان سر چشمہ ہائے سعادت سے محروم ہو جائیں۔ لہٰذا آپ نے اپنے وقت کے علما کو لکھا کہ جو حدیث یا سنت آپ کو ملے اس کو لکھ لیا جائے، میں ڈرتا ہوں کہ کہیں علم حدیث مٹ نہ جائے۔ چنانچہ آپ کے حکم کی تعمیل میں قاضی ابوبکر بن محمد بن عمر بن حزم نے احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا۔ امام زہری مدینے کی گلی گلی میں گئے اور ایک ایک دروازے پر دستک دے کر حدیث پوچھی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز ۹۹ ہجری سے رجب ۱۰۱ تک خلیفہ رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تدوین حدیث کی تحریک ۱۰۰ ہجری کے قریب قریب ہی شروع ہوئی۔

اس دوسری صدی ہجری کا نصف یعنی ۱۵۰ ہجری تک پہنچ کر درس حدیث کا بھی عام چرچا ہو گیا تھا۔ مدینہ، بصرہ، شام اور کوفہ میں اس کے مستقل مراکز قائم ہو گئے تھے جنھوں نے حضرت عکرمہ عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن عمر، سعید بن جبیر، مجاہد، طاؤس، شہاب زہری اور امام نخعی جیسے ائمہ حدیث اور ارباب علم و فضل پیدا کیے۔

بنو عباس کے عہد حکومت میں جب علم و فن کا چرچا عام ہوا اور علوم و فنون کی تدوین شروع ہوئی تو اب علمائے اسلام نے سب سے پہلے مختلف شہروں میں رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال اور آپ کی سیرت مقدسہ مدوّن کرنے کی طرف توجہ مبذول کی۔ چنانچہ جریج مکہ میں ابن جریج نے مدینہ میں امام مالک بن انس اور محمد بن اسحاق نے، بصرہ میں ربیع بن صبیح، سعید بن عروبہ اور حماد

بن ابی سلمہ نے، کوفہ میں سفیان الثوری نے، شام میں امام اوزاعی نے اور مصر میں لیث بن سعد نے حدیث کے الگ الگ مجموعے تیار کیے۔ ابن جریج کی وفات ۱۵۰ ہجری میں ہوگئی تھی۔ اس لیے غالب ہے کہ اس مقدس کارِ خیر میں سبقت کا سہرا انہی کے سر ہوگا۔ (۱۲۵)

ان ائمہ حدیث نے یہ مجموعے اس جذبہ کے تحت مرتب کیے کہ علما کرام فنا ہو رہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ علم آئندہ نسلوں تک پہنچنے سے رہ جائے۔ ان کتب حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال کے ساتھ صحابہ کرام کے اقوال اور تابعین نے اپنے فتاویٰ بھی شامل کر دیے۔ ان مجموعوں میں آج کل صرف ایک مجموعے موطا جو کہ امام مالک کی حسن ترتیب کا شاہکار ہے، خلعت دوام نصیب ہوا۔

موطا کے لغوی معنی ہیں سہل، آراستہ، تیار، متوازن اور متفق علیہ۔ امام سیوطی لکھتے ہیں کہ امام مالک نے احادیث کا یہ مجموعہ تیار کر کے مدینہ کے ستر فقہا کو بھیجا تھا اور ان سب نے اس کی صحت کو تسلیم کیا تھا۔ اس بنا پر آپ نے مجموعے کا نام موطا (یعنی متفق علیہ) رکھا تھا۔

امام مالک کے سامنے ایک لاکھ احادیث تھیں۔ ان میں سے آپ نے دس ہزار کا انتخاب کیا۔ پھر کاٹتے کاٹتے یہ صرف ۱۷۲۰ رہ گئیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

مسند (مرویات صحابہ)	۶۰۰	مرسل	۲۲۲
موقوف	۶۱۳		
اقوال تابعین	۲۸۵	کل احادیث	۱۷۲۰

موطا کے راویوں پر قاضی عیاض (۵۴۴ھ) نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں تقریباً تیرہ سو نام تھے۔ ان میں پچاسی صحابہ، تئیس صحابیات اور اڑتالیس تابعین تھے۔

امام مالک سے کئی ہزار شاگردوں نے موطا کی احادیث سنیں۔ ان میں سے تقریباً ایک ہزار نے لکھ لیں۔ ان میں بقول سیوطی ہارون الرشید کے بیٹے امین، مامون اور موتمین بھی شامل تھے رفتہ رفتہ یہ تمام مسودات گم ہو گئے اور تاریخ حدیث میں صرف سولہ نام باقی رہ گئے۔ ان میں مشہور ترین اور سب سے زیادہ قابل اعتماد یحییٰ بن یحییٰ معموری کا نسخہ ہے اور موطا مالک سے مراد عموماً یہی لیا جاتا

حفاظت وتدوین حدیث

دوسری صدی کے نصف سے پانچویں صدی ہجری تک

یہ زمانہ تدوین اور حفاظت حدیث کا سب سے زیادہ اہم ترین زمانہ ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں حدیث کی سب سے زیادہ اہم کتابیں تالیف ہوئیں۔ تنقید رواۃ کے اصول طے ہوئے۔ جرح وتعدیل کے اسباب مقرر کیے گئے اور اب تک جس طرح متن حدیث کو یاد رکھنے، پرکھنے اور اس کو سمجھنے کا اہتمام کیا جاتا تھا اس کے ساتھ اسانید کو محفوظ رکھنے اور ان کی صحت وسقم کی تحقیق وتشویش کا بھی اہتمام ہونے لگا اور علم اسماء الرجال کے نام سے ایک مستقل علم کی بنیاد پڑی۔

تاریخ کا یہی وہ نازک دور ہے جس میں محدثین کرام نے دشمنان دین اور مخالفین رسول کی جانب سے جھوٹی وضع کی گئی حدیثوں کے سیلاب میں سچ اور جھوٹ کو الگ الگ کیا۔ یہ کام نہایت مشکل ہی نہیں بلکہ تکلیف دہ اور صبر آزما بھی تھا۔ اس غرض سے اس دور میں فن حدیث و اسناد ایجاد کیا گیا۔ اسی وجہ سے روایت کے ساتھ روایت کے اصول متعین کیے گئے۔

دوسری صدی ہجری کے ختم پر بعض ائمہ کو یہ خیال ہوا کہ آنحضرت ﷺ کی احادیث کو اقوال صحابہ اور فتاویٰ تابعین سے الگ کر کے علیحدہ علیحدہ مجموعہ میں محفوظ کر دینا چاہیے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر متعدد علما نے مسانید لکھیں جن میں مشہور عبداللہ موسیٰ العبسی الکوفی، مسدد بن مسرحد البصری، اسد بن موسیٰ الاموی اور نعیم بن حماد الخزاعی کی مسانید ہیں۔ ان کے نقشِ قدم پر دوسرے علمائے کرام بھی چلے اور انہوں نے بھی مسانید لکھیں۔ اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ اور عثمان بن شیبہ کے اسمائے گرامی زیادہ نمایاں ہیں۔

سب سے پہلے حدیث کے جو مجموعے مرتب کیے گئے ان کی ترتیب ابواب فقہ کے مطابق رکھی گئی مثلاً کتاب الطہارۃ لکھ کر ایک عنوان مقرر کر دیا گیا پھر طہارت سے متعلق جتنی احادیث

تھیں ان سب کو اس باب میں یکجا کر دیا گیا۔ اس کے برخلاف بعض علما نے حدیث کی تدوین رواۃ کے ناموں سے کی۔ مثلاً ابوہریرہؓ سے جتنی روائتیں منقول ہیں وہ طہارت سے متعلق ہوں یا صوم سے متعلق ہوں سب کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ پہلی قسم کی کتب حدیث کو علما فن کی اصطلاح میں کتاب السنن اور دوسری قسم کی کتب کو مسند کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض علما تھے جنہوں نے احادیث کو سنن اور مسانید دونوں کے طریقوں پر جمع کیا ان علما میں ابوبکر بن ابی شیبہ کا نام زیادہ مشہور ہے۔

پچاس سال کی مدت میں جو کتابیں لکھی گئی وہ سب مرتبہ کے لحاظ سے برابر نہیں ہوسکتیں تھیں کیونکہ بعض جامعین حدیث کو ایسے مواقع میسر تھے کہ وہ صحت کے متعلق خوب جانچ پڑتال کر سکتے تھے پھر ان کا جو سلسلہ اسناد تھا وہ سب سے زیادہ قوی اور معتبر تھا۔ ان کے برخلاف دوسرے علما وہ تھے جنہوں نے کچھ زیادہ تنقید سے کام نہیں لیا اور صحیح و سقیم میں فرق کیے بغیر احادیث قلم بند کر دیں۔

تیسری صدی ہجری کا زمانہ تدوین حدیث کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم ہے کیوں کہ اس زمانہ میں حدیث کی سب سے زیادہ اہم کتابیں تالیف ہوئیں، تنقید رواۃ کے اصول متعین ہوئے اور اب تک جس طرح متن حدیث کے یاد کرنے، پرکھنے اور اس کو سمجھنے کا اہتمام کیا جاتا تھا اس کے ساتھ اسانید کو محفوظ رکھنے اور ان کی صحت و سقم کی تحقیق و تشویش کا بھی اہتمام ہونے لگا اور علم اسماالرجال کے نام سے ایک مستقل علم کی بنیاد پڑی۔ (۱۲۷)

صحابہ کرام کے عہد میں کسی روایت کی توثیق کا قاعدہ یہ تھا کہ راوی سے شہادت طلب کی جاتی تھی۔ تابعین کے عہد میں صرف شہادت کافی نہیں ہوسکتی تھی اس لیے اسناد کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ یعنی جب کوئی راوی روایت بیان کرتا تھا تو اسے بتانا پڑتا تھا کہ اس نے روایت کہاں سے سنی اور پھر آگے اس نے کس سے سنی تھی یہاں تک کہ وہ سلسلہ صحابی تک جا پہنچتا تھا۔

تاہم معلوم ہوتا ہے کہ تابعین کے دور اوّلین میں اسناد کا عام طور پر اہتمام نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن جب طرح طرح کے فرقے پیدا ہو گئے اور بعض شریر النفس لوگوں نے اپنے عقائد باطلہ کو ثابت کرنے کے لیے احادیث وضع کرنی شروع کر دیں تو سند حدیث کی روایت کے لیے یہ ایک

لازی شرط قرار دے دی گئی۔ اس علم الاسناد الحدیث کی وجہ سے راویان حدیث کے حالات وسوانح کی چھان بین کی گئی۔ ان کے اخلاق واعمال کے ایک ایک گوشہ کی بکمال احتیاط تحقیق وتفتیش کی گئی۔ محدثین نے اس کٹھن راہ میں بے حد انتہائی جفاکشی، دیانت داری اور صلاح وتقویٰ کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے جرح وتعدیل کا جو معیار مقرر کیا تھا اس پر بادشاہوں سے لے کر بڑے بڑے ائمہ مذہب کو بھی پرکھا گیا اور اس راہ میں نہ ان کو کوئی دنیاوی طاقت وحشمت مرعوب کر سکتی تھی اور نہ وہ کسی کی مذہبی قیادت وپیشوائی سے خوفزدہ ہوتے تھے۔ جس شخص میں کوئی ذرا سا نقص بھی دیکھا اس کو برملا اور علی الاعلان کہا کہ لوگ اس کی روائتیں قبول کرنے میں احتیاط برتیں۔

فن حدیث کے انہی معیارات پر اس دور میں حدیث کی چھ مستند ترین کتابیں مدوّن ہوئیں جن کو ہم صحاح ستہ کہتے ہیں۔ جن کا تذکرہ ہم اگلے صفحات پر پائیں گے۔

ا۔ الصحیح البخاری

مؤلف: امام بخاری

امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل ابن المغیرہ بن بردزبہ البخاری فارسی الاصل جلیل القدر اور نامور محدث تھے۔ آپ کا خاندان یمان الجعفی کے ہاتھ پر ایمان لایا تھا چنانچہ اسی نسبت سے امام بخاری بھی جعفی کہلائے ورنہ جعفی خاندان سے بذات خود ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

پیدائش اور وفات

۱۹۶

۱۳ شوال ۱۹۴ ہجری کو نماز جمعہ کے بعد علوم نبوت کا یہ آفتاب بخارا سے طلوع ہوا اور یکم

256

شوال ۲۵۶ ہجری جمعہ و ہفتہ کی درمیانی شب کو تیرہ دن کم باسٹھ سال کی عمر میں یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔ تدفین عیدالفطر کے دن ہوئی۔

ابتدائی حالات:

والد اسماعیل بن ابراہم حدیث کے ثقہ راوی تھے جو کہ بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔

والدہ کی زیر نگرانی تربیت پائی۔ ایک بہن تھی اور ایک بھائی جس کا نام احمد تھا۔

بینائی کا جانا اور آنا

امام بخاری دنیا میں آ کر ابھی اچھی طرح آنکھیں کھولنے بھی نہ پائے تھے کہ آنکھوں کی بینائی زائل ہو گئی اس پر والدہ کو سخت صدمہ ہوا۔ بارگاہِ ایزدی میں روئیں، عجز و انکسار کے ساتھ ہاتھ پھیلا کر اللہ کے حضور دعائیں مانگیں۔ آخر ماں کی دعا تھی قبولیت کا در وا ہو گیا اور خواب میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے ان کی بے چین و مضطرب والدہ کو بشارت دی کہ جا تیری دعا قبول ہو گئی اور تیرے نورِ نظر کو پھر سے نور بصارت عطا کر دیا گیا ہے۔ صبح اٹھ کر دیکھتی ہیں کہ بیٹے کی آنکھوں کی بینائی لوٹ آئی۔ (۱۲۸)

قوت حافظہ اور تعلق حدیث

خطیب بغدادی نے امام بخاری کے تعلق حدیث اور قوت حافظہ کے حالات خود ان کی زبانی اس طرح نقل کیے ہیں کہ مجھے بچپن ہی سے اللہ تعالیٰ نے حفظِ حدیث کے لیے بنایا تھا۔ میری عمر ابھی دس سال کی تھی کہ میں محدثِ عصر داخلی کے حلقہ درس میں شریک ہو گیا۔ ایک دن ان کی زبان سے یہ سند نکلی "سفیان عن ابی الذبیر عن ابراہیم"۔ میں نے فوراً ٹوکا اور عرض کیا کہ ابوالزبیر تو ابراہیم سے روایت نہیں کرتے تھے۔ داخلی نے مجھے جھڑک دیا۔ میں نے پھر گزارش کی کہ ذرا اپنی اصل کتاب سے مراجعت کیجیے۔ انہوں نے جا کر اصل کتاب دیکھی اور واپس آ کر مجھ سے کہا بیٹے ذرا تم یہ سند بتاؤ کس طرح ہے؟ میں نے کہا ابراہیم سے روایت کرنے والے زبیر ہیں اور یہ عدی کے فرزند ہیں ابوالزبیر نہیں۔ داخلی نے اسی وقت قلم اٹھا کر اپنے نسخہ کی اصلاح کر لی اور فرمایا جو تم نے کہا وہ درست ہے۔ اس واقعہ کے وقت ان کی عمر صرف گیارہ برس تھی۔ جب عمر سولہ سال کی ہو گئی تو انہوں نے عبداللہ بن المبارک اور وکیع کی جمع کی ہوئی حدیثیں یاد کر لی تھیں اور اٹھارہ سال کی عمر میں ایک تصنیف صحابہ و تابعین کے فیصلے اور ان کے مختلف اقوال کے بارے میں مرتب کرنا شروع کر دی تھی۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے روضۂ مبارک کے قریب چاندنی راتوں میں

کتاب التاریخ مرتب کی۔

عاشہ بن اسماعیل بیان کرتے ہیں کہ بخارا کے مشائخ کی خدمت میں امام بخاری بھی ہمارے ساتھ جایا کرتے تھے۔ اس وقت یہ بہت نوعمر تھے مگر یہ کچھ لکھا نہیں کرتے تھے۔ ہم ان کو بہت ملامت کرتے کہ جب تم کچھ لکھتے ہی نہیں ہو تو خواہ مخواہ درس میں کیوں شریک ہوتے ہو۔ سولہ دن کے بعد انہوں نے تنگ آکر فرمایا کہ تمہاری ملامت کی حد ہوگئی ہے، اچھا اب لاؤ دکھاؤ تم نے کیا لکھا ہے۔ ہم اس وقت تک پندرہ ہزار حدیثیں لکھ چکے تھے وہ سامنے رکھ دیں۔ امام بخاری نے وہ تمام حدیثیں برزبان اس طرح فرفر سنا دیں کہ ہمیں ان کی یاد داشت سے اپنے نسخوں کی تصحیح کرنا پڑی۔

امام بخاری کی اس خداداد ذکاوت اور حفظ کا ہر طرف شہرہ ہو چکا تھا۔ جہاں جاتے آپ سے فیض حاصل کرنے کے لیے مجالس منعقد ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ بصرہ میں تشریف لے گئے۔ ہزاروں فقہاء اور محدثین جمع ہوگئے اور تشنگان علم نے فوراً مجلسِ استفادہ آراستہ کرنے کا بندوبست کر لیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ بڑے بڑے محدثین نے ان کے سامنے ایسی عمر میں زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا کہ جب ابھی قرطاس زندگی پر آثار شباب کا ایک خط بھی نمودار نہیں ہوا تھا۔

دارمی جو عمر میں امام بخاری سے بڑے تھے اور جن کے امام بخاری خود بھی معتقد تھے فرمایا کرتے تھے کہ ہم سب میں بڑے عالم، سب میں بڑے فقیہہ اور علم کے لیے سب سے زیادہ جفاکش امام بخاری ہیں۔ ایک مرتبہ ایک حدیث کے متعلق ان سے پوچھا گیا اور یہ بتا دیا گیا کہ امام بخاری اس کو صحیح فرماتے تھے تو دارمی نے بے ساختہ یہ الفاظ کہے۔

> ''بخاری فن حدیث میں مجھ سے کہیں زیادہ بصیرت رکھتے ہیں۔ خدا کی مخلوق میں وہ بہت بڑے عقل مند ہیں اور امر و نواہی کو خوب سمجھنے والے ہیں''۔

محمد بن ابی حاتم وراق بخاری اور محمد بن یوسف فربری اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ امام بخاری ایک رات میں پندرہ پندرہ اور بیس بیس مرتبہ اٹھ کر چراغ روشن کر [illegible]

مطالعہ کرتے اور پھر سو جاتے تھے۔ (۱۲۹)

امام صاحب خود فرماتے تھے کہ مجھے ایک سے دو لاکھ احادیث زبانی یاد ہیں اور اپنی کتاب الصحیح کو میں نے چھ لاکھ احادیث سے منتخب کیا ہے۔ امام صاحب کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے کہ آپ جس وقت بغداد تشریف لائے تو وہاں کے محدثین نے آپ کا امتحان لینا چاہا۔ چنانچہ ۱۰۰ احادیث کے متن اور سندوں میں الٹ پھیر کر کے دس آدمیوں کے ذمہ لگایا کہ ہر کوئی دس دس حدیثیں امام صاحب کے سامنے پیش کرے۔ شہر کے بہت سے لوگ اس منظر کو دیکھنے کے لیے جمع ہوئے۔ ہر محدث طے شدہ فارمولے کے تحت حدیثیں پیش کرتا۔ امام صاحب لا ادری فرماتے رہے۔ جب سب لوگ حدیثیں پیش کر چکے تو امام صاحب نے ہر متن کو اس کی اصلی سند اور ہر سند کو اس کے اصل متن کے ساتھ ملحق کر کے ترتیب وار سنا دیا، لوگ سن کر دنگ رہ گئے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ لوگوں نے جس ترتیب سے روایات کو غلط شکل میں پیش کیا تھا، امام صاحب نے اس کو بھی بیان کر دیا۔ (۱۳۰)

زہد و تقویٰ

علامہ کرمانی کہتے ہیں کہ امام صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دنیا بھر کی دولت عطا فرمائی تھی۔ انہوں نے اپنے والد سے بھی ترکہ میں بہت سا مال پایا تھا، لیکن وہ سارا سال اللہ کی راہ میں خرچ فرماتے رہتے تھے اور بسا اوقات آپ کو دو تین باداموں پر ہی دن بھر گزارا کرنا پڑتا تھا۔ امام صاحب نے کسی امیر آدمی کی فیاضی سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ حالانکہ بارہا اس کے مواقع بھی آئے۔ امام موصوف ایک مرتبہ بیمار ہوئے تو ان کا قارورہ اطبا کو دکھایا گیا۔ انہوں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری سالن استعمال نہیں کرتے۔ امام صاحب کہنے لگے چالیس سال سے سالن استعمال کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ نماز میں استغراق کا یہ حال تھا کہ ایک بار ظہر کی نماز سے فراغت کے بعد نوافل میں مشغول ہو گئے۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد اپنی قمیض کا دامن اٹھا کر ساتھیوں سے کہنے لگے دیکھو میری قمیص کے اندر کچھ ہے تو نہیں۔ ساتھیوں نے قمیض اوپر کی تو اندر

ایک بھڑ تھی اور اس کے ڈنگ کے سترہ نشان تھے اور جسم کا وہ حصہ ورم زدہ ہو گیا تھا۔ ایک ساتھی نے کہا آپ نے نماز توڑ کیوں نہیں دی؟ فرمایا قرآن پڑھ رہا تھا دل چاہتا تھا سورۃ ختم ہی کر ں۔ (۱۳۱)

عمر بن حفص اشتر کہتے ہیں کہ بصرہ میں ہم اور امام بخاری اکٹھے تحصیل علم کرتے تھے۔ ایک دن امام بخاری درس میں نہ آئے۔ ہم نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ان کے پاس تن پوشی کے لیے کپڑے تک نہیں ہیں۔ اس پر ہم نے ان کو کپڑے مہیا کیے اور پھر امام بخاری درس میں آنے لگے۔ (۱۳۲)

امام بخاری کا مسلک

امام صاحب کے مسلک کے بارے میں علما کا اختلاف ہے۔ کبار محدثین کے ساتھ ہمیشہ ے یہ معاملہ رہا ہے کہ مختلف مسلک والوں نے ان کو اپنے اپنے مسلک کے پیرو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی معاملہ امام بخاری کے ساتھ بھی ہوا۔ حافظ ابن حجر کے نزدیک امام بخاری کی باحث فقہہ کا غالب حصہ امام شافعی کے مسلک سے ماخوذ ہے۔ علامہ ابن قیم نے امام صاحب کو نی تحقیق میں حنبلی ثابت کیا ہے۔ علامہ طاہر جزائری کی نظر میں امام بخاری مجتہد مطلق ہیں اور ان کی مع الصحیح کے مطالعہ سے بھی، جیسا کہ علامہ انور شاہ فرماتے ہیں، واضح ہوتا ہے کہ آپ بلا شک وشبہ تہد مطلق تھے اور یہ شہرت کہ آپ شافعی تھے یا آپ نے مسائل مشہورہ میں امام شافعی کے مسلک کی روی کی ہے صحیح نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ کی موافقت بھی امام شافعی سے کم نہیں ہے۔ (۱۳۳)

جامع الصحیح بخاری

جہ تسمیہ

اس کتاب کا پورا نام ''الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ ﷺ وسنتہ وأیامہ'' ہے۔ اس ام میں موجود ہر لفظ کی وضاحت درج ذیل ہے:

لجامع: جس مجموعہ حدیث میں فن حدیث کے آٹھوں ابواب ہوں اس کو جامع کہتے ہیں اور اس

میں سب ابواب موجود ہیں۔

الصحیح: جس مجموعہ حدیث میں سب حدیثیں صحیح ہوں، اسے الصحیح کہتے ہیں۔ اس لفظ سے امام بخاری کا مجموعہ حدیث الصحیح ہے۔ تاہم اگر کوئی معلل یا شاذ روایت آ گئی تو اس کا ضمناً ذکر ہے۔

المسند: یہ لفظ بطور تاکید کے ہے۔

سننہ: یعنی یہ مجموعہ حدیث آپ ﷺ کے اقوال واحوال پر مشتمل ہے۔

أیامہ: امام بخاری نے اس مجموعے میں دورِ جاہلیت کے بعض ایسے واقعات کا بھی ذکر کیا ہے جن سے آپ ﷺ کی زندگی کا تعلق ہے۔ (۱۳۴)

وجہ تالیف

امام بخاری کے عہد تک حدیث کے بہت سے مجموعے تیار ہو چکے تھے۔ جب آپ نے اپنے پیش رو محدثین کے مجموعوں کو پڑھا اور روایت کیا تو محسوس کیا کہ ان کتابوں میں صحیح، حسن اور ضعیف سب قسم کی احادیث موجود ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک ایسی کتاب جمع کرنے کا ارادہ کیا جس میں سب حدیثیں صحیح ہوں۔ یہ ارادہ اور بھی قوی ہو گیا جب آپ کے شیخ الحدیث اسحٰق بن راہویہ کی زبان سے بھی اپنے لیے یہ ہدایت سنی کہ تم احادیث کی ایک ایسی مختصر کتاب جمع کرو جس میں رسول اللہ ﷺ کی صرف صحیح حدیثیں ہوں۔ یہ بات امام بخاری کے دل میں گھر کر گئی۔ اس عزم صمیم کو اور تقویت یوں مل گئی کہ جب امام بخاری نے خواب میں دیکھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے حضور میں کھڑے ہیں اور ہاتھ میں پنکھا لیے آپ ﷺ کے اوپر سے مکھیاں اڑا رہے ہیں۔ معبرین نے اس خواب کی یہ تعبیر بتائی کہ تم نبی کریم ﷺ سے منسوب جھوٹی حدیثوں کو مکھیوں کی طرح ہٹا دو گے اور ان کو رد کر دو گے۔ اس خواب نے امام بخاری کے شوقِ حدیث کو تیز تر کر دیا اور وہ الجامع الصحیح کی تالیف و تدوین میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔

عزم کے بعد عمل

اس کے بعد امام بخاری نے سفر و حضر میں ہر جگہ برابر اپنی کتاب الجامع الصحیح کی تالیف کا

کام جاری رکھا۔ البتہ تراجم ابواب کی ترتیب وتہذیب، ہر باب کے تحت احادیث کے اندراج کا کام ایک مرتبہ تو حرم پاک میں سرانجام دیا اور دوسری مرتبہ مسجد نبوی میں منبر ومحراب کے درمیان، اور یہ وہ جگہ ہے جسے روضۃ من ریاض الجنۃ (جنت کے باغات کا ایک حصہ) کہتے ہیں۔ سولہ برس کی مسلسل محنت کے بعد جو کتاب تیار کی اس میں صرف صحیح احادیث درج کیں اور امام احمد بن حنبل علی بن مدینی اور یحییٰ بن معین جیسے مشہور ومسلم شیوخِ حدیث کے سامنے پیش کیں۔ سب نے بنظر استحسان دیکھا اور کتاب کی صحت کی گواہی دی۔ امام بخاری کی اس الصحیح کو ہر طرف سے مقامِ قبول حاصل ہوا۔ نوے ہزار آدمیوں نے امام بخاری سے اس کتاب کو سنا۔

ترتیب وتزئین

صحیح بخاری میں فقہی قواعد وفوائد اور حکیمانہ نکات بکثرت موجود ہیں۔ امام بخاری صرف صحیح حدیث ہی بیان نہیں کرتے بلکہ بقول امام نووی ان کا مقصد احادیث سے استنباطِ مسائل ہے۔ وہ ان سے قائم کردہ ابواب کی تائید وتشریح کا کام لیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ایک متن حدیث سے کئی مطالب اور مسائل نکال کر کتاب کے مختلف ابواب میں ان کو جدا جدا کر دیتے ہیں اور ان آیات پر بھی توجہ دیتے ہیں جو احکام بیان کرتی ہیں۔ چونکہ استخراجِ مسائلِ فقہ امام بخاری کا اہم مقصد ہے اس لیے بہت سے ابواب میں صرف ''فیہ عن فلاں'' سے اس حدیث کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں جو پہلے گزر چکی ہے۔ کبھی کسی باب کے تحت متن حدیث مذکور ہے لیکن اسناد محذوف اور کبھی معلق بیان کرتے ہیں کیوں کہ ان کی غرض تو ابواب کے مقصود مسائل پر دلیل قائم کرنا ہے۔

بعض ابواب میں بہت سی صحیح مندرج ہیں اور بعض میں صرف ایک ہی حدیث۔ بعض میں آیت قرآن مجید اور بعض میں کچھ بھی نہیں ہے۔ امام بخاری نے یہ اسلوب قصداً اختیار کیا ہے اور مقصد یہ ہے کہ اس باب میں کوئی بھی حدیث بخاری کی شرط پر نہیں ملی۔

شرائط قبولیت حدیث

امام بخاری ایسی صحیح احادیث بیان کرتے ہیں جس کو ثقہ راوی نے ثقہ راوی سے روایت کیا

ہو اور اس کا سلسلہ مشہور صحابی تک پہنچایا ہو اور قابل اعتماد ممتاز ثقہ راویان حدیث اس حدیث میں اختلاف نہ کرتے ہوں اس کا اسناد متصل ہو اور غیر مقطوع۔ اگر صحابی سے دو شخص راوی ہوں تو بہتر ورنہ ایک ہی معتبر (ثقہ، عادل اور ضابطہ) راوی کافی ہے۔ امام بخاری نے حدیث صحیح کے ضمن میں اتصال سند اور اتقان رجال اور عدم علل کا بڑا خیال رکھا ہے۔ (۱۳۵)

امام صاحب نے اپنی اس الصحیح میں چھ لاکھ حدیثوں کو اپنی کڑی شرائط کی چھلنی میں چھان کران کا عرق پیش کیا ہے۔ آپ نے اس محنت میں صرف ذکاوت و حفظ ہی کا زور خرچ نہیں کیا بلکہ خلوص نیت، تقویٰ، طہارت کے آخری مراحل بھی ختم کر ڈالے، یعنی جب کوئی حدیث لکھنے کا ارادہ کرتے تو پہلے غسل فرماتے، دو رکعت نماز نفل ادا کرتے پھر کہیں کتاب میں ایک حدیث درج کرتے اسی طرح فقہی و حدیثی استنباطات کے لیے تراجم وابواب قائم کرتے وقت بھی یہی عمل کرتے۔

خصوصیات بخاری

- ☆ امام بخاری کو دوران تالیف جب کبھی تالیف کا سلسلہ چھوڑنا پڑا تو دوبارہ ابتدا بسم اللہ سے کی ہے۔ اس لیے درمیان میں متعدد جگہوں پر بسم اللہ مذکور ہے۔
- ☆ امام بخاری کا معمول تھا کہ جب حدیث میں کوئی ایسا غریب لفظ آ جاتا ہے جس کی نظیر کتاب اللہ میں موجود ہے تو اس کی وضاحت میں مفسرین کے اقوال نقل کر دیتے۔ اس طرح کبھی بات کی مناسبت سے آیات قرآنی کی طرف اشارہ فرماتے ہیں اور اکثر آیات کی بجائے اس کے صرف چند اقوال نقل کر دیتے ہیں۔ کتاب التفسیر اور کتاب بدالخلق میں بکثرت اس کی مثالیں ہیں۔
- ☆ محدثین کے نزدیک سند عالی کی بڑی خصوصیت رہی ہے۔ بخاری کا یہ خاص امتیاز ہے کہ اس میں بائیس روایات ثلاثی ہیں جن کا تذکرہ حاشیہ پر نہایت جلی قلم سے کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض ثلاثیات کے شیوخ حنفی ہیں۔

۴ ☆ کتاب میں امام بخاری کا ایک خاص طریق استنباط ہے اس لیے ایک ہی حدیث کو استنباط مسائل یا کسی دوسرے مقصد کے لیے متعدد مقامات پر بیان کرتے ہیں مثلاً ''انما الاعمال بالنیات'' والی روایت کا تیرہ مقام پر ذکر کیا گیا ہے۔ حالانکہ امام موصوف نے خود فرمایا ہے کہ میں مکرّر روایات کو اس کتاب کے اندر داخل نہیں کروں گا۔ حافظ ابن حجر نے اس کی توجیہہ کی ہے کہ وہ بالارادہ اپنی کتاب میں ایک ہی سند و متن کو مکرر نہیں لاتے۔ اگر کہیں تکرار ہے تو محض اتفاقی ہے۔ پوری کتاب میں بعض باتیں روایات مکرر ہیں جو اتنی ضخیم کتاب کے لیے زیادہ نہیں کہی جاسکتیں۔

۵ ☆ الصحیح بخاری میں تاریخ پر بھی امام بخاری کی مجتہدانہ نظر ہے۔ آپ ہر کتاب کے شروع میں اس کے زمانۂ نزول اور مشروعیت کی ابتدا کی طرف بھی کبھی کبھی اشارہ کر دیتے ہیں خصوصاً جب کہ اس میں کوئی اختلاف ہو اور کبھی صراحت بھی کر دیتے ہیں۔

۶ ☆ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام موصوف ہر کتاب کے آخر میں کوئی نہ کوئی ایسا لفظ لاتے ہیں جس سے کتاب کے ختم کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

۷ ☆ کتاب کی ابتدا اور انتہا میں گہرا ربط ہے۔ حافظ ابن حجر اپنے استاد کا قول نقل کرتے ہیں کہ امام بخاری نے اپنی کتاب کو کتاب التوحید پر ختم کیا کیونکہ توحید ہی آخرت میں کامیابی کی ضمانت ہے اور اس عقیدے میں بگاڑ آخرت میں تباہی کا باعث ہے۔ کتاب کی ابتدا انما الاعمال بالنیات کی حدیث سے فرمائی کیونکہ اعمال کی عنداللہ مقبولیت کے لیے اخلاص نیت ضروری ہے اور آخرت میں صرف وہی اعمال وزنی ہوں گے جو اخلاص کے ساتھ رضائے الٰہی کے لیے کیے جائیں۔

۸ ☆ علما کا یہ مشہور مقولہ ہے کہ فقہ البخاری فی تراجمہ یعنی بخاری کا سارا کمال ان کے تراجم میں ہے: علامہ کرمانی لکھتے ہیں امام صاحب نے اپنے تراجم ابواب میں جس دقت نظر کا مظاہرہ فرمایا ہے اس کو سمجھنے سے بڑے بڑے اہل علم قاصر رہے۔ اس کی اسی اہمیت کی بنا پر متقدمین و متاخرین نے تراجم ابواب پر مستقل رسالے لکھے ہیں۔

٩ ☆ شاہ عبدالعزیزؒ لکھتے ہیں ایک دفعہ محمد بن مروزی مکہ معظمہ میں مقام ابراہیم اور حجر اسود کے مابین سوئے ہوئے تھے۔ آپ نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کو فرماتے دیکھا ''ابوزید کتاب شافعی کا درس کب تک دو گے ہماری کتاب کا درس کیوں نہیں دیتے''۔ محمد بن احمد مروزی نے حیران ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ پر میری جان قربان ہو آپ کی کتاب کون سی ہے؟ فرمایا جامع محمد بن اسماعیل۔

١٠ ☆ الصحیح بخاری کی سعادت ومقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۹۰ ہزار افراد نے اس کتاب کو بلا واسطہ امام بخاری سے سنا۔

١١ ☆ اس کتاب کی شان وعظمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ علمائے امت نے صحیح بخاری کو ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ'' یعنی قرآن مجید کے بعد شریعت اسلامیہ میں صحیح ترین کتاب کا معزز لقب عطا کیا ہے۔

شروح وحواشی بخاری

صحیح بخاری کی قبولیت واہمیت کا اندازہ اس کی شروح، تعلیقات اور حواشی کی کثرت سے با آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ اس مجموعہ حدیث کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ہر دور کے علما اپنی اپنی مساعی جمیلہ کو بروئے کار لاتے رہے ہیں۔ کسی نے مختصر شرح لکھی اور کسی نے مطول ومفصل، کسی نے رجال پر بحث کی اور کسی نے تراجم ابواب پر، کسی نے اس کی تجرید کی اور کسی نے انتخاب واختصار، کسی نے اس کی تعلیقات کو موصول کیا اور کسی نے مشکل وغریب الفاظ کی لغات لکھیں۔ تیسری صدی ہجری سے لے کر آج تک صحیح بخاری پر علما کی بھرپور توجہ مرکوز رہی۔ مختلف علما کی طرف سے دو سو سے زائد بخاری کی شروح وحواشی لکھے گئے۔

ابن خلدون کی تمنا تھی کہ صحیح بخاری کی ایک ایسی ہی عمدہ شرح لکھی جائے جس میں اس کا پورا حق ادا کیا جائے۔ کیونکہ اس نے اپنے اکثر اساتذہ سے سن رکھا تھا کہ ایسی شرح بخاری اُمت کے ذمہ قرض ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کی شرح فتح الباری کے بعد یہ قرض ادا ہو گیا کیونکہ علمائے

حدیث نے اس شرح کو بہترین قرار دیا ہے۔

مختلف زمانوں میں صحیح بخاری کے ترجمے بھی شائع ہوئے۔ اردو تراجم اور شروح میں مولوی وحید الزمان کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جس نے مکمل ترجمہ شائع کرنے کے علاوہ ایک ضخیم شرح تسہیل القاری کے نام سے شروع کی لیکن صرف پانچ جلدیں شائع ہو سکیں۔

عصر حاضر میں بھی صحیح بخاری کے کئی اختصارات شائع ہو چکے ہیں جن میں عمر ضیاء الدین کی زبدۃ البخاری، (القاہرہ۔ ۱۳۳۰ ہجری) اور محمد مصطفیٰ عمارہ کی جواہر البخاری (القاہرہ ۱۳۴۹ ہجری) قابل ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر اس میں سات سو منتخب احادیث مع مختصر شرح درج ہیں۔ نیز عبد السلام محمد ہارون کی الالف المختارہ من صحیح البخاری (قاہرہ ۱۹۰۹ تا ۱۹۶۰ عیسوی) دس مختصر اجزاء میں مع مختصر شرح و تخریجاب بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

عہد مما لکیت میں

عہد مما لکیت میں صحیح بخاری کی قرأت اور ختم کو خاص اہمیت دی جانے لگی۔ دسویں صدی ہجری کے آغاز میں ماہ رمضان میں قاہرہ کی عام محفلوں میں بخاری شریف پڑھی جاتی اور ختم بخاری پر بڑا اجتماع ہوتا تھا۔ اس صدی کے آخر میں شہر زبید میں یہی رسم مروج تھی۔ الجزائر میں لوگ صحیح بخاری کی قسمیں کھایا کرتے تھے اور جھوٹی قسم کھانے والے کے لیے عذاب اور ہلاکت یقینی ہوتی تھی۔ المعید میں صحیح بخاری کو باعث شفا سمجھا جاتا تھا۔ مغرب میں ایک فوجی جماعت "البخاریہ" کہلاتی تھی اور اس جماعت کے سپاہی فوجی خدمات کے لیے صحیح بخاری پر حلف اٹھاتے تھے۔

کچھ مزید شروح بخاری

☆ عمدۃ القاری:

عمدۃ القاری علامہ بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد العینی الحنفی المتوفی ۸۵۵ کی تصنیف ہے۔ مصنف نے ۸۲۱ ہجری سے اس کی ابتدا کی اور ۸۴۷ ہجری میں یہ شرح مکمل ہوئی۔ علامہ عینی نے اس ضمن میں فتح الباری سے خوب استفادہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض ورق پورے کے پورے نقل کر دیے ہیں۔ علامہ عینی نے اپنی شرح میں حافظ ابن حجر پر تعقبات بھی کیے ہیں اور جن باتوں کو

انہوں نے بالقصد ترک کر دیا تھا ان کی تفصیل بھی دے دی ہے۔ مثلاً حدیث کے پورے متن کو نقل کر دیا ہے۔ رواۃ کے اسباب کی وضاحت کر دی ہے۔ ہر راوی کا ترجمہ دے دیا ہے۔ لغات و اعراب، معانی و بیان کی وضاحت کر دی ہے اور حدیث سے مسائل کا استنباط کیا ہے۔

☆ ارشاد الساری:

یہ شہاب احمد بن محمد الخطیب القسطلانی کی شرح ہے۔ اس میں شرح و متن مخلوط ہے لیکن متن کو سیاہی و سرخی کے ساتھ ممتاز کر دیا گیا ہے۔

☆ الکواکب الدّرادی:

یہ علامہ شمس الدین محمد بن یوسف بن علی کرمانی کی شرح ہے۔ مصنف نے اس میں نحوی اعراب اور غریب الفاظ کو پوری طرح حل کیا ہے۔

☆ شرح النووی:

علامہ نووی (المتوفی ۶۷۹ ہجری) نے بخاری کی صرف کتاب الایمان پر شرح لکھی تھی وہ اس کی تکمیل نہیں کر سکے۔

☆ ہدایۃ الباری:

یہ شیخ الاسلام زکریا الانصاری کی تصنیف ہے۔

☆ تیسر القاری:

یہ علامہ نور الحق بن مولانا عبدالحق دہلوی کی تصنیف ہے۔

☆ التوشیح علی الجامع الصحیح:

یہ حافظ جلال الدین سیوطی کی تصنیف ہے۔

☆ شواہد التوضیح والتصحیح لمشکلات الجامع الصحیح

یہ شیخ جمال الدین الشافعی کی تصنیف ہے۔

☆ عون الباری:

نواب صدیق حسن خان نے اس عنوان سے تجرید بخاری کی مختصر شرح لکھی ہے۔

☆ فیض الباری:

یہ علامہ سید انور شاہ کشمیری کے افادات ہیں جو ان کے شاگرد رشید مولانا بدر عالم میرٹھی ان کے درس کے وقت لکھتے تھے۔

☆ لامع الدّراری:

یہ مولانا رشید احمد گنگوہی کے دروس کے افادات ہیں جن کو مختلف تلامذہ نے جمع کیا تھا۔

چند اعتراضات اور ان کے جوابات

کہا جاتا ہے کہ امام بخاری چونکہ حنفیہ سے ناراض تھے اس لیے انہوں نے امام ابوحنیفہ سے کوئی روایت نقل نہیں کی۔ علامہ زیلعی لکھتے ہیں کہ امام بخاری نے شدت تعصب اور امام ابوحنیفہ کے مسلک پر بے جا تنقید کی وجہ سے ان کی کوئی روایت اپنی کتاب میں نقل نہ کی۔ اس طرح بعض الناس کے ذریعے امام صاحب پر تعارض کیا ہے اور ان پر حدیث کی مخالفت کا الزام لگایا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ امام بخاری اور دیگر ائمہ حدیث کے متعلق عناد و تعصب کا شبہ کرنا انتہائی نامناسب ہے۔ اکابر کی شان اس سے کہیں بلند تھی۔ علامہ کوثری نے اس سلسلے میں نہایت مناسب و معتدل رائے ظاہر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قابل غور امر یہ ہے کہ شیخین نے امام ابوحنیفہ سے کوئی روایت نقل نہیں، حالانکہ ان کے صغیر السن تلامذہ سے ان کی لقاء و روایت دونوں سے ثابت ہے۔ اسی طرح امام شافعی کے بعض تلامذہ سے بھی ان کی ملاقات ہوئی لیکن امام شافعی کی کوئی روایت اپنی کتاب میں درج نہیں کی۔ امام بخاری کو امام احمد سے زیادہ ملنے اور ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے باوجود ان سے صرف دو روایتیں اپنی کتاب میں نقل کی ہیں ایک تعلیقا اور دوسری ایک واسطے سے امام مسلم امام بخاری کے شاگرد ہیں اور انہوں نے اپنی کتاب میں ان سے پورا استفادہ کیا ہے۔ لیکن صحیح مسلم میں امام بخاری سے کسی روایت کی تخریج نہیں ہے۔ امام احمد، امام

شافعی کے تلمیذ رشید ہیں اور ان سے موطا امام مالک کا سماع بھی کیا ہے لیکن امام مالک کی کل پانچ روایات امام شافعی کے واسطے سے اپنی کتاب میں درج کی ہیں۔ ان واقعات اور ان محدثین کے اخلاص و دیانت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ائمہ مجتہدین کی احادیث کو روایت کرنے والے شرق و غرب چارسو پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس لیے ان محدثین کرام نے صرف ان راویوں کی روایات کی طرف توجہ مبذول فرمائی جس کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ یوں اس میں تعصب و عناد کی کوئی بات نہیں ہے۔ (۱۳۶)

صحیح بخاری کی چند روایات پر دارقطنی نے بھی کچھ تنقید کی ہے۔ ان کی تعداد ایک سو دس ہے۔ حافظ ابن حجر اور علامہ عینی وغیرہ نے اس کا مفصل جواب دیا ہے۔

بخاری کی تعداد روایات

علامہ نووی اور شیخ ابن صلح کے نزدیک تکرار کے ساتھ بخاری کی روایات کی تعداد ۷۲۷۵ ہے اور عدم تکرار کے ساتھ ۴۰۰۰۔ لیکن حافظ ابن حجر نے پوری احتیاط کے ساتھ شمار کیا تو روایات مرفوعہ کی تعداد ۷۳۹۷ اور تکرار کے ساتھ متابعات و تعلیقات کی تعداد ۱۳۴۱ ہے جن میں اکثر کو امام بخاری نے مسنداً بیان کر دیا ہے اور موقوفات صحابہ و مقطوعات تابعین کی تعداد ۳۴۱ ہے۔ اس طرح مجموعی تعداد ۹۴۰۷ ہے۔ غیر مکرر روایات مرفوعہ ۲۳۵۳ اور غیر مکرر و متابع و معلق ۱۶۰ ہیں۔ اس طرح غیر مکرر مجموعہ ۲۵۱۳ ہے۔ اس تعداد میں آثار صحابہ و تابعین جن کا تراجم ابواب میں تذکرہ ہے شامل نہیں ہیں۔

الصحیح المسلم

مؤلف: امام مسلم

نام مسلم بن حجاج بن داؤد بن کوشاد لقب عساکر الدین اور اور کنیت ابوالحسن ہے۔ مؤلد و مسکن کے لحاظ سے اگرچہ ان کے خمیر میں عجم کی خاک کا عنصر بھی شامل ہے لیکن دراصل ان کا سلسلۂ نسب عرب کے مشہور قبیلہ بنی قشیر سے ملتا ہے۔ اسی بنا پر انہیں قشیری کہا جاتا ہے۔ علامہ ذہبی کی تحقیق

میں امام مسلم ۲۰۴ ہجری میں خراسان کے مشہور شہر نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے سن پیدائش میں قدرے اختلاف ہے یعنی ۲۰۲ ہجری یا ۲۰۴ ہجری یا ۲۰۶ ہجری کے مختلف اقوال ہیں۔ آخری قول کو ابن الاثیر نے جامع الاصول کے مقدمہ میں راجح قرار دیا ہے اور ابن خلقان کی بھی یہی تحقیق ہے۔ البتہ وفات کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ آپ کا انتقال یکم شنبہ کی شام کو ہوا اور ۲۵ رجب ۲۶۱ ہجری میں دوشنبہ کے دن دفن ہوئے۔

حدیث سے تعلق و رغبت

امام مسلم نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو ہر جانب علم حدیث کا غلغلہ تھا۔ خوش قسمتی سے امام موصوف نیشاپور جیسے شہر میں پیدا ہوئے جسے اس زمانہ میں مرکزیت حاصل تھی۔ علامہ تاج الدین سبکی فرماتے ہیں کہ نیشاپور اس قدر بڑے اور عظیم الشان شہروں میں سے تھا کہ بغداد کے بعد اس کی نظیر نہیں تھی۔ علامہ ذہبی نے امام موصوف کے سماع حدیث کی ابتدا ۲۱۸ ہجری کو قرار دیا ہے۔ اس لیے اس حساب سے گویا چودہ سال کی عمر سے سماعت کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے۔

تحصیل حدیث کے لیے عراق، حجاز، شام و مصر جیسے مقامات پر بکثرت تشریف لے گئے۔ بغداد متعدد بار جانا ہوا۔ وہاں کے محدثین میں محمد بن مہران اور ابو غسان وغیرہ سے سماعت کی۔ عراق میں امام احمد بن حنبل اور عبداللہ بن سلمہ سے استفادہ کیا۔ حجاز میں سعید بن منصور اور ابو مصعب سے روایتیں حاصل کیں۔ مصر میں عمر بن سواد حرملہ بن یحیٰی کے خرمن فیض سے خوشہ چینی کی۔ احمد بن مسلمہ کی رفاقت میں بصرہ و بلخ کا بھی سفر کیا۔ امام بخاری سے نیشاپور میں بہت کچھ استفادہ کیا۔ ان بزرگوں کے علاوہ احمد بن یونس یربوعی و اسماعیل بن ابی اویس اور عون بن سلام وغیرہ سے بہت کچھ حاصل کیا۔

اعتراف عظمت

امام مسلم کے زمانہ میں سینکڑوں آئمہ فن پیدا ہو چکے تھے جس میں بہت سے شیوخ کو امام موصوف کے استاد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ تاہم امام صاحب کی فطری قابلیت اور قوت حافظہ

نے بڑے بڑے اسلاف محدثین کو اس قدر گرویدہ بنالیا تھا کہ اسحاق بن راہویہ جیسے امام فن نے پیش گوئی فرمائی تھی ای رجل یکون ھذا (خدا جانے یہ شخص کس بلا کا ہوگا)۔ امام ابوزرعہ و ابوحاتم جیسے بزرگ امام صاحب کو اپنے زمانہ کے تمام شیوخ پر ترجیح دیتے تھے۔ ابوقریش نے امام صاحب کو تمام دنیا کے حفاظ اربعہ میں شامل کیا ہے۔ ابوسلمہ جو امام صاحب کے رفیق درس تھے وہ آپ کے اس قدر گرویدہ تھے کہ پندرہ سال مسلسل آپ کے ساتھ صحیح مسلم کی ترتیب میں شریک رہے۔

زہد و تقویٰ

پوری زندگی نہ کسی کی غیبت کی اور نہ کسی کو برا بھلا کہا۔ اپنے اساتذہ و شیوخ کا ہمیشہ بے حد احترام کیا۔ نیشاپور کے سفر میں امام بخاری کی خدمت میں بکثرت حاضر ہوتے تھے۔ نیشاپور کے زمانۂ قیام میں جب امام بخاری پر خلق خدا کا ہجوم ہونے لگا تو حاسدین حسد کرنے لگے اور تو اور امام ذھلی تک امام بخاری کے خلاف ہو گئے۔ اس پر امام مسلم نے ذھلی سے اب تک جس قدر ذخیرۂ علوم حاصل کیا وہ ان کو واپس کر دیا۔ حالانکہ محمد بن یحییٰ ذھلی امام مسلم کے استاد تھے۔ امام مسلم نے بخاریؒ کی عقیدت و احترام میں اپنے استاد تک سے قطع تعلق کر لیا۔

امام مسلم کا مسلک

امام مسلم کے مسلک کی تعین میں بڑی دشواری ہے۔ مولانا انور شاہ فرماتے ہیں کہ امام مسلم اور ابن ماجہ کا مذہب معلوم نہیں ہے۔ چونکہ صحیح مسلم کے ابواب مؤلف نے بذات خود قائم نہیں کیے ہیں اس لیے ان کے مسلک کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا نواب صدیق حسن خان نے انہیں شافعی شمار کیا ہے۔

شیخ عبدالطیف سندی فرماتے ہیں کہ امام ترمذی اور امام مسلم کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دونوں امام شافعی کے مقلد ہیں حالانکہ یہ دونوں مجتہد تھے البتہ بہت سے مسائل میں ان سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے اجتہاد کی طرف حافظ ابن حجر نے بھی اشارہ کیا ہے۔ مولانا عبدالرشید صاحب کی تحقیق ہے کہ امام مسلم مالکی المذہب تھے مگر طبقات المالکیہ میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ صاحب کشف الظنون نے امام مسلم کو شافعی قرار دیا ہے۔

وفات کا حال

امام مسلم کی وفات کا واقعہ نہایت حیرت انگیز ہے۔ خصوصاً اس سے امام صاحب کی علمی شیفتگی وانہماک کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں مجلس درس میں ایک حدیث کے متعلق دریافت کیا گیا جو امام صاحب کو سوء اتفاق سے یاد نہ آئی اور پھر گھر واپس آئے تو انہیں ایک خرمے کی تھیلی پیش کی گئی۔ آپ اس حدیث کی تلاش وجستجو میں اس قدر محو ہوئے کہ آہستہ آہستہ تھیلی کے سب چھوہارے کھا گئے لیکن اس دوران حدیث بھی مل گئی۔ یہی امام صاحب کی موت کا سبب ہوا۔ اس وقت عمر ۵۵ سال تھی۔ لیکن علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ عمر تقریباً ۶۰ سال تھی کیونکہ مشہور قول کے مطابق آپ کا سن ولادت ۲۰۴ ہجری تھا۔ بہر حال امام صاحب نے ۲۵ رجب ۲۶۱ ہجری یک شنبہ کے دن وفات پائی۔ دوشنبہ کے روز جنازہ اٹھایا گیا اور نیشاپور کے باہر نصیر آباد میں دفن کیے گئے۔

تصانیف

صحیح مسلم کے علاوہ بھی امام مسلم کی بکثرت تصانیف ہیں مثلاً مسند کبیر، الاسما والکنی، جامع کبیر، کتاب العلل، کتاب التمیز، کتاب الوجدان، کتاب الاقران، کتاب سوالات لاحمد، کتاب حدیث عمرو بن شعیب، کتاب الانتقاع، کتاب مشائخ، کتاب اولاد صحابہ، اوہام المحدثین، کتاب الطبقات وغیرہ۔ لیکن ان تمام میں سب سے زیادہ مقبول اور معروف امام مسلم کی ''الجامع الصحیح'' ہے۔

الصحیح المسلم

غرض تصنیف

احادیث کے ذخیرہ میں سب سے پہلے امام بخاری نے احادیث صحیحہ مرفوعہ کو الگ منتخب فرمایا اور اپنی الجامع الصحیح کو تیار کیا۔ اس کو دیکھ کر امام مسلم کو بھی اسی عنوان سے ایک دوسرے انداز میں احادیث صحیحہ کو جمع کرنے کا شوق ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امام مسلم، امام بخاری کے شاگرد تھے اور ان سے بہت کچھ استفادہ کیا تھا۔

لیکن امام بخاری کے پیش نظر احادیث صحیحہ مرفوعہ کی تخریج اور فقہ و سیرت و تفسیر وغیرہ کا استنباط ہے۔ اس لیے انہوں نے موقوف و معلق، صحابہ و تابعین کے فتاوے وغیرہ بھی نقل کیے ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر احادیث کے متون و طرق کے ٹکڑوں کو اپنی کتاب میں شامل کر دیا ہے۔ جب کہ امام مسلم کا مقصد اور غرض و غایت صرف احادیث صحیحہ کو منتخب کرنا ہے۔ وہ استنباط وغیرہ سے تعرض نہیں کرتے بلکہ ہر حدیث کے مختلف طرق کو حسن ترتیب سے یک جا ہی بیان کرتے ہیں۔

تعداد روایات

امام مسلم کہتے ہیں کہ میں نے تین لاکھ احادیث میں سے اس مسند صحیح کا انتخاب کیا ہے۔ علامہ طاہر جزائری کے نزدیک مکررات کے حذف کے بعد صحیح مسلم کی تعداد روایات چار ہزار ہے۔ شیخ ابن صلاح کی تحقیق میں مکررات کے علاوہ بنیادی حدیثیں چار ہزار ہیں۔ علامہ عراقی فرماتے ہیں کہ اگر مکررات کا لحاظ کیا جائے تو صحیح مسلم کثرت طرق میں بخاری سے زائد ہے۔ چنانچہ احمد بن سلمہ جو امام موصوف کے ساتھ ترتیب میں شریک تھے، یہ تعداد بارہ ہزار اور ابو حفص میاں جی آٹھ ہزار بتاتے ہیں۔

اہتمام جمع حدیث

امام مسلم نے جمع حدیث میں نہ صرف یہ کہ اپنی ذاتی تحقیق پر اکتفا کیا بلکہ مزید احتیاط کے پیش نظر صرف وہی حدیثیں درج کی ہیں جن کی صحت پر مشائخ وقت کو اتفاق تھا۔ صحیح مسلم کے باب تشہد میں امام صاحب خود فرماتے ہیں کہ ہر وہ حدیث جو میرے نزدیک صحیح تھی اس کو میں نے یہاں درج نہیں کیا بلکہ میں نے یہاں صرف ان حدیثوں کو درج کیا ہے جن پر میرے شیوخ کا اتفاق ہے۔

شاہ عبدالعزیز بستان المحدثین میں لکھتے ہیں کہ صحیح مسلم میں خصوصیات کے ساتھ فن حدیث کے عجائبات بیان کیے گئے ہیں۔ امام مسلم نے یہ شرط رکھی ہے کہ وہ اپنی صحیح میں صرف وہ حدیث بیان کریں گے جس کو کم از کم دو ثقہ تابعین نے دو صحابیوں سے روایت کیا ہو اور یہی شرط

تمام طبقات تابعین و تبع تابعین میں ملحوظ رکھی ہے۔ یہاں تک کہ سلسلہ اسناد ان پر (یعنی مسلم پر) آ کر منتہی ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے راویوں کے اوصاف میں صرف عدالت کو ہی ملحوظ نہیں رکھا بلکہ شہادت کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ (۱۳۷)

خصوصیات مسلم شریف

امام نووی تحریر کرتے ہیں کہ امام مسلم نے حدیث میں بہت سی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جن میں سب سے زیادہ صحیح اور مشہور یہی کتاب ہے اور یہ کتاب متواتر امام مسلم سے مروی ہے۔ اس لیے اسے مسلم ہی کی کتاب کہنا صحیح اور درست ہے۔ امام مسلم نے ہر حدیث کا اس کے مناسب مقام پر ذکر کیا ہے اس کے تمام طریقوں کو اسی مقام پر بیان کیا ہے اور اس کے مختلف الفاظ کو ایک ہی جگہ پر کھول کر بتایا تا کہ ناظرین کو آسانی ہو اور طالب ان چیزوں سے متمتع ہو سکے۔

☆ شاہ عبدالعزیز نے امام حافظ عبدالرحمان بن علی شافعی کے چند اشعار جو مسلم کی تعریف میں کہے گئے ہیں بیان کیے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ ''اے پڑھنے والے صحیح مسلم علم کا دریا ہے۔ یہاں پانی بہتا نہیں بلکہ ایک ہی مقام پر موجود ہے''۔

☆ حافظ ابن صلاح لکھتے ہیں کہ مسلم کی شرط یہ ہے کہ حدیث متصل الاسناد ہو۔ اول سے لے کر آخر تک ایک ثقہ دوسرے ثقہ سے روایت نقل کرتا ہو اور اس میں کسی قسم کا شذوذ اور علت نہ ہو۔

☆ امام مسلم اپنی کتاب میں راویوں کے الفاظ کو بھی علیحدہ علیحدہ بیان کر دیتے ہیں کہ فلاں نے ''اخبرنا'' سے روایت کی۔ فلاں نے تحدیث اور ''انبانا'' کی شکل اختیار کی اور فلاں راوی نے عن کے ساتھ حدیث کو بیان کیا ہے۔ وہ حدیث کے ساتھ اقوال صحابہ اور تابعین نہیں لائے۔

☆ ابن صلاح مزید فرماتے ہیں کہ وہ تمام احادیث جن کا امام مسلم نے اپنی کتاب میں صحت کے ساتھ فیصلہ کر دیا ہے یقینی طور پر صحیح اور درست ہیں اور جن باتوں کی بنا پر مسلم کی الصحیح،

بخاری کی الصحیح سے ممتاز ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسلم نے اپنی کتاب میں تعلیقات بہت کم ذکر کی ہیں۔

☆ نووی فرماتے ہیں کہ مسلم نے اپنی کتاب میں عمدہ طریقوں کو اختیار کیا اور اتنی احتیاط کے ساتھ حدیثوں کو نقل کیا کہ جس سے ان کا علو مرتبہ، کمال وفن، علم وتقویٰ اور جلالت شان ظاہر ہوتی ہے۔ مسلم کے بعد اور بھی حضرات نے ان کی طرح کتابیں لکھیں اور عالی مسندوں کو حاصل کیا لیکن شیخ ابو عمرو بیان کرتے ہیں کہ یہ کتابیں اگرچہ صحیح احادیث کے ساتھ مدوّن کی گئی ہیں مگر صحیح مسلم کا کسی شکل میں بھی مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

☆ ابو علی زاغونی کو ان کی وفات کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا اور ان سے دریافت کیا کس عمل کی بنیاد پر تمہیں نجات ملی۔ انہوں نے صحیح مسلم کے چند اوراق کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ان اجزائے مسلم کی بدولت مجھے نجات ملی۔ (۱۳۸)

تخریج روایت کی شرائط

جس زمانے میں امام مسلم نے اپنی کتاب کو مرتب فرمایا اس وقت موضوع وضعیف، صحیح وغلط ہر طرح کی حدیثیں موجود تھیں۔ اس بنا پر انہوں نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں احادیث کی تین قسمیں اور راویوں کے تین طریقے قرار دیے ہیں جس سے ان کی شرائط کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ وہ احادیث جو بالکل صحیح ہوں ان کے راوی متقی، ضابطہ اور ثقہ تسلیم کیے گئے ہوں۔

۲۔ وہ احادیث جن کے رواۃ باعتبار ثقاہت اور حفظ واتقان کے پہلے قسم کے راویوں سے کم ہوں۔

۳۔ وہ احادیث جن کے رواۃ کو عموماً اکثر محدثین نے مردود قرار دیا ہو۔

امام صاحب فرماتے ہیں کہ قسم اول کے بعد قسم ثانی کو کتاب میں درج کروں گا لیکن قسم ثالث کی طرف توجہ نہیں کروں گا۔

اہل علم اس مسئلہ میں مختلف الرائے ہیں کہ اس تقسیم سے کیا مراد ہے۔ حافظ ابو عبداللہ حاکم

اور امام بیہقی کا خیال ہے کہ امام صاحب کی موت نے دوسرے طبقہ کی حدیثوں کی تخریج کا موقع نہیں دیا بلکہ صحیح مسلم میں صرف طبقۂ اولیٰ کی روایات ہیں۔ لیکن قاضی عیاض نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دونوں طبقہ کی حدیثیں موجود ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ طبقہ ثانیہ کی روایات متابعت یا شواہد کے طور پر درج ہیں۔ اسی طرح ان ابواب میں بھی آ گئی ہیں جس سے طبقہ اولیٰ کی حدیثیں دستیاب نہ ہو سکیں۔ اسی طرح ان راویوں کی روایات سے بھی تعرض کیا ہے جن کو بعض محدثین نے معتبر اور بعض نے غیر معتبر قرار دیا ہے۔ غرض یہ کہ تینوں قسم کی روایات کتاب میں آ گئی ہیں اور امام صاحب کے نزدیک حدیث کی شرط یہ ہے کہ حدیث متصل الاسناد ہو اور ابتدا تا انتہا ثقہ راویوں نے روایت کیا ہو اور شاذ و علت سے پاک ہو۔ جب یہ تمام شرائط کسی حدیث میں پائی جائیں تو وہ بالاتفاق صحیح تسلیم کی جاتی ہے۔ البتہ اختلاف اس وقت ہوتا ہے جب ان شرائط میں سے کوئی شرط پوری نہ ہوئی ہو۔

اسی طرح امام مسلم نے ایسے لوگوں سے بھی حدیث کی تخریج کی ہے جن کی حدیث کو کسی شبہ کی بنا پر امام بخاری نے ترک کر دیا تھا۔ جس کی مثال امام زہری کے تلامذہ ہیں جو اوصاف کی کمی و زیادتی کے لحاظ سے پانچ طبقوں میں تقسیم کیے گئے ہیں۔ (۱۳۹)

شروح مسلم

صحیح مسلم بہت ہی عالی مقام و مرتبہ کی حامل ہے۔ علما کرام نے اس کی بکثرت شروح لکھی ہیں جن کی تعداد تیس سے بھی متجاوز ہے۔ ان میں سب سے عمدہ اور معروف و مشہور ابوزکریا نووی شافعی کی ہے جو علما امت میں مقبول ہے اور صحیح مسلم کے ساتھ ہندوستان میں بھی طبع ہو چکی ہے۔ برصغیر میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے فتح الملہم کے نام سے ایک مبسوط شرح لکھی تھی لیکن وہ مکمل نہ ہو سکی۔ بہرحال مشہور شروح درج ذیل ہیں۔

- ☆ المنہاج فی شرح مسلم بن الحجاج از ابوزکریا یحییٰ بن شرف نووی شافعی۔
- ☆ الاکمال فی شرح مسلم از قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی۔ جرمنی میں مخطوطہ موجود ہے۔

- ☆ المعلم بفوائد کتاب مسلم از ابو عبداللہ محمد بن علی المازری۔
- ☆ المفھم لما اشکل من تلخیص کتاب مسلم از احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی۔ مکمل محفوظ جرمنی میں ہے۔
- ☆ اکمل المعلم شرح مسلم از ابو عبداللہ محمد بن خلیفہ الوشتانی الابی مالکی۔
- ☆ الدیباج علی مسلم بن الحجاج از عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی۔
- ☆ منہاج الابتھاج بشرح مسلم بن الحجاج۔ از احمد بن محمد الخطیب القسطلانی۔
- ☆ شرح مسلم از مولانا علی القاری الھروی۔
- ☆ المفھم فی شرح غریب مسلم از عبدالغافر بن اسماعیل الفارسی۔
- ☆ شرح مسلم از ابی الفرج عیسیٰ بن مسعود الزواوی۔
- ☆ فتح الملھم از شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی۔
- ☆ حاشیہ سندھی از محمد بن الھادی۔

الصحیح بخاری اور الصحیح مسلم کا تقابلی جائزہ

امام بخاری کی الصحیح بخاری اور امام مسلم کی الصحیح مسلم دونوں کو علمائے امت صحیحین کہتے ہیں۔ ان دونوں کے متعلق علما کا قول ہے کہ یہ تمام حدیث کی کتابوں میں صحیح ترین ہیں۔ ان کو صحیح با اعتبار اغلبیت کہا جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں ''صحیحین کی شان یہ ہے کہ تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ ان میں جتنی حدیثیں مرفوع متصل ہیں وہ سب یقیناً صحیح ہیں'' اور یہ دونوں کتابیں اپنے اپنے مضمون تک متواتر ہیں۔ صحیحین کی احادیث کی مراتب میں تفاوت اس امر پر مبنی ہے کہ صحیحین کی مقبولیت پر علما کا اتفاق ہے لیکن دونوں میں ترجیح کس کو دی جائے اس امر پر اختلاف ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب ''شرح نخبۃ الفکر'' میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جمہور کے نزدیک صحیح بخاری کو صحیح مسلم پر تقدم حاصل ہے۔

بعض مغربی علما نے مسلم کو ترجیح دی ہے۔ لیکن وہ ترجیح بلحاظ صحت نہیں بلکہ بلحاظ ترتیب و تدوین ہے اس لیے ان دونوں اختلاف کے ہوتے ہوئے بھی بخاری کا مقام اونچا ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ صحیح بخاری کی صحت کا مدار جن اوصاف پر ہے وہ صحیح مسلم کے اوصاف سے اقویٰ و اکمل ہیں۔

اتصال سند

بخاری کے نزدیک راوی کا مروی عنہ سے کم از کم ایک مرتبہ ملنا ضروری ہے بخلاف مسلم کے، ان کے نزدیک معاصرت ہی کافی ہے ملاقات ضروری نہیں۔ امام بخاری کی حدیث معنعن (بالفاظ عن فلاں عن فلاں) پر اعتراض وارد ہوتا ہے لیکن ابن حجر اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ جب راوی اور مروی عنہ کی ملاقات شرط ہے تو نام کے درج نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

عدالت وضبط رواۃ

عدالت اور ضبط رواۃ کے لحاظ سے بھی بخاری کا مقام ارفع ہے کیوں کہ مسلم کے رواۃ بخاری کی نسبت تعداد میں زیادہ مجروح ہیں۔ بخاری کے مجروح رواۃ کی تعداد کم ہے۔ نیز بخاری کے بلا واسطہ شیوخ ایسے ہیں جن کی حدیث سے وہ خوب واقف تھے بخلاف مسلم کے کہ ان کے بالواسطہ شیوخ ایسے بھی ہیں جن کی احادیث سے وہ واقف نہیں تھے۔

عدم شذوذ واعلال

اس اعتبار سے بھی صحیح بخاری کا مقام اونچا ہے۔ کیونکہ بخاری میں مسلم کی نسبت شاذ او معلل احادیث کم ہیں، علما کے نزدیک بخاری کا درجہ علوم میں عموماً اور حدیث میں خصوصاً زیادہ ہے اور امام مسلم تو امام بخاری کے شاگرد بھی ہیں۔

دارقطنی کہتے ہیں کہ اگر امام بخاری نہ ہوتے تو فن حدیث میں مسلم اتنی شہرت حاصل نہ کرتے۔ (۱۴۰)

رجال مسلم میں سے جن لوگوں کو ضعیف کہا گیا ہے ان کی تعداد ان رجال بخاری کی نسبت جن کی تضعیف کی گئی ہے زیادہ ہے۔ بخاری کے کل ایسے راوی ۸۰ ہیں اور مسلم کے ۱۶۰ ہیں جن سے صرف امام مسلم نے روایت کی ہے۔

امام بخاری ایسے ضعیف لوگوں کی روایات زیادہ نہیں لیتے صرف ایک دو حدیثیں لے لیتے ہیں۔ امام مسلم نے ایسے لوگوں کی حدیثیں زیادہ تعداد میں لی ہیں۔

امام بخاری صرف درجہ اول کے رواۃ کی حدیثیں لیتے ہیں۔ شاذ و نادر کہیں تعلیقات یعنی درجہ دوم کے رواۃ کی حدیثیں بھی نقل کر دیتے ہیں۔

یہ وہ وجوہ ہیں جن کے باعث صحیح بخاریؒ کو مسلم پر ترجیح دی جاتی ہے۔

لیکن یہ بھی اپنی جگہ حق ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر صحیح مسلم کو بھی صحیح بخاری پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ حافظ ابن حجر اور بعض دوسرے علما نے یہ لکھی ہے کہ امام مسلم نے ایک

حدیث کے جتنے طرق واسانید انہیں معلوم تھے سب ایک جگہ جمع کر دیے۔ جس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ طالب حدیث کو بیک وقت ایک حدیث کے تمام طرق معلوم ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے لیے حدیث پر حکم لگانا سہل ہو جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگرچہ امام مسلم نے بھی امام بخاری کی طرح اپنی کتاب کو ابواب فقہ پر مرتب کیا ہے لیکن انہوں نے خود کسی مسئلہ پر حکم لگانے سے اجتناب کیا ہے اور اس بات کے ماتحت صرف احادیث کو جمع کر دینے پر کفایت کی ہے۔

لیکن یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ جن محدثین نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی بعض حدیثوں پر جو کلام کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ حدیثیں بالکل ساقط ہیں بلکہ وہ صرف ایک فنی کلام ہے۔ امام بخاری و مسلم نے اپنی تحقیق میں بعض راویوں کو عدول وثقہ سمجھا ہے اور ان کی روایت قبول کی ہے لیکن بعض محدثین مثلاً دارقطنی اور ابن جوزی وغیرہ کہتے ہیں کہ وہ لوگ متکلم فیہ ہیں لہٰذا ہمیں ان دونوں کا محاکمہ کرنا ہوگا اور چونکہ اکثریت امام بخاری کی طرف ہے اور ان کی غایت تحقیق وتدقیق مسلم ہے اس لیے فیصلہ انہی کے حق میں ہونا چاہیے۔

اگر تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ یہ چند حدیثیں ضعیف ہیں تو ان کے علاوہ وہ تمام احادیث جن کی صحت پر امت کا اتفاق ہے انہیں تو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ تضعیف حدیث میں اگر ناقدین کا قول صحیح ہو سکتا ہے تو تصحیح کے باب میں بھی ان کا قول معتبر ہوگا۔ یہ تو درست نہیں ہے کہ ہم ان کے ایک قول کو تسلیم کر لیں اور دوسرے کو رد کر دیں۔ (۱۴۱)

سنن ابی داؤد

مؤلف: ابوداؤد

سلیمان نام اور کنیت ابی داؤد تھی۔ ان کے والد کا نام اشعث بن اسحٰق تھا۔ وہ سیستان کے رہنے والے تھے۔ یہ ہرات اور سندھ کے درمیان بلوچستان کے قریب واقع ہے۔ سیستان کا معرب سجستان ہے۔ اس لیے وطن کی طرف منسوب ہو کر وہ سجستانی کہلائے۔ اگرچہ ان کے وطن

کے تعین میں ذرا سا اختلاف ہے۔

ابن خلکان نے کہا ہے کہ سجستان بصرہ کے اطراف میں ایک دیہات کا نام ہے لیکن شاہ عبدالعزیزؒ نے ابنؒ کی تردید کی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ ہرات وسندھ کے درمیان ایک مشہور شہر ہے۔ لیکن وہاں کے جغرافیہ میں اس نام کے شہر کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ یاقوت حموی نے لکھا ہے کہ یہ خراسان کے اطراف میں ہے اور اس کو سجز بھی کہتے ہیں اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے امام داؤد سجزیؒ بھی کہلاتے ہیں۔

پیدائش و وفات

امام موصوف سیستان میں ۲۰۲ ہجری میں پیدا ہوئے لیکن انہوں نے زندگی کا بڑا حصہ بغداد میں گزارا اور وہیں اپنی سنن کی تالیف کی۔ اس لیے ان سے روایت کرنے والوں کی اس اطراف میں کثرت ہے لیکن بعض وجوہ سے ۲۷۱ ہجری میں بغداد کو خیر باد کہا اور زندگی کے آخری چار سال بصرہ میں گزارے جو اس وقت علم وفن کے لحاظ سے مرکزی حیثیت رکھتا تھا اور وہیں بروز جمعہ ۲۷۵ ہجری میں وفات ہوئی۔

تحصیل علم

امام ابی داؤد کی زندگی کے ابتدائی حالات بہت کم ملتے ہیں لیکن جس زمانے میں انہوں نے آنکھ کھولی اس وقت علم حدیث کا حلقہ بہت وسیع ہو چکا تھا لہٰذا امام موصوف نے بغرض حدیث مختلف بلاد کا سفر کیا اور اس زمانہ کے تمام مشاہیر اساتذہ وشیوخ سے حدیث حاصل کی۔ تحصیل علم کے لیے بغداد، خراسان، عراق، شام، الجزائر وغیرہ مختلف شہروں میں تشریف لے گئے اور ہر جگہ کے اربابِ فضل وکمال سے استفادہ کیا۔

اساتذہ وتلامذہ

امام ابی داؤد تحصیل علم کے لیے جن اکابر وشیوخ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کا انفرادی شمار خاصا طویل ہے۔ خطیب تبریزی فرماتے ہیں کہ انہوں نے بے شمار لوگوں سے حدیثیں حاصل

کیں۔ ان کی سنن اور دیگر کتابوں کو دیکھ کر حافظ ابن حجر کے اندازے کے مطابق ان کے شیوخ کی تعداد تین سو سے زائد ہے۔ وہ امام بخاری کے بہت سے شیوخ میں ان کے شریک ہیں۔ ان کے اساتذہ میں امام احمد، قعنبی، ابوالولید طیالسی، مسلم بن ابراہیم اور یحییٰ بن معین جیسے آئمہ فن شامل ہیں۔

اس طرح ان کے تلامذہ کا شمار بھی مشکل ہے۔ ان کے حلقہ درس میں کبھی کبھی ہزاروں کا اجتماع ہوتا تھا۔ علامہ ذھبی نے لکھا ہے کہ ان کے لیے سب سے زیادہ قابل فخر بات یہ ہے کہ امام ترمذی اور امام نسائی ان کے تلامذہ میں سے ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے بھی حدیث کا علم ان سے سنا ہے اور امام ابی داؤد اس پر فخر کیا کرتے تھے۔

زہد و تقویٰ

ابو حاتم فرماتے ہیں کہ امام موصوف فقہ، حفظ حدیث، زہد و عبادت، یقین اور توکل میں یکتائے روزگار تھے۔ ان کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے کہ ان کے کرتہ کی ایک آستین تنگ تھی اور ایک کشادہ۔ جب اس کا راز دریافت کیا گیا تو بتایا کہ ایک آستین میں اپنے نوشتہ کو رکھ لیتا ہوں اس لیے اس کو کشادہ بنالیا ہے اور دوسری کو کشادہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، نہ اس میں کوئی فائدہ تھا، اس لیے اس کو تنگ ہی رکھا ہے۔ ملاّ علی قاری فرماتے ہیں کہ تقویٰ اور عبادت میں امام داؤد بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امام موصوف رفتار و گفتار میں اپنے استاد امام احمد کے بہت مشابہ تھے۔

امام موصوف کو علم و عمل میں جو امتیازی مقام حاصل تھا، اس زمانے کے علما و مشائخ کو بھی اس کا پورا پورا اعتراف تھا۔ چنانچہ حافظ موسیٰ بن ہارون فرماتے ہیں کہ امام ابی داؤد دنیا میں حدیث کے لیے اور آخرت میں جنت کے لیے پیدا کیے گئے تھے۔ میں نے اس سے افضل کسی کو نہیں دیکھا ۔ امام ابراہیم حربی کا یہ فقرہ ابی داؤد کے متعلق مشہور ہے کہ حدیث کو ان کے لیے اس طرح نرم کر دیا گیا تھا جیسے داؤدؑ کے لیے لوہا۔ حاکم کی رائے یہ ہے کہ ابی داؤد بے شک اپنے زمانے کے محدثین کے امام تھے۔

مسلک

امام ابی داؤد کے مسلک کے بارے میں بھی اختلاف ہے ہر کوئی ان کو اپنے مسلک کا امام ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض افراد نے ان کو حنبلی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ نواب صدیق حسن خان نے ان کو شافعی شمار کیا ہے لیکن مولانا محمد انور شاہ کشمیری نے علامہ ابن تیمیہ کے حوالے سے انُ کو حنبلی فرمایا ہے۔ مگر ان کی سنن' کے مطالعہ کے بعد یہ بات بالکل آشکار ہو جاتی ہے کہ امام ابی داؤد حنبلی المسلک تھے۔ ان کی سنن کے تراجم پر غور کرنے کے بعد اس میں شک کی گنجائش نہیں رہتی۔ امام موصوف نے اپنی سنن میں بہت سے مقامات پر دوسری ثابت و معروف روایات کے مقابلہ میں ان احادیث کو ترجیح دی ہے جن سے امام احمد کے مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ (۱۴۲)

تصنیفات

امام ابی داؤد نے بہت علمی کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں سنن، مراسیل، الناسخ و منسوخ، فضائل الانصار، مسند مالک بن انس، المسائل، معرفتہ الاوقات وغیرہ شامل ہیں لیکن ان سب میں آپ کی حدیث کی کتاب سنن سب سے زیادہ اہم اور معروف ہے۔

سنن ابی داؤد کی وجہ تالیف

امام ابو داؤد نے جس زمانے میں شعور کی آنکھ کھولی تو ضرورت محسوس کی کہ فن حدیث میں ایک نئے انداز کی کتاب کی ضرورت ہے جس میں ان احادیث کا انتخاب ہو جن سے آئمہ نے اپنے مذاہب پر استدلال کیا ہے۔ علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں حفاظ حدیث کی ایک خاص جماعت موجود تھی جس نے ضبط و حفظ میں پوری توجہ کی لیکن اس نے نہ تو مسائل کے استنباط کی طرف توجہ کی اور نہ ان خزانوں سے احکام نکالنے کی کوشش کی۔ اس کے بالمقابل ایک ایسی جماعت تھی جس نے اپنی پوری توجہ استنباط مسائل اور اس میں غور و فکر کی طرف کر رکھی تھی یہاں تک کہ ناقلین حدیث کی پہلی جماعت جو فتویٰ دینے سے بھی احتراز کرتی تھی ان کا مقصد صرف حضور اکرم ﷺ کی احادیث کو روایت کرنا تھا اور یہ حضرات آئمہ مجتہدین کی فقہی باریکیوں

سے ناواقف تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے معتقدمین میں سے بعد کے کچھ لوگوں نے آئمہ پر تنقید کرنی شروع کر دی۔ جیسے حمیدی نے امام ابوحنیفہ پر اور احمد بن عبداللہ العجلی نے امام شافعی پر تنقید کی اور کہا کہ وہ قابل اعتماد ہیں لیکن اپنی حدیث سے واقفیت نہیں۔ جیسے ابو حاتم رازی نے کہا کہ شافعی فقیہہ ضرور ہیں مگر حدیث سے معرفت نہیں رکھتے۔ اس لیے امام ابی داؤد خود فرماتے ہیں کہ میری اس کتاب کے اندر مالک، ثوری، شافعی وغیرہ کے مذاہب کی بنیادیں موجود ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا ارشاد ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ ایسی احادیث کو یکجا کر دیں جس سے فقہا استدلال کرتے ہیں اور ان میں مروج ہیں اور جن کو علما نے احکام کی بنیاد قرار دیا ہے۔ یہ وہ مقصد تھا جس کی بنا پر امام ابی داؤد نے اپنی سنن کو تالیف کیا۔

مقبولیت

یہی وجہ تھی کہ ہر زمانے کے علما و فقہا نے سنن ابی داؤد کی طرف پوری توجہ کی۔ یہاں تک کہ جب یہ کتاب لکھی گئی اور مصنف نے لوگوں کو پڑھ کر سنایا تو بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ اس سنن کے بارے میں ابن قیم کی رائے ہے کہ امام موصوف نے ایسی کتاب لکھی جو مسلمانوں کے درمیان حکم ثابت ہوئی اور اختلافی مسائل میں فیصلہ کن بن گئی۔ ایک بزرگ نے اپنا خواب بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا جو سنت پر عمل کرنا چاہتا ہو اسے سنن ابی داؤد پڑھنی چاہیے۔

مقام

سنن ابی داؤد کا مقام معلوم کرنے کے لیے پہلے صحاح ستہ کے مقاصد پر غور کرنا ضروری ہے۔ امام بخاری کے نزدیک اپنی سُنن الصحیح کی تالیف کا مقصد طرق استنباط اور استخراجِ مسائل ہے جو ان کے تراجم میں ہے۔ اس طرح امام مسلم نے اپنی کتاب میں صحیح احادیث کو مختلف اسانید سے یکجا بیان کر دیا ہے۔ امام ابوداؤد نے آئمہ کے مستدلات کو موضوع قرار دیا۔ امام ترمذی کا مقصد بیان مذاہب اور امام نسائی کی غرض علل حدیث پر تنبیہ کرنا ہے۔ ابن ماجہ نے غیر معروف روایات کو بیان کرنا اپنے پیش نظر رکھا۔ اوپر کی گفتگو سے ہمارے سامنے ان کتابوں کے اغراض و

مقاصد سامنے آگئے۔ اس لیے مشکوٰۃ شریف کے بعد ترمذی شریف کی تعلیم دینی چاہیے کیوں کہ سب سے پہلے طالب علم کو آئمہ کے مذاہب معلوم ہونے چاہئیں۔ پھر مزید برآں آئمہ کے دلائل جاننے کی ضرورت ہے، اس کے لیے سنن ابی داؤد کا وظیفہ ہے۔ پھر طرق استنباط وطرز استدلال معلوم ہونا چاہیے اس کے لیے صحیح بخاری کا وظیفہ ہے پھر اس کے بعد مزید تائید کے لیے مسلم شریف کو پڑھانا چاہیے کیوں کہ وہ صحیح احادیث کو مختلف اسانید سے یکجا روایت کرتے ہیں پھر عللِ حدیث جاننے کے لیے نسائی کا مقام ہے۔ پھر کھرے کھوٹے کے جاننے کے لیے سنن ابن ماجہ کا درجہ ہے اب یہ بالکل واضح ہوگیا کہ تعلیم کے لحاظ سے سنن ابوداؤد کا کیا درجہ ہے۔

یہ بات متفق و مسلم ہے کہ صحیحین کو سنن اربعہ پر صحت کے لحاظ سے فضیلت حاصل ہے۔ لیکن اس کے بعد کی ترتیب میں علما کا اختلاف ہے۔ بعض حضرات نے نسائی شریف کو تیسرا درجہ دیا ہے اور بعض نے جامع ترمذی کو۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے جہاں کتب حدیث کے طبقات بیان کیے ہیں وہاں سنن ابی داؤد کو دوسرے طبقے میں شمار کیا ہے۔ لیکن صاحب مفتاح السعادۃ نے لکھا ہے کہ سب سے اونچا درجہ بخاری کا ہے اس کے بعد صحیح مسلم کا اور پھر سنن ابی داؤد کا درجہ ہے اور یہی زیادہ مناسب ترتیب ہے۔ کیوں کہ علامہ ابن جوزی نے جامع ترمذی کی تیس، سنن نسائی کی دس اور سنن ابی داؤد کو نو احادیث کو موضوع قرار دیا ہے۔ اگرچہ علامہ جوزی تنقید روایت میں زیادہ شدید مانے گئے ہیں اور علما نے ان کے اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے لیکن ان کے اس قول سے بہرحال سنن ابی داؤد کو صحت کے لحاظ سے تقدم حاصل ہوتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ امام مسلم نے اپنی کتاب میں رجال کے تین طبقات قائم کیے ہیں جن کے متعلق حاکم اور بیہقی نے لکھا ہے کہ انھوں نے صرف پہلے ہی طبقے کی روایات کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے۔ لیکن قاضی عیاض نے دعوی کیا ہے کہ انہوں نے طبقۂ ثانیہ کی روایات کو بھی شامل کیا ہے۔ حضرت گنگوہی نے اپنی تقریرِ مسلم میں فرمایا کہ ابی داؤد نے طبقہ ثالثہ کی روایات کو بھی ضمناً واستشہاداً بعض جگہ بیان کر دیا ہے۔ اس پر ابن سید الناس نے لکھا ہے کہ امام ابی داؤد نے ضعیف اور نا قابل اعتبار روایات سے گریز کیا ہے اور جہاں کہیں ضعف شدید ہے تو اس کی وجہ

یان کردی ہے۔ (۱۴۳)

عتراف فضیلت

☆ سنن ابی داؤد کو صحاح ستہ میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کتاب کو ۹ جلیل القدر لوگوں نے روایات کیا ہے۔

☆ امام ابی داؤد کا اپنا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی پانچ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں جن سے ان روایات کا انتخاب کیا ہے جو اس کتاب میں درج ہیں۔

☆ اس کتاب میں فقہی احادیث کا جتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے وہ صحاح ستہ کی کسی کتاب میں نہیں ملے گا۔

☆ سنن ابی داؤد کی افادیت واہمیت کے ضمن میں امام غزالی نے تصریح کی ہے کہ ایک مجتہد کے لیے صرف یہی کتاب کافی ہے۔ (۱۴۴)

☆ امام احمد بن محمد ابو سلمان خطابی اپنی مشہور کتاب معالم السنن شرح سنن ابی داؤد میں فرماتے ہیں امام ابی داؤد کی کتاب السنن بلا شبہ ایسی عمدہ کتاب ہے کہ علم دین میں ایسی کتاب تصنیف نہیں ہوئی اور اس نے سب لوگوں کی طرف سے سند قبولیت حاصل کی ہے۔ یہ کتاب علما کے تمام فرقوں اور فقہا کے سب طبقوں میں باوجود اختلاف مذاہب کے حکم مانی جاتی ہے۔ سب لوگ اس کے گھاٹ پر آتے ہیں اور اس سے سیراب ہوتے ہیں اس پر اہل عراق، اہل مصر، بلاد مغرب اور روئے زمین کے بہت سے شہروں کے رہنے والوں کو اعتماد ہے۔ (۱۴۵)

☆ ابو سعید بن الاعرابی کا کہنا ہے کہ جو شخص قرآن اور اس کتاب کے سوا اور کچھ بھی نہیں جانتا وہ بھی ایک بڑا عالم ہے۔ (۱۴۶)

شروح سنن ابی داؤد

۱۔ معالم السنن از احمد بن محمد ابو سلیمان الخطابی۔

۲۔ عجالۃ العالم من کتاب المعالم از ابو محمود احمد بن ابراہیم المقدسی۔

۳۔ شرح سنن ابی داؤد از امام نووی۔

۴۔ شرح تہذیب السنن شرح مختصر سنن ابی داؤد از حافظ ابن قیم۔

۵۔ السراج الوہاج شرح تلخیص صحیح مسلم بن حجاج نواب صدیق حسن خاں۔

۶۔ شرح سنن ابی داؤد از شیخ قطب الدین ابی بکر احمد الیمینی الشافعی۔

۷۔ شرح سنن ابی داؤد از امام ولی الدین ابی زرعہ۔

۸۔ شرح سنن ابی داؤد از حافظ علاؤ الدین مغلطائی۔

۹۔ شرح سنن ابی داؤد از احمد بن الحسین ارسلان۔

۱۰۔ مرقاۃ الصعود الی سنن ابی داؤد از حافظ سیوطی۔

۱۱۔ فتح الودود علی سنن ابی داؤد ابو الحسن محمد بن عبد الہادی السندی۔

۱۲۔ غایۃ المقصود فی حل سنن ابی داؤد از مولانا محمد شمس الحق عظیم آبادی۔

۱۳۔ عون المعبود از شرف الحق المشہور محمد اشرف صدیقی۔

۱۴۔ بذل المجہود از مولانا خلیل احمد سہارن پوری۔

۱۵۔ المنہل العذب المورود از محمود بن خطاب سبکی۔

۱۶۔ علامہ بدر الدین عینی نے بھی سنن ابی داؤد کے بعض حصوں کی شرح لکھی ہے۔

جامع ترمذی

مؤلف: امام ترمذی

محمد نام اور ابو عیسیٰ آپ کی کنیت ہے۔ آپ قبیلۂ بنو سلیم سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کا پورا نسب یوں بیان کیا جاتا ہے: محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک سلمی ترمذی بوغی۔ (لیکن سمعانی نے اس کے نسب نامہ کے ساتھ بوغی کی بجائے شداد لکھا ہے)۔ بوغی قریہ بوغ کی سے منسوب ہے اور بعض روایتوں کے مطابق امام ترمذی اس قریے میں آسودۂ خواب ہیں۔

پیدائش ووفات

امام موصوف ۲۰۵ ہجری میں ترمذ میں پیدا ہوئے۔ ترمذ ایک قدیم شہر ہے جو دریائے جیحون کے ساحل پر واقع ہے۔

آپ کا انتقال مشہور روایت کے مطابق ۲۷۹ ہجری میں یہیں ہوا۔ آپ نے ۷۴ سال عمر پائی تھی۔

نسبت حدیث

امام ترمذی جس دور میں پیدا ہوئے اس زمانے میں علم حدیث شہرت کے درجے کو پہنچ چکا تھا اور امام بخاری جیسے جلیل القدر محدث کی مسند علم بچھ چکی تھی۔ امام صاحب نے جونہی شعور کی آنکھ کھولی انہیں علم حدیث کی تحصیل کا شوق دامن گیر ہوگیا۔ چنانچہ انہوں نے اس کے حصول کے لیے مختلف حصوں، علاقوں اور ملکوں کا سفر کیا۔

آپ نے اپنے زمانے کے ہر خرمن حدیث سے استفادہ کیا اس لیے ان کے شیوخ کا تعین بہت دشوار ہے۔ علامہ ذہبی نے بخاری، مسلم، علی بن حجر مروزی، ہناد بن سری، قتیبہ بن سعید اور محمد بن بشار وغیرہ کو امام ترمذی کے اساتذہ میں شمار کیا ہے۔

امام بخاری کے انتقال کے بعد ابوعیسیٰ ترمذی کے ہم پلہ خراسان میں کوئی محدث نہیں تھا۔ اس لیے ان کی ذات مرجع خلائق بن گئی۔ ان کے تلامذہ میں خراسان و ترکستان کے علاوہ دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں کے آدمی ہیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: ابو حامد احمد بن عبد مروزی، ہیثم بن کلیب شاشی، ابوالعباس احمد بن محبوب المروزی۔ احمد بن یوسف نسفی، محمد بن محمود، داؤد بن نصر بن سہل بزدوی وغیرہ۔

ابوسعید ادریسی فرماتے ہیں کہ ابوعیسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے بلا کی قوت حفظ عطا کی تھی۔ ان کا ایک خاص واقعہ رجال کی تقریباً سب ہی کتابوں میں مذکور ہے کہ انہوں نے ایک شیخ سے دو جزء کے بقدر بالواسطہ حدیثیں سنیں اور قلم بند کیں۔ حسن اتفاق سے کچھ دنوں کے بعد ان شیخ سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے شیخ مذکور سے سماعت حدیث کی درخواست کی۔ شیخ نے سنانی شروع کیں

اور امام ترمذی سے فرمایا کہ لکھ لو۔ ترمذی بیاض لے کر بیٹھ گئے۔ مگر قلم میں روشنائی نہیں تھی یوں ہی بیاض پر قلم چلاتے رہے۔ شیخ کو شبہ ہوا کہ یہ لکھ نہیں رہے ہیں بلکہ یونہی قلم چلا رہے ہیں۔ اٹھ کر دیکھا تو بیاض سادہ تھی بے حد خفا ہوئے اور فرمایا، تم مذاق کرتے ہو۔ امام ترمذی نے کہا آپ گھبرایئے نہیں جتنی حدیثیں آپ نے سنائی ہیں سب مجھے یاد ہیں، سن لیجیے چنانچہ تمام کی تمام حدیثیں فر فر سنا دیں۔ شیخ کو خیال ہوا کہ شائد یہ ان کو پہلے سے یاد تھیں۔ امام ترمذی نے عرض کیا آپ مزید حدیثیں سنایئے میں ان کو بھی سنا دوں گا۔ چنانچہ شیخ نے غرائب الحدیث سے چالیس حدیثیں سنائیں۔ حیرت یہ کہ امام ترمذی نے ان کو بھی فوراً سنا دیا۔

زہد و تقویٰ

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ امام ترمذی کو زہد و تقویٰ اس درجہ کا حاصل تھا کہ اکثر خوف خدا سے گریہ زاری کیا کرتے تھے یہاں تک کہ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ وہ پیدائشی نابینا تھے لیکن حافظ ابن حجر نے اس کی تردید کی ہے۔

تصانیف

امام ترمذی کی بکثرت تصانیف ہیں۔ آپ کو فقہ اور تفسیر پر بھی کافی دسترس حاصل تھی۔ ان کی مختلف کتابوں میں المفرد، التاریخ، الذھد، شمائل اور العلل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جامع ترمذی

امام ترمذی کی تمام تصانیف میں جامع ترمذی ان کی سب سے معروف اور مشہور کتاب حدیث ہے۔ حدیث کی جس کتاب میں آٹھ قسم کے مضامین بیان کیے جائیں اس کو جامع کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور وہ آٹھ قسم کے مضامین یہ ہیں:

۱۔ سیر ۲۔ آداب ۳۔ تفسیر ۴۔ عقائد

۵۔ فتن ۶۔ احکام ۷۔ اشراط ۸۔ مناقب

چونکہ ترمذی ان آٹھوں قسم کے مضامین پر مشتمل ہے اس لیے اس کو جامع کہا جاتا ہے اور

چونکہ ترتیب فقہی کے اعتبار سے بکثرت احکام کی حدیثیں لائے ہیں اس لیے اس پر سنن کا اطلاق بھی ہوتا ہے۔

خصوصیات

مولف کی فن حدیث میں متعدد تصانیف اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں لیکن ان کی کتاب جامع ترمذی کو ان کی ساری کتب پر فوقیت حاصل ہے۔

اول: اس وجہ سے کہ اس کی ترتیب عمدہ ہے اور تکرار نہیں ہے۔

دوم: اس میں فقہا کا مذہب اور اس کے ساتھ ہر ایک کا استدلال بیان کیا گیا ہے۔

سوم: اس میں حدیث کے انواع مثلاً صحیح، حسن، ضعیف، غریب اور معلل وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔ تبویب فقہ، علل حدیث، صحیح وضعیف، اسما و کنیٰ، جرح و تعدیل، شذوذ، موقوف اور مدرج وغیرہ کا بیان بھی ہے۔

چہارم: اس وجہ سے کہ اس میں راویوں کے نام، ان کے القاب اور کنیت کے علاوہ ان فوائد کو بھی بیان کیا گیا ہے جن کا علم الرجال سے تعلق ہے۔

پنجم: امام ترمذی کی کتاب امام بخاری اور امام ابی داؤد دونوں طریقوں کی جامع ہے۔

ششم: ایک طرف اس میں احادیث احکام میں سے ان احادیث کا تذکرہ کیا گیا ہے جن پر فقہا کا عمل رہا ہے۔ دوسری طرف اس کو صرف احکام کے لیے مختص نہیں کیا بلکہ امام بخاری کی طرح سب ابواب کی احادیث کو لے کر اپنی کتاب کو جامع بنا دیا گیا ہے اور اس پر مستزاد یہ انہوں نے علوم حدیث کی مختلف انواع کو اپنی کتاب میں اس طرح سمویا ہے کہ وہ علم حدیث کا ایک گلدستہ بن گئی ہے۔ (۱۴۷)

محاسن وفضائل

امام ترمذی کہتے ہیں کہ اس کتاب کو لکھ کر میں نے علما حجاز کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اس کو بہت پسند فرمایا اور علمائے خراسان کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے بھی داد تحسین دی۔ پس

جس گھر میں یہ کتاب ہو گویا اس میں نبی کریم ﷺ گفتگو فرما رہے ہیں۔

شیخ ابراہیم حجوری کا یہ مشورہ ہر طالب حدیث کے لیے ہے کہ جامع ترمذی کا اسے مطالع کرنا چاہیے چونکہ یہ کتاب فقہی فوائد اور سلف وخلف کے مذاہب کی جامع ہے اس لیے یہ مجتہد کے لیے کافی ہے اور مقلد کے لیے بے نیاز کرنے والی ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز لکھتے ہیں کہ ترمذی کی جامع ان کی کتابوں میں سب سے بہتر تصنیف ہے بلکہ متعدد وجوہ سے بے مثال ہے کیونکہ:

- اس میں حسن ترتیب اور عدم تکرار ہے۔
- فقہا کے مذاہب کا ذکر ہے نیز ہر مذہب والوں کے وجوہ استدلال بھی ہیں۔
- حدیث کی انواع صحیح وحسن، ضعیف، غریب، معلل وغیرہ بھی بیان کی گئی ہیں۔
- اسی طرح راویوں کے اسماء والقاب اور ان کی کنیتیں نیز دیگر فوائد جو علم رجال سے متعلق ہیں ان پر بھی خاص گفتگو ہے۔

شیخ ابن صلاح لکھتے ہیں کہ ترمذی شریف حدیث حسن تک پہنچنے کی اصل معرفت ہے۔

حافظ محمد بن طاہر مقدسی نے ذکر کیا کہ امام ابواسمٰعیل عبداللہ بن محمد انصاری کے سامنے ہرات میں امام ترمذی اور ان کی کتاب کا ذکر آیا تو انہوں نے فرمایا کہ ان کی کتاب میرے نزدیک بخاری مسلم سے زیادہ انفع ہے کیونکہ بخاری ومسلم سے فائدہ صرف عالم ہی اٹھا سکتا ہے اور ابوعیسیٰ کی کتاب ترمذی سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

ترمذی کی غرض

ہر محدث نے جمع حدیث کے لیے اپنی کتاب میں کچھ خاص چیزیں بطور غرض ومقصد کے پیش نظر رکھی ہیں۔ امام ترمذی کا مقصود اعظم بیان مذاہب ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں:

”ابوعیسیٰ ترمذی نے گویا شیخین کے طریقے کو، جو ابہام وتبیّن کا راستہ تھا اور ابوداود کی راہ جو فقہا کے مستدلات کا بیان تھا نہایت عمدگی سے جمع کر کے پیش کیا۔ مزید براں صحابہ وتابعین وفقہ

ے مذاہب کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ حقیقت میں انہوں نے بہت ہی جامع کتاب لکھی ہے۔ اسی طرح حدیث کے طرق کو بھی نہایت لطیف طریقہ سے مختصر کیا ہے کہ بس ایک حدیث کا ر کر دیا اور اسی باب میں اس کے ماسوا کی طرف اشارہ کر دیا اور ہر حدیث کے بارے میں بتا دیا ہ آیا یہ صحیح ہے یا حسن، ضعیف ہے یا منکر۔ حدیث کے ضعف کو بھی بیان کیا تا کہ طالب حدیث کو صیرت حاصل ہو جائے قابل عمل اور نا قابل عمل میں امتیاز ہو جائے۔ پھر حدیث کا مستفیض و ریب ہونا بھی بیان کیا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ امام ترمذی کا مقصود اعظم بیان مذاہب ہے۔ امام ترمذی کا صحابہ و بعین کے مذاہب کو بیان کرنا احکام کی بہت سی کتابوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اسی طرح امام وصوف نے ان مذاہب کو بھی بیان کیا ہے جو متروک ہو چکے ہیں۔ جیسے امام اوزاعی، سفیان ری، اسحاق بن ابراہیم مروزی وغیرہ کے مذاہب جس سے ترمذی کے واسطہ کے بغیر واقفیت ممکن ہے۔

رح وتعدیل

امام ترمذی کا یہ خاص امتیاز ہے کہ وہ روایت کو پوری جرح وتعدیل کے ساتھ پرکھتے ہیں۔ یونکہ اس فن میں انہیں رسوخ حاصل تھا جیسا کہ ان کی کتاب السنن اور کتاب العلل کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے لیکن روایت کی تحسین وتصحیح میں بعض جگہ ان سے تساہل واقع ہوا ہے۔

تنقید

امام موصوف کی ثقاہت وجلالت کے باوجود بعض محدثین نے ان پر تنقید کی ہے جس میں سب سے زیادہ حیرت انگیز تنقید علامہ ابن حزم کی ہے۔ ان کا قول ہے کہ ترمذی مجہول ہیں جس کو مہور محدثین نے رد بھی کر دیا ہے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ ابو عیسیٰ ترمذی کی ثقاہت متفق علیہ ہے۔ ن کے بارے میں ابن حزم کا یہ قول کہ وہ مجہول ہیں نا قابل توجہ ہے۔ دراصل ابن حزم ان کی کتاب جامع وعلل سے واقف ہی نہ تھے۔ (۱۴۸) حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ کتاب الفرائض میں

من الایصال میں ابن حزم نے امام ترمذی کو مجہول لکھا ہے، یہ بات وہی لکھ سکتا ہے جس کو ان کے حفظ اور تصانیف کی خبر نہ ہو۔

چند کتابی خصوصیات

☆ کبھی کبھی امام ترمذی ترجمۃ الباب کسی صحابی کی مشہور حدیث سے منعقد کرتے ہیں جس کی سند ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہے اور اس حدیث کی صحاح ستہ کے مؤلفین نے بھی تخریج کی ہوتی ہے لیکن اس ترجمہ کے تحت اس حکم کو دوسرے صحابی کی حدیث غیر معروف سے ثابت کرتے ہیں اگرچہ اس کی اسناد حدیث منعقد ترجمہ سے کم درجہ کی ہوتی ہے لیکن اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "**فی الباب عن فلان و فلان**" اور اسی طرح پوری ایک جماعت کا تذکرہ کر دیتے ہیں، جس میں اس صحابی کا نام لیتے ہیں جس کی حدیث سے ترجمہ منعقد کیا تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ حدیث غیر مشہور سے واقفیت بھی ہو جاتی ہے اور اگر اس میں کوئی علت خفیہ ہے تو اس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ اسی طرح متن کی کمی اور زیادتی کو بھی بیان کر دیتے ہیں۔

☆ امام ترمذی فی الباب عن فلاں وفلاں کا اسلوب اختیار کرتے ہوئے بہت سے صحابہ کا ذکر کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی آپ عن فلاں عن ابیہ کہتے ہیں اور اس میں متعدد باتیں ان کے پیش نظر ہوتی ہیں۔ کبھی تو یہ بتانا ہوتا ہے کہ ان صحابی کے صرف بیٹے ہی نے ان سے روایت کی ہے اور کبھی صحابی کے نام میں اختلاف ہوتا ہے تو بیٹے کا نام التباس دور کرنے کے لیے بیان کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے کیوں کہ وہ بعض اوقات صحابی کے غیر معروف ہونے کی وجہ سے بھی ایسا کر دیتے ہیں۔

☆ عام طور پر جس صحابی کی روایت باب کے تحت دلاتے ہیں پھر فی الباب میں اس کا تذکرہ نہیں کرتے۔ مثلاً باب کے تحت اگر حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث لائے تو فی الباب عن ابو ہریرہؓ نہیں کہیں گے۔ البتہ چند جگہیں مستثنیٰ ہیں مثلاً باب الرکعتین اذا جاء الرجال

والامام یخطب ۔ اس باب میں حضرت جابر کی روایت نقل کی ہے اور دوبارہ پھر فی الباب عن جابر کہا ہے۔

☆ اسی طرح حدیث طویل کو مختصر کر کے آخر میں فرماتے ہیں فیہ قصۃ وفیہ کلام اکثیر من ھذا۔

☆ امام ترمذی اسمائے مشترکہ کے درمیان تمیز کرتے ہیں جیسے یزید الفارسی ویزید الرقاشی۔ اسی طرح ان کنیتوں کے درمیان جن میں اشتراک ہوتا ہے اس کے فرق کو بھی ترمذی واضح کر دیتے ہیں جیسے ابو حازم الزاہد، ابو حازم الاشجعی ۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں بھی کسی طرح کا غموض وخفا ہوتا ہے امام ترمذی وہاں لازمی طور پر اس کو واضح کر دیتے ہیں۔

☆ اسی طرح سے باب بلا ترجمہ کے ہیں اور اس میں کسی حدیث کے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں فی الباب عن فلاں ۔ اس کے ذریعہ سے اس مضمون کی دوسری روایت کی طرف اشارہ کرتے ہیں نیز باب بلا ترجمہ سے کسی ایسے مسئلہ کی طرف تنبیہ کرنا چاہتے ہیں جس کا تعلق ماقبل کے ترجمہ الباب سے ہے۔ جیسا کہ ان کے شیخ امام بخاری کا طرز عمل اور طریقہ رہا ہے۔

☆ اسی طریقے سے ترجمہ کے تحت حدیث لانے کے بعد کہتے ہیں فی الباب عن فلاں یعنی کسی دوسرے صحابی کا یہاں ذکر کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد اسی صحابی سے روایت نقل کرتے ہیں جس کی حدیث کی طرف فی الباب میں اشارہ کیا گیا تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان صحابی کی یہی حدیث مراد ہے جس کو بعد میں ان سے روایت کر رہے ہیں۔ مثلاً باب زکوٰۃ البقر میں حضرت ابن مسعود کی حدیث کے بعد فرماتے ہیں وفی الباب عن معاذ بن جبلؓ اور پھر اس کے بعد حضرت معاذؓ نے تقریباً اسی مضمون کی روایت نقل کی ہے جو ابن مسعود کی روایت میں تھا۔

☆ اسی طرح ترجمہ کے تحت میں بھی کبھی دومرتبہ وفی الباب عن فلاں کہتے ہیں جیسے باب اکل الحوم الجلالۃ میں پہلے ابن عمر کی روایت کو لے آئے ہیں اور پھر کہا وفی الباب عن ابن عباس اور ابن عباسؓ کی پوری روایت نقل کی ہے اور اس کی تصحیح وتحسین کے بعد فرماتے ہیں وفی

الباب عن ابن عمر اور روایت نقل نہیں کی۔ بظاہر دوبارہ فی الباب کہنے سے ان کی غرض یہ ہے کہ حدیث اول کے ہم معنی ابن عمر سے دوسری روایت بھی موجود ہے۔ کمافی ابوداؤد وغیرہ۔

☆ عام طور پر اکثر ابواب میں خصوصاً احکام کی حدیث میں ایک ہی حدیث کے درج کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اس حدیث کے دیگر طرق یا اس باب کی دیگر روایات کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اس لیے احکام کی حدیثوں کی تعداد ان کی کتاب میں بہت کم ہے۔ اس کا تدارک فی الباب عن فلاں عن فلاں کے ذریعے کر دیتے ہیں۔ یہ ترمذی کی ایسی خصوصیت ہے جس کی محدثین کی نظر میں بہت اہمیت ہے۔ کیوں کہ ان کے ذریعے اس حدیث یا اس مضمون کی روایت کرنے والے صحابہ کی تعداد معلوم ہو جاتی ہے اور اس میں ایسا استیعاب کیا کہ جس کی تخریج کے لیے ہزاروں صفحات بھی ناکافی ہوں گے۔

☆ کبھی ترجمہ کے تحت احادیث غریب کو لاتے ہیں اور اسی باب کی دیگر روایات صحیحہ کی طرف ''فی الباب'' سے اشارہ کر دیتے ہیں۔ اگرچہ امام ترمذی کی تخریج روایت کی شرطیں شیخین وابوداؤد اور نسائی سے کم درجہ رکھتی ہیں لیکن صحت وضعف اور علل حدیث پر تنبیہ کر کے اس کی تلافی کر دیتے ہیں۔

☆ حافظ ابن رجب حنبلی نے شرح علل ترمذی میں تحریر فرمایا ہے کہ امام ترمذی نے اپنی کتاب میں حدیث صحیح وحسن اور غریب کو بیان کیا ہے اور ساتھ ہی اس کی صحت وضعف کو بھی ظاہر کیا ہے۔ علامہ حازمی فرماتے ہیں کہ اگر حدیث ضعیف یا طبقۂ رابعہ کی ہے تو اس کے ضعف پر تنبیہہ کر دیتے ہیں۔

☆ امام ترمذی کی عادت ہے کہ عام طور پر دو طرح کے تراجم قائم فرماتے ہیں۔ ایک ترجمہ سے اہل حجاز، جس میں عام طور پر امام شافعی مراد ہوتے ہیں، کے مسلک کی تائید مقصود ہوتی ہے اور دوسرے ترجمہ سے اہل عراق، جس میں عام طور پر امام ابوحنیفہ ہوتے ہیں کے مسلک کی تائید فرماتے ہیں۔

☆ امام ترمذی حدیث کی صحت اور حسن کا فیصلہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں "والعمل علیٰ ھذا عند اہل العلم او اکثر اہل العلم او عند بعض اہل العلم"۔ اس کے ذریعہ سے فقہا کے مذاہب کا علم ہو جاتا ہے اور بعض ایسے فقہا کا مسلک معلوم ہوتا ہے جن سے واقفیت امام ترمذی کے واسطہ کے بغیر مشکل ہے۔

☆ امام ترمذی نے اپنی کتاب میں بعض ایسی اصطلاحات کو استعمال کیا ہے جن کا تعلق عام طور پر جرح و تعدیل یا بیان مذاہب وغیرہ سے ہے۔ مثلاً ھذا حدیث صحیح حسن یا حسن صحیح یا ھذا حدیث حسن صحیح غریب۔ (۱۴۹)

شروح ترمذی

۱۔ عارضۃ الاحوذی	قاضی ابوبکر بن العربی اندلسی
۲۔ شرح جامع ترمذی	محمد بن محمد بن محمد المعروف بابن سید الناس
۳۔ شرح جامع ترمذی	حافظ زین الدین عراقی
۴۔ شرح ترمذی	عبدالرحمٰن بن شہاب الدین
۵۔ شرح جامع ترمذی	حافظ ابن حجر عسقلانی
۶۔ العرف الشذی	حافظ عمر بن ارسلان
۷۔ قوت المغتذی علی جامع ترمذی	حافظ سیوطی
۸۔ شرح ترمذی	محمد طاہر پٹنی
۹۔ شرح فارسی	سراج احمد سرھندی
۱۰۔ شرح عربی	ابوالطیب السندی
۱۱۔ شرح عربی	ابوالحسن محمد بن عبدالہادی
۱۲۔ حاشیہ ترمذی	احمد بن شاکر
۱۳۔ تحفۃ الاحوذی	مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری
۱۴۔ العرف الشذی	مولانا محمد چراغ

سنن نسائی

مؤلف: امام نسائی

آپ کا نام احمد ہے اور کنیت ابوعبدالرحمٰن۔ پورا نسب نامہ یہ ہے: احمد بن علی بن شعیب بن علی بن سنان بن بحر بن دینار۔ آپ اپنے زمانے میں حدیث کے مسلمہ امام تھے۔

خراسان اور ماوراء النہر کا علاقہ ہمیشہ سے علم وفن اور ارباب کمال کا مرکز رہا ہے۔ تاریخ اسلام کے سینکڑوں نامور فضلا اسی علاقے کی خاک سے اٹھے ہیں۔ امام نسائی بھی اسی خاک کے مایۂ ناز فرزند تھے۔ نسا خراسان کا ایک شہر ہے جو مرو کے قریب واقع ہے۔ اس کو امام موصوف کے مؤلد ومسکن ہونے کا شرف حاصل ہے اور اسی کی طرف منسوب ہو کر آپ نسائی کہلائے۔

ابتدائی حالات

امام نسائی ۲۱۵ ہجری میں پیدا ہوئے۔ زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی تھی لیکن اس زمانے میں خراسان کا علاقہ علم وفن کا مرکز بن چکا تھا۔ بہت سے ارباب فضل وکمال یہاں موجود تھے لہٰذا قیاس یہ ہے کہ آپ نے ابتدائی تعلیم یہیں سے حاصل کی ہوگی۔ مقالہ نگار دائرہ معارف علوم اسلامیہ لکھتے ہیں کہ "پندرہ سال کی عمر تک تو اپنے ہی شہر میں لکھتے پڑھتے رہے پھر ۲۳۰ ہجری میں تحصیل علم کے لیے رخت سفر باندھا اور خراسان، عراق، حجاز، شام، مصر اور الجزیرہ کے بہت سے جید علما حدیث کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔"

آپ جس زمانہ میں پیدا ہوئے تھے اس وقت علم حدیث کے لیے گھر بار چھوڑنا اور دور دراز تک ممالک کا سفر کرنا مسلمانوں کا خصوصی شعار بن چکا تھا۔ محدثین کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کی طلب میں ملکوں ملکوں سفر کرنا پھر سینکڑوں میل پا پیادہ طے کر لینا اس دور کے علما کے نزدیک جستجوئے علم کی خاطر بہت معمولی بات تھی۔ اسی ضابطہ کے

بموجب امام نسائی اپنے شہر کے شیوخ سے استفادہ کے بعد ۲۳۰ھ میں پہلے قتیبہ بن سعید کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس کے بعد پھر دوسرے شیوخ و اساتذہ سے استفادہ کے لیے دنیا کے مختلف حصوں کا سفر کیا۔

اساتذہ وشاگرد

آپ کے اساتذہ میں قتیبہ بن سعید، اسحاق بن راہویہ، ہشام بن عمار، عیسیٰ بن حماد، حسین بن منصور السلمی، محمد بن نصر المروزی اور سوید بن نصر خاص طور پر قابل ذکر ہیں جب کہ آپ کے تلامذہ میں ابو بشیر الدّولابی، ابوعلی حسین نیشاپوری، حمزہ بن محمد الکنانی، ابوبکر احمد بن السنی، محمد بن عبداللہ حیویہ اور ابوالقلم الطبرانی زیادہ مشہور ہیں۔

ایک ابتلا

امام نسائی دنیائے اسلام کے علمی مراکز میں خوب گھومے پھرے اور بالآخر مصر میں سکونت اختیار کی۔ طویل عرصے تک مصر میں قیام پذیر رہنے کے بعد نامساعد حالات کی وجہ سے ۳۰۲ ہجری میں دمشق کا رخ کیا۔ لیکن دمشق کا قیام ان کے لیے بڑا صبر آزما اور اذیت ناک ثابت ہوا۔ واقعات کے مطابق امام نسائی نے دمشق پہنچنے پر دیکھا کہ عوام کی اکثریت بنوامیہ کی طرف دار اور حضرت علیؓ کے خلاف ہے تو انہوں نے عوام کی فکری اصلاح کے لیے حضرت علیؓ کے فضائل و توصیف وستائش پر کتاب لکھی جس کا نام تھا ”کتاب الخصائص فی فضل علی بن ابی طالب“۔ جب جامعہ دمشق میں لوگوں کو یہ کتاب سنائی تو وہ بڑے برافروختہ ہوئے۔ پھر لوگوں نے امام نسائی سے حضرت امیر معاویہؓ کے فضائل کے بارے میں سوال کیے لیکن اپنی پسند کے جواب نہ سن کر مایوس اور غصے کے عالم میں امام موصوف پر پل پڑے اور انہیں سخت زدوکوب کیا۔ بعد ازاں ان کی خواہش کے مطابق انہیں فلسطین کے شہر رملہ میں پہنچا دیا گیا اور ایک روایت کے مطابق انہیں مکہ مکرمہ لے جایا گیا۔ جہاں وہ صفر ۳۰۳ ہجری بمطابق ۹۱۵ عیسوی میں وفات پا گئے۔ اب غالباً صفا اور مروہ کے درمیان مدفون ہیں۔

زہد وتقویٰ

امام نسائی زہد وتقویٰ میں بلند مقام رکھتے تھے۔ صوم داودی کے پابند تھے یعنی ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزہ رکھتے تھے۔ حافظ محمد بن مظفر فرماتے ہیں کہ میں نے مصر میں اپنے مشائخ سے سنا کہ امام نسائی کا دن اور رات کا اکثر حصہ عبادت میں گزرتا تھا۔ اکثر سال حج کیا کرتے تھے۔ جہاد کے شوق میں ایک مرتبہ امیر مصر کے ساتھ جہاد میں بھی شرکت کی تھی۔ حضور اکرم ﷺ کی سنت کو ہر معاملے میں پیش نظر رکھا۔ بادشاہوں کی مجالس سے ہمیشہ گریز کیا۔

علما معاصرین کا اعتراف

- ☆ مؤرخ ابن خلکان کہتے ہیں وہ اپنے زمانے میں حدیث کے امام تھے۔
- ☆ ابوسعید عبدالرحمٰن نے لکھا ہے کہ امام نسائی حدیث میں امام، ثقہ، معتبر اور حافظ تھے۔
- ☆ امام دارقطنی کہتے ہیں کہ ابوعبدالرحمٰن نسائی اپنے زمانے کے تمام محدثین سے شیخین کے بعد بلند اور اونچے تھے۔ وہ جرح رواۃ، فن حدیث، فن تنقید اور احتیاط میں اپنے معاصرین سے کہیں فائق تھے۔
- ☆ حافظ ابوعلی نیشاپوری کا قول ہے امام نسائی بغیر کسی تقابل کے حدیث میں امامت کا درجہ رکھتے تھے۔
- ☆ علامہ تاج الدین سبکی لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ حافظ ابوعبداللہ سے سوال کیا کہ آیا امام مسلم بن حجاج حدیث کے زیادہ حافظ ہیں یا امام نسائی تو انہوں نے فرمایا کہ امام نسائی۔

مسلک

حضرت شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ امام نسائی شافعی المسلک تھے۔ نواب صدیق حسن خان نے بھی حضرت شاہ صاحب کی تائید کی ہے اور امام نسائی کو شوافع میں شمار کیا ہے فی الواقع حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک بھی ان کا انتساب مسلک شافعی کی جانب ہے۔

حلیہ شریف

امام نسائی کو اللہ تعالیٰ نے حسنِ سیرت کے ساتھ حسن صورت بھی عطا کیا تھا۔ امام صاحب

بڑے وجیہہ الشکل تھے۔ چہرہ نہایت پرشکوہ اور روشن تھا۔ رنگ نہایت سرخ وسفید تھا۔ یہاں تک کہ بڑھاپے میں بھی حسن وتازگی میں فرق نہیں آیا تھا۔ لباس نہایت نفیس استعمال کرتے تھے۔

تصنیفات

امام صاحب نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ان میں السنن الکبریٰ والصغریٰ، خصائص علی، مسند علی۔ مسند مالک عمل یوم ولیلۃ، اسماء الرواۃ۔

سنن نسائی

امام نسائی کی زیادہ تر شہرت ان کی کتاب السنن کی وجہ سے ہے جو اس عہد کی اکثر کتب حدیث کی تلخیص بیان کی جاتی ہیں۔ اولاً امام موصوف نے ایک ضخیم کتاب حدیث السنن الکبریٰ تالیف کی جس میں صحیح وضعیف ہر قسم کی احادیث درج کی گئی تھیں۔ پھر اس کی ضخامت کو کم کرنے اور صرف صحیح احادیث پر اکتفا کرنے کی خاطر السنن صغریٰ تالیف کی اور اس کا نام المجتبیٰ رکھا۔ صحاح ستہ میں یہی المجتبیٰ یعنی سنن صغریٰ شامل ہے امام نسائی نے اپنی اس سنن میں زندگی کے ہر پہلو سے متعلق چھوٹی چھوٹی جزئیات پر مشتمل احادیث بھی جمع کردی ہیں۔ یہاں تک کہ رکوع وسجود اور دیگر ہر قسم کی دعائیں بکثرت روایات کی ہیں۔ امام نسائی نے حسب دستور کتاب سنن میں ہر نئے مبحث اور عنوان کو کتاب سے موسوم کیا ہے۔ مثلاً کتاب الطہارت جس میں ۲۰۴ ابواب ہیں، کتاب الجنائز میں ۱۲۱، کتاب مناسک الحج میں ۲۳۱، کتاب الزینت میں ۱۲۲ اباب شامل ہیں۔

سنن نسائی میں ایسی کل اکیاون کتابیں (مباحث) ہیں جن میں ۵۷۶۱ حدیثیں جمع کردی گئی ہیں۔ کتب سنن میں مباحث اور احادیث کے اعتبار سے سنن نسائی زیادہ مفصل اور جامع ہے۔ یہ کتاب دہلی، بولاق، قاہرہ اور لکھنؤ میں کئی بار طبع ہوچکی ہے۔

امام نسائی کی شرائط

مقدسی نے امام صاحب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب میں نے کتاب السنن کو جمع کرنے کا ارادہ کیا تو میں نے اللہ تعالیٰ سے ان شیوخ سے روایت کرنے میں استخارہ کیا جن کے متعلق میرے

قلب میں کسی طرح کا شبہ تھا۔ چنانچہ بہتر یہ معلوم ہوا کہ ان سے روایت نہ کروں۔ لہٰذا بہت سی ایسی روایتیں جن کو میں عالی سند سے بیان کرسکتا تھا ان کو اسی وجہ سے سند نازل سے نقل کیا ہے۔

امام نسائی نے بہت سے ایسے رجال جن سے ابوداؤد اور ترمذی روایت کرتے ہیں، اجتناب کیا ہے، بلکہ صحیحین کے بہت سے رجال سے بھی روایت نہیں کی۔ آپ نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ کتاب میں صرف صریح الاسناد روایات ہی کو لیا جائے۔

امام نسائی خود فرماتے ہیں کتاب السنن تمام تر صحیح ہے اور اس کے بعض حصوں میں علت ہے جب کہ مجتبیٰ نامی کتاب مکمل صحیح ہے۔

جب محدثین نے اس کتاب کے رجال کی جانچ پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ تنقید رجال اور صحت اسناد کے بارے میں امام نسائی کی شرائط امام بخاری و مسلم سے بھی زیادہ سخت ہیں۔

تراجم وابواب

کسی محدث کے تفقہ کا اندازہ اس کے تراجم سے لگایا جاسکتا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے کہ فقہ البخاری فی تراجمہ۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اس کے دو مطلب بیان کیے ہیں ایک وہ مسائل فقہ جن کو مصنف نے اختیار کیا ہے وہ تراجم سے ظاہر ہو جائیں گے دوسرا اس سے صاحب کتاب کے تفقہ، ذہانت اور اس کی دقت نظر معلوم ہو جاتی ہے۔ اس حیثیت سے بخاری کے تراجم نہایت اہم ہیں جن کو سمجھنے کے لیے بڑی دِقّت نظر کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ابوعبدالرحمٰن نسائی کے تراجم ابواب ہیں مگر بہت سی جگہوں پر دونوں کتابوں کے تراجم حرفاً حرفاً موافق ہیں۔ ایسی صورت میں توارد پر معمول کرنا مشکل ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ مؤلف نے اس طریق کو اپنے شیخ امام بخاری سے لیا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ سنن نسائی کے تراجم نہایت مہتم بالشان ہیں۔

شرح وتعلیقات

سنن نسائی صحاح ستہ کا رکن عظیم ہے مگر افسوس کہ اس کی تعلیقات کی طرف علما نے وہ توجہ نہیں کی جو دیگر کتب کی طرف کی گئی۔ چھ صدیاں گزرنے کے بعد علامہ جلال الدین سیوطی نے

اس پر تعلیق لکھی اور اس کا نام ''زہر الربی'' رکھا۔ مصنف کی دیگر تعلیقات کی طرح یہ تعلیق بھی بہت سی خوبیوں کی حامل ہے۔ دوسری تعلیق یا حاشیہ محمد بن عبدالھادی متوفی ۱۱۳۸ ہجری کا ہے۔ یہ حاشیہ سیوطی کی تعلیق سے زیادہ مفصل ہے۔ اس میں متن کے ضروری مقامات کا حل اور اعراب کی تحقیق اور الفاظ غریبہ کی تشریح کی گئی ہے۔ یہ حاشیہ ۱۳۵۵ میں قاہرہ سے طبع ہوا۔ مولانا وصی احمد حنفی کانپوری کی بھی اس پر تعلیق ہے۔ اس کے علاوہ صحاح ستہ کے مشہور اردو مترجم وحید الزمان حیدر آبادی نے روض الربی عن ترجمۃ المجتبیٰ کے نام سے سنن نسائی کا اردو ترجمہ کیا۔ مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھولی نے بھی اس پر حاشیہ لکھا۔ (۱۵۰)

سنن ابن ماجہ

مولف: ابن ماجہ

نام ونسب اور ابتدائی حالات

سلسلہ نسب کے لحاظ سے آپ کو ابو عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ الربعی القزوینی کہا جات ہے۔ آپ کی کنیت ابو عبداللہ، نام محمد، القزوینی نسبت اور ابن ماجہ عرف ہے۔ آپ عجمی نژاد تھے۔ آپ کی نسبت الربعی اس لیے ہے کہ وہ عرب قبیلہ ربیعۃ کے مولیٰ تھے۔ اس طرح یہ نسبت نسلی نہیں بلکہ ولا ہے۔ یہ تصریح کہیں نہیں ملتی کہ یہ نسبت ربیعۃ بن نزاد کی طرف ہے یا ربیعۃ الازد کی طرف یا کسی اور قبیلے کی طرف۔

آپ ماجہ کیوں کہلاتے تھے؟ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ماجہ ان کے والد کا لقب تھا۔ القاموس میں ہے کہ ماجہ ان کے والد کا نہیں بلکہ دادا کا لقب تھا لیکن شاہ عبدالعزیز نے اسے غلط قرار دیا ہے۔ آپ نے بستان المحدثین میں اپنی یہ تحقیق درج کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ماجہ ان ک والدہ کا نام ہے۔ ابوالحسن السندی اور مرتضیٰ الزبیدی نے تاج العروس میں بھی یہی لکھا ہے کہ ماجہ محمد کی والدہ کا نام تھا۔

آپ ۲۰۹ ہجری بمطابق ۸۲۴ عیسوی میں پیدا ہوئے اور ۲۲ رمضان المبارک ۲۷۳ ہجری بمطابق ۱۸ فروری ۸۸۶ عیسوی کو جب کہ المعتمد علی اللہ کا عہد خلافت تھا فوت ہوئے۔

آپ کے بچپن کا زمانہ ممالک اسلامیہ میں علوم وفنون کی ترقی کا زمانہ تھا۔ جب وہ بڑے ہوئے تو انہوں نے نبی کریم ﷺ کی احادیث وآثار کو جمع کرنے کے لیے عرب، عراق، شام، مصر او خراسان کے سفر کیے۔ آپ کی یہ ابتدائے علوم دینیہ ۲۳۰ ہجری کے بعد شروع ہوئی۔ اس وقت جاب روایت واسناد کے دفتر کھلے ہوئے تھے اور بڑے زور وشور سے حدیث کے درس جاری ہوتے تھے۔

آپ نے بڑے بڑے علما مثلاً علی بن محمد ابوالحسن طنافسی، عمر بن رافع ابو حجر بجلی، اسماعیل بن ابو سہل قزوینی، ہارون بن موسیٰ تمیمی، محمد بن ابی خالد قزوینی وغیرہ سے استفادہ کیا۔

مؤرخ ابن خلکان کا بیان ہے کہ ابن ماجہ نے تحریر حدیث کے لیے عراق، بصرہ، کوفہ، بغداد، مکہ، شام اور مصر وغیرہ کا سفر کیا۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ امام ابن ماجہ نے خراسان، عراق، حجاز، مصر اور شام کا سفر سماع حدیث کے لیے کیا۔

جس طرح امام ابن ماجہ نے اپنے دور کے جید شیوخ سے فیض علم حاصل کیا اس طرح تاریخ کے ایسے بھی بہت سے جید نام ہیں جو امام ماجہ کے تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں مثلاً علی بن سعید، عبداللہ العسکری، ابراہیم بن دینار، الجرشی ہمدانی، احمد بن ابراہیم قزوینی، ابوطیب احمد بن روح شعرانی، اسحٰق بن محمد قزوینی، جعفر بن ادریس، حسین بن علی، سلیمان بن یزید قزوینی، محمد بن عیسیٰ اصغار، ابوالحسن علی بن ابراہیم بن سلمہ قزوینی، ابوعمرو احمد بن مدنی اصبہانی۔

مسلک

امام صاحب کا مسلک متعین طور پر معلوم نہیں ہو سکا۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک ان کا امام احمد کے مسلک کی طرف میلان تھا مگر مولانا انور شاہ کی تحقیق ہے کہ شائد امام ابن ماجہ شافعی تھے۔ علامہ طاہر جزائری فرماتے ہیں کہ ابن ماجہ علاو آئمہ مجتہدین میں سے کسی کے مقلد نہیں تھے۔ بلکہ ائمہ حدیث امام شافعی، احمد، اسحاق، اور ابوعبید کے قول کی طرف میلان رکھتے تھے یعنی اہل عراق کے مذہب کے مقابل میں اہل حجاز کی طرف زیادہ مائل تھے۔ جس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے بھی ہوتا ہے۔

وفات

حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ میں نے قزوین میں امام ابن ماجہ کی تاریخ کا نسخہ دیکھا تھا جو عہد صحابہ سے لے کر ان کے زمانہ تک رجال اور امصار کے حالات پر مشتمل

ہے۔ اس تاریخ کے آخر میں امام صاحب کے شاگرد جعفر بن ادریس کی یہ تحریر ہے کہ ابوعبداللہ محمد بن یزید نے دوشنبہ کے دن انتقال فرمایا اور شنبہ ۳ رمضان المبارک دوسوتہتر ہجری کو دفن کیے گئے۔ میں نے خود ان سے سنا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں دوسونو ہجری میں پیدا ہوا تھا اس حساب سے وفات کے وقت ان کی عمر چونسٹھ برس تھی۔

تصنیفات

مؤرخین نے امام صاحب کی بہت سے کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً التفسیر والتاریخ والسنن، علامہ سیوطی نے الاتقان میں اس کو تفسیر ابن جریر کی طرز کی تصنیف قرار دیا ہے۔

التاریخ اس کو ابن خلکان نے تاریخ ملیح اور حافظ ابن کثیر نے تاریخ کامل سے تعبیر کیا ہے۔ (۱۵۱)

سنن ابن ماجہ

امام ابن ماجہ کی تمام تصنیفات میں سب سے زیادہ اہمیت اور فضیلت کی حامل کتاب سنن ابن ماجہ ہے۔ اس کتاب کی اہمیت و افادیت پر علما محدثین کا اتفاق ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ ان کی کتاب سنن احکام میں ایک عمدہ کتاب ہے۔

حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ کتاب بہت مفید ہے اور مسائل فقہ کے لحاظ سے اس کی ترتیب نہایت عمدہ ہے۔

خصوصیات

سنن ابی ماجہ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ بہت سی ایسی نادر حدیثوں پر مشتمل ہے جن سے صحاح خمسہ بھی تشنہ ہیں۔ علامہ ابوالحسن فرماتے ہیں کہ مصنف نے بہت سے ابواب میں ایسی حدیثوں کو نقل کیا ہے جو پانچوں مشہور کتابوں میں نہیں ہیں۔

مؤلف نے مختلف شہروں کی مخصوص روایات کی نشان دہی بھی کی ہے۔ مختلف احادیث کے ذیل میں بعض ایسے واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی وجہ سے اس حدیث سے اس عہد

ے مسلمانوں کے تعلق کا پتہ چلتا ہے۔

اس سنن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پانچ ثلاثی حدیثیں بھی ہیں جب کہ امام مسلم و امام نسائی کی سب سے عالی روایات، رباعیات ہیں۔ یہ سنن ابن ماجہ میں بکثرت موجود ہیں۔ یہ پانچوں روایات ایک ہی سند سے مروی ہیں اگرچہ امام ابن ماجہ کے طبقہ کے لحاظ سے بہت عالی ہیں مگر سند کے اعتبار سے ان کا کوئی خاص وزن نہیں ہے۔ حافظ ابوزرعہ نے لکھا ہے کہ آج ہمارے پاس حدیث کی بہت سی کتابیں ہیں جو صحت وقوت اسناد کے لحاظ سے بہت فائق ہیں مگر ان کی وہ مقبولیت نہیں جو سنن ابی ماجہ کو ملی ہے۔ ابن ماجہ خود کہتے ہیں کہ تصنیف کرنے کے بعد میں نے جب یہ کتاب حافظ ابوزرعہ کے سامنے پیش کی تو انہوں نے فرمایا اس میں تیس سے زیادہ ضعیف حدیثیں نہیں ہیں۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ اگر اس میں چند کمزور حدیثیں نہ ہوتیں تو یہ کتاب بہت عمدہ ہوتی۔

صحاح ستہ میں ممتاز

یہ کتاب اپنے حسن ترتیب کی وجہ سے صحاح ستہ میں ممتاز ہے۔ جس خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ احادیث کسی تبویب کی تکرار کے بغیر اس میں ہیں، حدیث کی کسی دوسری کتاب میں نہیں ہے۔ اس کی یہی خوبی دیکھ کر حافظ ابوزرعہ رازی کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے تھے کہ اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی تو فن حدیث کی اکثر جوامع اور تصنیفات بے کار اور معطل ہو کر رہ جائیں گی۔ بقول مولانا نعمانی حافظ زرعہ کی یہ پیش گوئی حرف بحرف سچ ثابت ہوئی اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ حدیث کی بہت سی کتابیں جو صحت اسناد میں روایات کے اعتبار سے اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں وہ اتنا قبول عام حاصل نہ کرسکیں جو سنن ابن ماجہ کو حاصل ہے۔

سنن ابن ماجہ کا صحاح ستہ میں شمار

حافظ ابن السکن نے اسلام کی بنیادی کتابیں چار بتائی ہیں۔ حافظ مندہ نے بھی مخرجین صحاح میں امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد اور امام نسائی کے ذکر پر ہی اکتفا کیا ہے۔ بعد میں ابوطاہر

سلفی نے جامع ترمذی کو بھی مذکورہ بالا چار کتابوں کے ساتھ شمار کیا اور فرمایا کہ ان پانچوں کتابوں پر علما مشرق و مغرب کا اتفاق ہے۔ شیخ بن صلاح اور علامہ نووی نے بھی ان ہی پانچ کتابوں کو تر دی اور انہی کے مصنفین کی وفیات بیان کی ہیں۔ ان بزرگوں نے امام ابن ماجہ کو نظر انداز کیا ہے۔ علامہ نووی نے سنن ابن ماجہ کو بنیادی کتابوں میں داخل نہیں کیا حالانکہ خود مصنف کے عہد میں اور ان کے بعد سنن ابن ماجہ کا چھ بنیادی کتابوں میں شمار ہو چکا تھا۔

سب سے پہلے حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی (۵۰۷ ہجری) ہیں جنھوں نے ابن ماجہ صحاح ستہ میں داخل کیا۔ ان کے بعد تمام مصنفین نے ان کی پیروی کی ہے۔ ان کے بعد حافظ عبدالغنی مقدسی نے اپنی تصنیف ''الاکمال فی اسماء الرجال'' میں چھ کتابوں کے رجال کو یکجا کر دیا اس کے بعد حافظ بن طاہر کے معاصر محدث زرین نے کتاب التجرید للصحاح والسنن میں کتب خمسہ کے ساتھ سنن ابن ماجہ کی بجائے موطا امام مالک کی حدیثوں کو درج کیا۔ اس کے برخ علامہ ابن سعید خلیل بن کلدی العلائی نے سنن داری کو چھٹی کتاب قرار دیا۔ شیخ محمد عابد سندی۔ شیخ علائی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر سنن ابن ماجہ کی بجائے سنن دارمی کو چھٹی کتاب قرار دیا جا زیادہ بہتر ہوگا۔ حافظ ابن حجر نے بھی علامہ علائی کی ہم نوائی کی۔ وہ کہتے ہیں دارمی کی کتاب ر میں ابن ماجہ کی نسبت ارفع ہے۔ محدث عبدالغنی نابلسی نے اپنی کتاب ''ذخائر المواریث فی الدلالۃ علی مواضع الاحادیث'' میں لکھا ہے کہ چھٹی کتاب کے متعلق اختلاف ہے۔ پس اہل مشرق کے نزدیک چھٹی کتاب ابن ماجہ کی سنن ہے اور اہل مغرب کے نزدیک امام مالک کی موطا ہے۔ لیکن علامہ سندی کا فیصلہ ہے کہ عام طور پر علما متاخرین سنن ابن ماجہ کو ہی چھٹی کتاب مانتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ جہاں تک قوت وصحت کا تعلق ہے موطا کا مقام اس سے بلند ہے۔ شاہ و اللہ نے تو صحیحین پر بھی موطا کو ترجیح دی ہے۔ سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شمار کرنے کی وجہ اس افادیت ہے اس میں بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جو موطا میں نہیں ہیں۔ اسی طرح علامہ سیوطی فرماتے ہیں مسند دارمی کی اہمیت جو بھی ہو لیکن صحاح ستہ کی جگہ ایک عرصے سے سنن ابن ماجہ سے پُر ہو چکی ہے۔ (۱۵۲)

تعداد ابواب احادیث

سنن ابن ماجہ میں بتیس کتابیں، پندرہ سو ابواب اور چار ہزار حدیثیں ہیں۔

شروح سنن ابن ماجہ

ابن ماجہ کی اہمیت کے پیش نظر کئی جلیل القدر علما نے اس کی شروح وحواشی لکھے ہیں۔ ذیل میں ایسے آٹھ شروح وحواشی کے نام درج ہیں۔ مثلاً:

۱۔	شرح سنن ابن ماجہ	امام حافظ علاؤ الدین مغلطائی بن قلیج بن عبداللہ
۲۔	شرح سنن ابن ماجہ	ابن رجب زبیری
۳۔	ماتمس الیہ الحاجۃ علی سنن ابن ماجہ	شیخ سراج الدین عمر بن علی بن الملقن
۴۔	مصباح الذجاجۃ شرح سنن ابن ماجہ	علامہ جلال الدین سیوطی
۵۔	شرح سنن ابن ماجہ	ابوالحسن محمد بن عبدالهادی
۶۔	انجاح الحاجۃ بشرح سنن ابن ماجہ	شیخ عبدالغنی بن ابی سعید مجددی دھلوی
۷۔	حاشیہ بر سنن ابن ماجہ	مولانا فخر الحسن گنگوہی
۸۔	مفتاح الحاجہ شرح سنن ابن ماجہ	شیخ محمد علوی

فتنۂ انکارِ حدیث اور مستشرقین

مشترقین سے مراد وہ غیر مسلم یورپین ہیں جو مشرقی علوم میں گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ یقی
مشرقی علوم یا اسلامی علوم کا گہرا مطالعہ رکھنا ہر مسلم اور غیر مسلم کے لیے سعادت کا باعث ہے۔ مگر
غیر مسلم یورپین نے اسلامی اور مشرقی علوم کا گہرا مطالعہ اور اس میں مہارت حاصل کر کے ظلم اور ستم
یہ کیا کہ اسلام کی تاریخ کے حوالے سے انہوں نے اصل تصویر اور حقائق کو منظر سے ہٹا دیا۔

پس منظر

واقعہ یہ ہوا کہ یورپ کے ارباب کلیسا نے اندھے مذہبی جنون کے تحت عالم اسلام کے خلاف صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع کیا۔ دو سو سال کی یہ مہم ناکام رہی۔ فوجی غلبے سے اس محرومی کے بعد یورپ والوں نے فکری اور ثقافتی جنگ کی تدابیر اختیار کیں۔ اسلامی علوم کے مطالعے کے لیے ادارے قائم کیے گئے۔ کلیسا سے تعلق رکھنے والے لوگ اس میدان میں آگے بڑھے۔ اصل مقصد یہ تھا کہ اسلام کے اغراض و مقاصد کے بارے میں بدگمانی پیدا کی جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے علمی تحقیق کے رنگ میں کتاب و سنّت کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا شروع کر دیا اور یہ سب کچھ اس انداز میں کیا گیا کہ مستشرقین اسلام کے ہمدرد نظر آئیں۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مسلمانوں میں جو لوگ مغربی تہذیب کے دلدادہ اور غیر زبانوں سے واجبی واقفیت رکھتے تھے وہ مستشرقین کے افکار و نظریات سے متاثر ہو گئے۔ ان کی علمی صلاحیتوں کے قائل ہونے لگے اور ان سے اخذ و استفادہ کو باعث افتخار سمجھنے لگے۔

گولڈ زیہر

اسلام کے خلاف اس فکری اور ثقافتی محاذ کا سرخیل یہودی مستشرق گولڈ زیہر ہے۔ اس شخص اور اس کے متبعین نے سب سے زیادہ توجہ اس امر پر دی ہے کہ حدیث نبوی کی صحت پر سے لوگوں کا

اعتماد اٹھا دیا جائے۔ چونکہ سیرت نگاری کا مدار بھی احادیث پر ہے اس لیے اس طرح مسلمان خود بخود رسول اللہ ﷺ کی اسوۂ حسنہ سے دور ہٹتے چلے جائیں گے۔ گولڈزیہر نے اس ضمن میں جو فاسد استدلال تیار کیا ہے اس کا نہایت عالمانہ اور مدلل جواب ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے اپنی کتاب ”السنۃ ومکانتہا فی التشریع اسلامی“ میں دیا ہے۔ اس کی تلخیص کو جناب عرفان غازی نے سیارہ ڈائجسٹ کے رسول نمبر میں پیش کیا ہے۔ اسی سے ہم یہاں استفادہ کر رہے ہیں۔

مستشرقین اور حدیث

مستشرقین اور ان کے خوشہ چین مسلمان مفکرین یہ رائے رکھتے ہیں کہ اکثر احادیث نبویہ آغاز اسلام کے عہد کی دستاویز نہیں ہیں۔ اس رائے کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ اسلام کے عصر اول میں بنوامیہ اور علمائے اسلام کے مابین سنگین اختلافات پیدا ہوئے۔ علما نے محسوس کیا کہ ان کے پاس جو احادیث ہیں ان سے مقصد پورا نہیں ہوتا۔ انہوں نے حسب مرضی حدیثیں وضع کرنا شروع کر دیں۔ اپنے دل کو وہ یہ کہہ کر مطمئن کر لیتے تھے کہ یہ حدیثیں الحاد و دہریت کے انحراف کا مقابلہ کرنے کے لیے وضع کی جا رہی ہیں۔ وضع کردہ ان احادیث کی زد بنوامیہ کی روش پر پڑتی تھی۔ چنانچہ حکمرانوں نے جواب میں حدیثیں وضع کرنے کی مہم چلائی۔

یہ عجیب و غریب تحقیق کسی تاریخی بنیاد پر قائم نہیں ہے اور ایک ایسا قیاس ہے، جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ بنوامیہ کے عہد خلافت میں جن علما نے حدیث نبوی کی جمع و تدوین کی خدمات سرانجام دیں ان کے نام یہ ہیں۔ سعید بن مسیبؓ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، عبداللہ بن عبداللہ بن عتبہ، سالم مولیٰ عبداللہ بن عمر، نافع مولیٰ ابن عمر، سلیمان بن یسار، قاسم بن محمد بن ابوبکر، امام زہری عطاء، شعبی، علقمہ، حسن بصری اور دیگر علمائے حدیث۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی بنوامیہ سے بغض و عداوت ثابت نہیں۔ گولڈزیہر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ علمائے مدینہ نے بنوامیہ کی دشمنی میں جھوٹی حدیثیں بیان کیں۔ لیکن تاریخ کہتی ہے کہ اس وقت مکہ، دمشق، کوفہ، بصرہ اور دوسرے اسلامی شہروں میں بھی احادیث نبوی کو جمع کرنے کا کام جاری تھا۔ اگر مدینے میں حدیث وضع ہوتی تو

دوسرے لوگ خاموش نہ رہتے۔ پھر علما پر یہ بہت بڑا بہتان ہے کہ دین کی حفاظت کے لیے جھوٹی حدیثیں روایت کرنا جائز سمجھتے تھے۔ یہ بہتان وہی شخص لگا سکتا ہے جو ان علما کے سوانح اور ان کے اخلاق جلیلہ سے بے خبر ہو۔ یہ الزام ان لوگوں پر لگایا جا رہا ہے جو رسول اللہ ﷺ سے غلط بات منسوب کرنے والے کو واجب القتل قرار دیتے تھے۔ رہی یہ بات کہ اموی خلافت نے اپنے کسی نظریے کی اشاعت کے لیے حدیثیں وضع کی تھیں اس کی بھی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی۔

جہالت یا تحریف؟

گولڈ زیہر نے لکھا ہے کہ اموی خلیفہ اور ان کے پیروکار حدیث کی روایت میں جھوٹ بولنا معمولی بات سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا اور امام زہری جیسے لوگوں کو بھی آلۂ کار بنایا۔ اس دعوے کی دلیل میں گولڈ زیہر نے دو روایات سے دلیل لی ہے۔ ایک یہ کہ ابراہیم بن ولید اموی ایک رسالہ لے کر امام زہری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے سامنے رکھ کر کہنے لگے ”اس میں جو احادیث مندرج ہیں ان کو اس حیثیت سے نقل و روایت کرنے کی اجازت دیجئے کہ میں نے یہ آپ سے سنی ہیں۔ امام زہری نے بغیر کسی لیت ولعل اجازت دے دی اور کہا ”میرے سوا آپ کو کون یہ حدیثیں سنا سکتا ہے“۔ دوسری روایت میں معمر نے زہری سے یہ نہایت اہم فقرہ نقل کیا ہے کہ ”امراء نے ہمیں حدیثیں لکھنے پر مجبور کر دیا“ ان واقعات کو دلیل بنا کر مستشرقین اور دیگر اعدائے سنت نبوی یہ کہتے ہیں کہ امام زہری ارباب حکومت کی خواہشات کی تکمیل کر دیا کرتے تھے۔

اس سے پہلے کہ مستشرقین کی اس بے بنیاد تحقیق کا پول کھولا جائے یہ دیکھ لیجیے کہ حدیث میں امام زہری کا مقام کیا ہے۔ امام مالک، امام ذھبی، حافظ ابن عساکر، عمرو بن دینار، سفیان ثوری، مکحول، یحییٰ بن سعید جیسے جید علمائے حدیث اس امر پر متفق ہیں کہ اس زمانے میں زہری سے بڑھ کر علم حدیث کا کوئی ماہر نہیں تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عہد خلافت میں امام زہری کو حکم دیا کہ آپ حدیث مدوّن کیجیے۔ وہ اولین شخص تھے جنہوں نے حدیث کی روایت میں سند کا

ہتمام کیا۔ آپ نے انسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، جابرؓ اور سہیلؓ جیسے صحابہ سے براہ راست حدیث سنی اور حفوظ کی۔

امام زہری کے علمی دبدبے کا عالم یہ تھا کہ امراء اور خلفاء کو بھی جھڑک دیتے تھے اور وہ آپ کے سامنے دم نہیں مار سکتے تھے کجا کہ وہ امام زہری کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے آمادہ یا ستعمال کرتے۔ ابراہیم بن ولید سے متعلق مذکورہ بالا روایت میں گولڈزیہر اور اس کے ناقلین نے مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو لوگ فن حدیث کی مبادیات سے واقف ہیں انہیں معلوم ہے کہ اخذ حدیث کی ایک قسم کو ''عرض المناولہ'' کہتے ہیں یعنی یہ کہ استاد اپنے شاگرد کو ایک ایسی کتاب دے جو اس نے اپنے شیخ سے سنی ہو اور کہے کہ مجھ سے روایت کیجیے یا شاگرد ایسی کتاب لائے جو اس نے استاد سے سنی ہو اور استاد غور سے دیکھ کر روایت کرنے کی اجازت دے دے۔

ابراہیم بن ولید کے رسالے سے متعلق روایت کا مطلب یہی ہے۔ اس سے یہ مراد لینا نری جہالت ہے کہ ابراہیم نے بذات خود کچھ حدیثیں جمع کر لی تھیں اور پھر زہری نے اس کو اجازت دے دی کہ میرا نام لے کر ان کو روایت کردو۔ امام زہری کا یہ کہنا کہ میرے سوا کون تجھے اس کی اجازت دے سکتا ہے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ زہری اپنے زمانے کے سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ میرے سوا ان کو وضع کرنے کی جرأت کون کرسکتا ہے۔

اب دوسری روایت لیجیے جس میں امام زہری نے کہا ''امراء نے ہمیں حدیثیں لکھنے پر مجبور کردیا''۔ اس روایت کے عربی متن میں کتابۃ احدیث کے الفاظ نقل کیے ہیں۔ لیکن جن مؤرخین نے یہ روایت اصلاً بیان کی ہے۔ ان کے ہاں کتابۃ الاحادیث کے الفاظ ہیں اب یہ گولڈزیہر کی جہالت ہے یا بددیانتی کہ اس الاحادیث سے ''ال'' حذف کردیا۔ عربی زبان سے مانوس حضرات ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اس تحریف سے معانی کہاں کے کہاں پہنچ گئے۔ اس واقعہ پر بھی نظر ڈالیے جہاں سے امام زہری کا یہ فقرہ نقل کیا گیا ہے۔ ابن عساکر اور ابن سعد کے مطابق اصل عبارت یوں تھی کہ زہری لوگوں کو حدیثیں لکھنے سے منع کیا کرتے تھے تاکہ وہ کتابوں کی بجائے اپنی قوت حافظہ پر بھروسہ کریں۔ خلیفۂ وقت ہشام نے اصرار کیا کہ آپ میرے لڑکے کو حدیثیں لکھوائیں۔ زہری

پہلے انکار کرتے رہے آخر مجبور ہو کر چار سو احادیث اس کو املا کرا دیں اور پھر بارگاہ رسالت سے چلتے وقت پکار کر کہا: ''لوگو! ہم تمہیں ایک بات سے منع کیا کرتے تھے۔ اب وہی کام ہمیں ان لوگوں کے لیے کرنا پڑا۔ امراء نے ہمیں کتابت حدیث پر مجبور کر دیا ہے۔ اب آؤ میں تمہیں حدیثیں سنا دوں۔ اس کے بعد چار سو حدیثیں سنا دیں۔ یہ اصل واقعہ تھا اور اس سے یہ مطلب نکال لیا گیا کہ امراء نے زہری کو حدیثیں وضع کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور انہوں نے یہ مطالبہ مان لیا۔

مستند عبارتوں میں تحریف اور الفاظ کو ان کے مواقع سے ہٹا کر بیان کرنا اتنی بڑی خیانت ہے کہ جس شخص کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے اس کی پھر کسی بات کا بھی اعتبار کرنا درست نہیں۔ اسلامی تاریخ اور اس کے ماخذ کو اس طرح مسخ کرنے میں پہل تو مستشرقین نے کی ہے لیکن افسوس ان مسلمان مصنفین پر بھی ہوتا ہے جو اس روش پر ان کی پیروی کرتے ہیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں جہاں دراسات اسلامیہ کے شعبے قائم ہیں۔ تحقیق و تدریس پر عموماً ایسے لوگ فائز ہیں جن کا عربی زبان اور اسلامی علوم سے متعلق علم نہایت سرسری سا ہے۔ ان یونیورسٹیوں میں مسلمان طلباء بھی ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کرنے کے لیے داخل ہوتے ہیں اور وہ ان جیسے ''ناپختہ'' استادوں کی آرا کو حرف آخر سمجھ کر انہیں اسلامی ممالک میں ''نئی تحقیق'' کے عنوان سے پھیلانے کا موجب بنتے ہیں۔ ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی نے اس قسم کے بعض نام نہاد مستشرقین کا خوب تعاقب کیا ہے۔ انہوں نے ۱۹۵۶ میں یورپ کی سیاحت کے دوران ان حضرات سے ملاقاتیں بھی کی ہیں۔ اس زمانے میں ہالینڈ کی لیڈن یونیورسٹی میں مشہور یہودی مستشرق ''شاخت'' سے ملے۔ یہ شخص اسلام کے حقائق کو بگاڑنے کی مہم میں گولڈزیہر کا جانشین ہے اور اسی کی پیروی کرتا ہے۔ ڈاکٹر سباعی نے جب اسے کتابت حدیث کے سلسلے میں امام زہری کے واقعہ میں گولڈزیہر کی تحریف کی طرف توجہ دلائی تو اس نے غلطی تسلیم کی۔ لیکن ساتھ ہی یہ اصرار کرنے لگا کہ گولڈزیہر کے بارے میں بدظن نہیں ہونا چاہیے۔ اس پر ڈاکٹر سباعی نے دوسرے چند مقامات کا ذکر کیا مثلاً یہ کہ گولڈزیہر نے جہاں امام زہری پر وضع حدیث کا الزام لگایا ہے وہاں یہ عجیب و غریب دعویٰ کیا ہے کہ زہری نے عبداللہ بن

زبیر کے خلاف عبدالملک کو خوش کرنے کی غرض سے مسجد اقصیٰ کی فضیلت سے متعلق حدیث وضع کر دی اور تاریخی حقیقت یہ ہے کہ عبدالملک سے امام زہری کی ملاقات حضرت عبداللہ بن زبیر کی شہادت کے سات سال بعد ہوئی تھی۔ ''شاخت'' کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن اس کا اپنا ماخذ علم گولڈزیہر کی تحریفات اور دروغ گوئی سے بھرپور تصانیف کے سوا کچھ نہ تھا۔ تاریخ فقہ اسلامی کے موضوع پر اس کی اپنی کتاب اس قسم کے رطب ویابس کا مجموعہ ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر سباعی نے لندن یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹیل سٹڈیز کے صدر شعبۂ قوانین احوال شخصیہ پر پروفیسر اینڈرسن کا ذکر کیا ہے۔ یہ صاحب اتفاق سے دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں برطانوی فوج کے ملازم کی حیثیت سے مصر میں مقیم رہے۔ وہاں انہوں نے کچھ عام بول چال کی عربی سیکھ لی۔ ایک ازہری عالم سے ہفتہ میں ایک دن سبق بھی لے لیا کرتے تھے۔ یوں عربی زبان اور اسلامی علوم کی کچھ شدبد حاصل ہوگئی اور اس کے بل بوتے پر وہ پروفیسر بن گئے۔ ان کا عالم یہ تھا کہ گولڈزیہر اور ''شاخت'' نے جو کچھ اسلام کے بارے میں لکھ دیا اس سے اختلاف کرنا ممکن نہیں سمجھتا تھا۔ چنانچہ جامعہ ازہر کے ایک فارغ التحصیل طالب علم نے ایک مرتبہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے ''شاخت'' کی تصانیف پر تنقید وتبصرہ کرنا چاہا تو پروفیسر اینڈرسن نے اسے اجازت سے انکار کر دیا۔ کیمبرج یونیورسٹی کے اساتذہ نے بھی اس موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی اجازت نہیں دی۔ ان حضرات کا کہنا تھا کہ ''شاخت'' کی کتابیں تنقید سے بالاتر ہیں۔

اسلام دشمنی کے اسباب

دراصل ہوا یہ کہ صلیبی لڑائیوں کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد سے مغربی طاقتیں اسلام اور اہل اسلام سے انتقام لینے کے طریقے سوچتی رہی ہیں۔ اس ضمن میں ان کا پہلا اور غالباً کامیاب ترین حربہ یہی ثابت ہوا ہے کہ اسلامی علوم کے مطالعہ اور تدریس کا نام لے کر مسلمانوں کے عقائد و معاشرت میں نقب لگائی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اس دوران چند افراد ایسے بھی پیدا ہوئے جنہوں نے علمی تحقیق کا حق ادا کیا لیکن بحیثیت مجموعی مستشرقین کا گروہ راست گوئی سے محروم رہا۔

اس کا پہلا سبب، بقول ڈاکٹر سباعی، یورپ کے فوجی و سیاسی لیڈروں کا مذہبی جنون تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں جب اتحادی فوجیں بیت المقدس میں داخل ہوئیں تو لارڈ ایلنبی نے اپنا مشہور فقرہ کہا۔

> ”فوجی اعتبار سے گو اب صلیبی جنگیں ختم ہو گئی ہیں مگر یورپی لوگ دین اسلام اور اس کی تہذیب کے بارے میں تحریراً جن خیالات کا اظہار کریں گے ان میں تعصب کے اثرات ہمیشہ باقی رہیں گے۔“

دوسرا سبب یہ ہے کہ گزشتہ دو صدیوں کی سائنسی اور مادی ترقی نے یورپی علما اور مؤرخین کو مغرور بنا دیا ہے۔ ان کو گمان ہو گیا ہے کہ مغرب والوں کی عقل بڑی نکتہ رس ہے اور منطقی انداز میں فہم و ادراک کی بے نظیر صلاحیت رکھتی ہے جبکہ باقی اقوام کی عقل موٹی ہے۔ چنانچہ مشہور مستشرق ”گب“ کا کہنا ہے کہ ”اہل اسلام جزئیات کے واسطے سے امور و اشیا کا ادراک کرتے ہیں براہ راست کلیات کے ادراک سے وہ قاصر ہیں“۔

ادھر جب محکوم اور کمزور مسلمان ممالک کا مغربی تہذیب سے تعلق استوار ہوا تو مغربی تعلیم یافتہ طبقے کا اپنے قدیم ورثے سے ناطہ ٹوٹ گیا۔ وجہ یہ تھی کہ ہمارا علمی ورثہ تو سیاسی انتشار کے ساتھ ساتھ منتشر اور غیر منظم ہو چکا تھا۔ قدیم کتابوں میں وہ نظم و ترتیب نظر نہ آتی تھی جو مغربی علما کا طرۂ امتیاز ہے۔ چنانچہ اب ہم اپنے ورثے تک بھی غیروں کی وساطت ہی سے پہنچ سکتے تھے۔ مستشرقین نے بظاہر جس محنت اور ذوق و شوق کے ساتھ ہماری تہذیب اور ثقافت پر گفتگو کی اس نے مغرب زدہ طبقے کو خیرہ کر دیا۔ اس کا سہرا دراصل مستشرقین کے اسلوب نگارش پہ تھا۔ لیکن ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس فریب میں مبتلا ہو گیا کہ مستشرقین کا علم ہی نہایت وسیع ہے۔ اس دھوکے میں وہ ان کی تصانیف سے بکثرت اقتباسات پیش کرنے لگے اور اس غلط فہمی میں رہے کہ ان کی ہر بات صحیح ہے اور جہاں انہوں نے اسلام کی مسلمہ حقیقتوں کی خلاف ورزی کی ہے وہاں بھی ان کی رائے قرین مصلحت ہے۔ بھلا علمی تحقیق کی راہ پر چلنے والے غلط فہمی کا شکار کیسے ہوں گے۔ بد قسمتی سے ہمارا یہ مغرب زدہ طبقہ اسلامی علوم کے مآخذ سے براہ راست استفادہ کر ہی نہ سکا۔ ورنہ ان پر یہ حقیقت جلد آشکار ہو جاتی کہ علمی تحقیق اور دیانت کا دعویٰ کرنے والے یہ نام نہاد علما و فضلا کس

قدر جاہل اور بدنیت واقع ہوئے ہیں۔

تاریخ اسلام کے بارے میں عموماً اور سیرت نبوی کے معاملے میں خصوصاً یورپی مستشرقین کی غلط بیانی کا بڑا سبب تو ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہی ہے لیکن اس کی چند وجوہ اور بھی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں مستند روایات کے تحت منقول ہیں۔ مستشرقین کی اکثریت اس سرمائے سے قطعاً نابلد ہے۔ وہ اپنا مواد زیادہ تر متاخرین کی ان کتب سیرت سے اخذ کرتے ہیں جو بالعموم ضعیف روایات اور واعظوں کی داستانوں پر مبنی ہیں۔ یورپی مصنفین ان کتابوں کے اس سقم کو پہچاننے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے کیوں کہ وہ کسی قول یا واقعہ کو نقل کرتے وقت راوی کے کردار پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ راوی صادق ہے یا کاذب۔ اس کے اخلاق و عادات کیسے ہیں؟ اس کا حافظہ کیسا ہے؟ وہ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے کسی موضوع پر پہلے سے جو ایک مفروضہ اپنے دماغ میں پکا رکھا تھا اس کی تائید ہوتی ہے یا نہیں۔ گویا ان کا طریقہ تحقیق مسلمان مؤرخوں کے سائنسی طریقوں کے بالکل برعکس ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ روایت پر نظر ڈالنے سے پہلے اسماء الرجال کے دفتر تحقیقات کو کھنگالا جائے۔ اگر راوی کا نام ثقہ لوگوں کی فہرست میں درج ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ اس کا بیان بالکل ناقابل اعتنا ہے خواہ قرائن سے درست ہی نظر آتا ہو۔ اسی طرح ایک ثقہ اور صادق راوی کی روایت بظاہر عقل کے خلاف بھی نظر آئے تو وہ قبول کر لی جائے گی۔ بشرطیکہ محدثین کے مقرر کردہ اصول درایت پر وہ روایت پوری اترتی ہو۔ پھر جن مستشرقین کو احساس ہوا کہ اسلامی علوم کی عمارت کو ضعیف روایات اور بودے استدلال کے ذریعے گزند نہیں پہنچایا جا سکتا تو انہوں نے اس کی بنیاد پر ہی ضرب لگا دی۔

مستشرقین کی اسلام دشمنی پر ایک دیانت وارانہ تبصرہ ایک مشہور مستشرق موسیو گستاف لیبان نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

''قاری یہ پوچھ سکتا ہے کہ جب مغربی علما فکر و نظر کی حریت کو بے حد اہمیت دیتے ہیں تو وہ آخر مغرب پر اسلامی تہذیب کی اثر آفرینی سے کیوں انکار کرتے ہیں؟ یہ سوال میں خود اپنے قلب و ضمیر

سے بھی کرتا ہوں اور میرے خیال میں اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ ہے کہ جو فکری آزادی ہمیں حاصل ہوئی ہے وہ ظاہری حد تک ہی ہے۔ بہت سی باتوں میں ہم بدستور غلام چلے آرہے ہیں۔

حق بات یہ ہے کہ محمد ﷺ کئی صدیوں تک یورپ کے حق میں اس کے دوسرے سب دشمنوں سے زیادہ مہیب اور خطرناک بنے رہے۔ اہل اسلام جب ہمیں اپنے اسلحہ سے خوف زدہ نہ کر سکے جیسے کہ شارلیمان اور صلیبی جنگوں کے زمانے میں ہوا تو اپنی تہذیب و ثقافت کی برتری کے بل بوتے پر ہمیں رسوا کرنے لگے۔ قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے بعد وہ ہمیں برابر مرعوب کرتے رہے۔ اب ہم نے اگرچہ ان کی اثر و اقتدار سے رہائی حاصل کر لی۔ تاہم مسلمانوں کے خلاف ہمارے توہمات میں صدیوں سے جو اضافہ ہو رہا تھا اب وہ ہمارے مزاج کا جزو بن گئے ہیں۔ ہماری رگ رگ میں اسلام سے دشمنی اس طرح بس گئی ہے جس طرح نصاریٰ سے یہود کی عداوت پوشیدہ بھی تھی اور گہری بھی۔

مسلمانوں کے خلاف جو توہمات ہمیں ورثہ میں ملے تھے ان پر ہم اس وہم کا بھی اضافہ کر لیں جو ہماری عداوت پسند کتابی تہذیب کے طفیل دن بدن ترقی پذیر رہا تو یہ حقیقت بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ہم یورپی تہذیب پر اسلام کے اثرات سے کیوں انکار کرتے رہے۔ ہماری کتابی تہذیب نے تو ہمیں یہ سبق پڑھایا ہے کہ ماضی میں صرف یونانی اور لاطینی زبانیں ہی علوم و فنون کا مرکز و محور تھیں۔ مغرب کے فضلا کو یہ اعتراف کرتے وقت بڑی عار محسوس ہوتی ہے کہ مسیحی یورپ کو قعر جہالت سے نکالنے کا سہرا تو ان ”کفار“ کے سر ہے۔ واقعی یہ عار کی بات ہے چنانچہ اس حقیقت کو کیونکر تسلیم کیا جا سکتا تھا؟

مندرجہ بالا اقتباس میں موسیو لیبان نے خود ہی مستشرقین کی نفسیاتی کمزوری کی نشاندہی کر دی ہے۔ چنانچہ اسلام کے بارے میں نام نہاد تحقیق کرنے والے غیر مسلم علما کے اندازِ نظر میں یہ کجی ہر جگہ جھلکتی نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں ایک قابل غور بات یہ بھی ہے کہ غیر مسلم علمی اداروں میں خصوصاً عیسائی مشنری مراکز یا اشتراکی اکادمیوں میں جہاں دراسات اسلامیہ کے شعبے قائم ہیں وہاں اسی انداز نظر سے کام ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے نتائج تحقیق کا مطالعہ کرتے وقت مسلمانوں

کو ان کے مزاج و مقاصد کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ہم اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ اشتراکی نظام اور نظریات پر جو تحقیق سرمایہ دار ممالک میں ہوتی ہے، اس کا مقصد اشتراکیت کی بیخ کنی ہے۔ اسی طرح اشتراکی اداروں میں سرمایہ دارانہ نظام کی تاریخ اور معاشرت پر جو تحقیق کی جاتی ہے اس کا مقصد اس نظام کے خلاف محاذ آرائی ہے۔ لیکن غیر مسلم مستشرقین اسلامی علوم و آداب پر جو رائے زنی کرتے ہیں اس کو ہم بغیر سوچے سمجھے خلوص پر مبنی تصور کر لیتے ہیں۔ جدید مستشرقین جن میں ڈاکٹر ولفریڈ کینٹویل اسمتھ، گب اور ہٹی جیسے نام مشہور ہیں، اسلام اور مسلمانوں کے ہمدرد بن کر اپنی نام نہاد تحقیق ہمارے مغرب زدہ طبقے کے سامنے پیش کرتے ہیں اور یہ طبقہ اسلامی مصادر علم سے اپنی بے خبری کے باعث ان مستشرقین کے اس ادعائے خلوص اور ہمدردی کو قبول کر لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سیرت النبی ﷺ اور سنت نبوی ﷺ کے باب میں بعض مسلمان مفکرین بھی گمراہی کی راہ پر چل پڑے ہیں۔ وہ بھی ”تحقیق جدید“ کی رو میں بہہ کر رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور آپ کے مشن کو انہیں پیمانوں سے ناپنے لگ گئے ہیں جو کسی عام سیاسی یا معاشرتی یا معاشی مفکر اور مصلح کی سوانح کے مطالعے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ (۱۵۳)

برصغیر میں علم حدیث

تاریخ شاہد ہے کہ پیغمبر اسلام حضور اکرم ﷺ سے تعلیم و تربیت پانے کے بعد صحابہ اور ان کے شاگرد تابعین مزید ان کے شاگرد تبع تابعین دنیا کے جس خطے میں بھی گئے قرآن و حدیث ان کے ساتھ ساتھ گیا۔ ابتدائی دور سے لے کر موجودہ زمانہ تک ہر عہد میں علوم قرآن اور علوم حدیث مسلمان علما کی توجہ کا خاص مرکز رہے۔

برصغیر پاک و ہند نے ہمارے اساسی علوم کے اس شعبہ یعنی علم حدیث کی خدمت میں کیا کردار ادا کیا؟ ناموافق حالات اور جغرافیائی مشکلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں علم حدیث پر جس قدر بھی کام ہوا ہے بہر حال وہ قابل تحسین اور قابل ستائش ہے۔

جہاں تک احادیث کی جمع و تدوین کا تعلق ہے تو اس ضمن میں سرزمین ہند کو ایک بنیادی

مشکل یہ پیش آئی کہ یہ خطہ اس ملک سے بہت دور ہے جہاں رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے، زندگی بسر کی اور وفات پائی۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث جب مختلف مجموعوں کی شکل میں مرتب کی گئیں تو ان کے راویوں اور رجال میں کوئی ہندی نہیں تھا۔ کتب صحاح اور حدیث سے متعلق دوسری تصانیف عرب، ایران اور خراسان میں مرتب کی گئیں۔ ہزاروں راویوں میں سے صرف دو یا تین اشخاص ایسے تھے جن کا براہ راست یا بالواسطہ برصغیر پاک و ہند سے کوئی تعلق تھا۔ ان میں سے ایک ابو حفص بن ربیع ہیں جو تبع تابعین میں سے تھے اور قابل اعتماد راوی ہیں، وہ سندھ آ گئے تھے اور ۱۶۰ ہجری (۷۷۶ عیسوی) میں وفات پائی۔ ایک مستند روایت کے مطابق وہ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے ایک کتاب لکھی۔ لیکن نہ تو ان کی یہ کتاب موجود ہے اور نہ یہ معلوم ہے کہ وہ کس موضوع پر تھی۔ صرف گمان غالب ہے کہ یہ کتاب حدیث کے متعلق تھی۔ دوسرے شخص ابو معشر ہیں جو ام موسیٰ کے مؤلد تھے۔ یہ بھی راوی حدیث تھے۔ ممکن ہے کہ ان لوگوں کے علاوہ بھی چند اشخاص ابتدائی دور کے ان مسلمان عربوں میں ہوں جو مسلمانوں کی فتح سندھ کے زمانہ میں آئے تھے مگر ان کے بارے میں کوئی بات قطعی طور پر معلوم نہیں ہے۔

بہر حال ہند میں علوم حدیث پر مشتمل بہت سی کتابیں لکھی گئیں، ان میں درج ذیل مشہور ہیں

۱۔ کتب صحاح اور دوسری کتابوں کی شرحیں۔

۲۔ سابقہ مجموعوں کی ترتیب و تہذیب۔

۳۔ علوم حدیث کی فرہنگ۔

۴۔ اربعون (چالیس حدیثوں کے مجموعے)

۵۔ نئے طریق پر مشتمل نئے مجموعے۔

۶۔ ان احادیث کے مجموعے جو کسی خاص مسئلہ یا اشکال سے متعلق ہیں۔

۷۔ تاویلات اسرار حدیث یا روح حدیث۔

۸۔ علم اصول حدیث۔

۹۔ اسماء الرجال۔

۱۰۔ تاریخ حدیث

اعتراف حقیقت

برصغیر پاک وہند میں حدیث رسول ﷺ کی طرف جو خاص توجہ کی گئی اس کا اعتراف مصر کے جلیل القدر عالم صاحب المنار علامہ رشید رضا نے اس طرح کیا ہے۔

’’اگر علوم حدیث کی جانب ہمارے ہندی علما کی توجہ والتفات مبذول نہ ہوتی تو اسلام کی شرقی علاقوں میں (خدانخواستہ) حدیث کا خاتمہ ہی ہو چکا ہوتا۔ کیونکہ دسویں صدی ہجری میں مصروشام، عراق وحجاز سب ہی جگہ علمی زوال انتہا کو پہنچ چکا تھا‘‘۔ (۱۵۴)

تاریخی حقائق

تاریخ سے واقفیت رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ تاتار کے دلدوز معاملے کے بعد ندوستان کی جانب جن علما کے قدم اٹھ کھڑے ہوئے تھے ان ہی میں وہ اہل کمال بھی تھے جو حدیث کی گراں مایہ متاع کو اپنے دامن میں لے کر ہندوستان کی فضا کو منور کرنے کا منصوبہ رکھتے تھے۔ فیروز شاہی نے اپنی تاریخ کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے:

’’طعون چنگیز خان کے حادثے سے دل شکستہ ہوکر ہندوستان میں اہل علم آئے اور پھر یہ لما کی آمد کا سلسلہ بڑھتا رہا یہاں تک کہ سرزمین ہند علم وکمال اور دین ودانش کی روشنیوں سے جگمگانے لگی۔ کہا تو یہی جاتا ہے کہ ہندوستان حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے حدیث کے چرچوں سے ناآشنا تھا۔ یہ تاریخ سے نہایت ہی افسوس ناک قسم کی ناواقفیت ہے جسے ہم بجا ور پر ہندوستان کی علمی تاریخ کا المیہ ہی قرار دے سکتے ہیں۔ اگر تھوڑی سی زحمت کر کے تاریخ کے ریچوں سے حقیقتوں کا تجسس وتلاش کی جائے تو حضرت شاہ ولی صاحب سے پہلے بلکہ بہت پہلے ملک حدیث سے اس درجہ واقف ہو چکا تھا کہ یہاں حافظ قرآن کی طرح حافظ حدیث بھی موجود تھے۔ ’’یادایام‘‘ میں مولانا عبدالمالک عباسی کے متعلق بتایا گیا ہے کہ صحیح بخاری ان کو زبانی یاد تھی۔ بخاری کا درس ہمیشہ زبانی دیتے تھے۔ تذکرۂ علماء ہند میں بابا داؤد مشکواتی کے حالات میں یہ بھی جود ہے۔ فقہ، حدیث، تفسیر اور حکمت ومعانی میں کمال رکھتے تھے اور مشکوٰۃ شریف کے حافظ

تھے۔ اس وجہ سے ان کا لقب مشکواتی ہو گیا۔ (۱۵۵)

غرضیکہ یہ ایک بہت بڑا پروپیگنڈہ ہے کہ ہندوستان حضرت شاہ ولی اللہ سے پہلے حدیث سے نا آشنا رہا۔ حالانکہ حقیقت صرف یہی نہیں کہ یہاں شاہ صاحب سے پہلے حدیث سے واقفیت تھی بلکہ یہاں بخاری شریف اور مشکوۃ شریف کے حافظ بھی تھے اور حدیث کی ابتدائی کتاب "مشارق الانوار" صدیوں ہندوستان کی اساسی کتاب قرار دے کر پڑھی اور پڑھائی جاتی رہی ہے۔ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء نے اپنے متعلق لکھا ہے کہ "مشارق الانوار" ان کے یہاں زیر درس رہی اور سلطان جی نے اپنے معروف خلفا کو اس کی باقاعدہ تعلیم دے کر ان خ کو ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلا دیا۔ بلکہ اس ہندوستان میں حدیث کی اہم شروح بھی لکھی جا چکی تھی۔ خود حضرت شیخ عبدالحق محدث اور ان کے صاحب زادے مولانا نور الحق صاحب بخاری شریف، مشکوۃ شریف کی شرحات بالترتیب عربی اور فارسی میں لکھ چکے تھے۔

قرآن کے بعد سرزمین ہند کی ذہنی، دماغی اور علمی وفکری وابستگی اگر کسی عنوان سے معروف ہے تو وہ علم حدیث ہے۔

شروح صحاح ستہ

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ جغرافیائی مشکلات کے باعث حدیث کی جمع وتدوین میں اس سرزمین کا کردار اتنا ارفع نہیں ہے مگر شرح حدیث میں یہ خطہ ارضی اپنی بہت درخشندہ اور تابندہ تاریخ رکھتا ہے، برصغیر پاک وہند میں کتب صحاح اور دوسری مستند کتابوں پر بڑی تعداد میں شروح وحواشی لکھے گئے۔ جن میں سے چند کا تذکرہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

۱۔ لمعات التنقیح علیٰ مشکوۃ المصابیح از عبدالحق دہلوی

اس کتاب کے مصنف عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ ہجری۔ ۱۶۴۲ عیسوی) ہند کے مشہور ترین علما میں سے ہیں۔ وہ اپنے زمانے کے ممتاز محدث تھے اور پاک وہند میں علم وحدیث کو فروغ دینے میں ایک خاص محترم مقام کے حامل ہیں۔ انہوں نے مشکوۃ شریف کی شرح لکھی جو کہ بہت

ہت ضخیم اور گراں قدر ہے۔ اس میں لسانی توضیحات، نحوی باریکیاں، فقہی مسائل، احادیث سے تعلق سلسلہ روایات، اصول استنباط اور روایان حدیث کے نام و القاب کا صحیح تلفظ جیسے اہم وضوعات شامل ہیں۔ کتاب کے مقدمے میں ہی مصنف نے احادیث کی تمام قسموں کو واضح کر یا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ کسی ایک حدیث پر مختلف حیثیتوں سے غور ہو سکتا ہے۔ موضوع کے تبار سے یا تو وہ قول ہوتی ہے یا فعل۔ اگر فعل ہے تو وہ مرفوع ہو سکتی ہے اگر سلسلۂ روایا نحضرت ﷺ تک پہنچتا ہے، یا موقوف ہے اگر سلسلۂ روایات صرف صحابہ تک پہنچتا ہے، یا قطوع ہے اگر سلسلۂ روایات صرف تبع تابعین تک جا پہنچتا ہے اور اس سے آگے نہیں۔

صحت کے اعتبار سے حدیث یا تو صحیح ہوتی ہے یا حسن یا ضعیف۔ اگر کسی حدیث کو ہر عہد ں راویوں کی کثیر تعداد نے بیان کیا ہے تو وہ متواتر ہے ورنہ حاد۔ مزید تقسیم کے اعتبار سے یا تو وہ شہور ہے یا عزیز یا غریب۔ اس مقدمہ کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہند میں شکوٰۃ کے جتنے ایڈیشن شائع ہوتے ہیں ان سب میں یہ مقدمہ شامل کیا جاتا ہے۔

۱۔ الحاشیہ علیٰ صحیح بخاری، از ابوالحسن سندھی

یہ کتاب ابوالحسن سندھی (۱۱۳۸ ہجری۔ ۱۷۲۷ عیسوی) نے لکھی ہے۔ وہ سندھ کے ایک صبہ ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے تھے۔ یہاں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مدینہ منورہ چلے گئے اور وہیں ستقل سکونت اختیار کر لی۔ مدینہ منورہ میں وہ ایک عالم اور شارح کی حیثیت سے بہت مشہور وئے۔ انہوں نے صحاح ستہ کی تمام کتب پر حاشیے لکھے۔ مذکورہ کتاب میں صحیح بخاری کے مشکل فاظ اور فقروں کی وضاحت کے لیے مختلف نوٹ لکھے گئے ہیں اور مختلف ابواب کے عنوانات کی ضاحت بھی کی گئی ہے۔

۲۔ المسوّیٰ از شاہ ولی اللہ

یہ موطا امام مالک کی شرح ہے جس کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے تصنیف کیا۔ اس ں ہر حدیث کے بعد اس سے متعلق مختلف علما کی تاویلات پر عالمانہ تنقید کر کے اس کی توضیح کی گئی

ہے۔ فاضل شرح نویس نے موطا کی تمام احادیث اس طرح مرتب کی ہیں کہ ان سے استفا کرنے میں سہولت ہو۔ ہر ایک باب میں شافعی اور حنفی دونوں مذاہب کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ موطا میں شامل تمام احادیث میں جن احکام کا ذکر ہے ان کی تائید میں قرآنی آیات بھی لکھی گئی ہیں۔ یہ شرح عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھی گئی ہے۔

۴۔ شرح تراجم ابواب بخاری۔ از شاہ ولی اللہ

اس کتاب میں شاہ ولی اللہ نے صحیح بخاری کے مختلف ابواب کے عنوانات کی عالمانہ تشر کی ہے۔ اس شرح کی خوبی یہ ہے کہ کثیر اور منتشر مواد میں سے معتبر اور مفید حصوں کو منتخب کر کے ا کو ایک کتاب کی شکل دے دی گئی ہے۔ مصنف نے ان بعض اصولوں کا بھی ذکر کیا ہے جو البخاری کے عنوانات میں ملحوظ رکھے گئے ہیں مثلاً بعض جگہ بخاری بطور عنوان ایک حدیث لکھتے ہیں ۔ حالانکہ یہ ان اصولوں کے مطابق نہیں ہوتی جو راوی کا ثقہ ہونے کا فیصلہ کرنے کے لیے انہو نے مقرر کیے ہیں اور اس کے بعد وہ اس حدیث کی تائید میں ایک اور حدیث لکھتے ہیں جو سند لیے ان کے مقرر کیے ہوئے معیار کے مطابق ہوتی ہے۔

بعض جگہ وہ سلف میں سے کسی عالم کا مذہب بطور عنوان درج کرتے ہیں اور پھر ایس حدیثیں بیان کرتے ہیں جن سے یہ مذہب حق بجانب قرار پائے۔ بعض اوقات ان کا استنباط قطع نہیں ہوتا اس لیے وہ بطور عنوان یہ لکھتے ہیں باب من قال کذا۔

بعض اوقات وہ ایک اختلافی مسئلہ کو عنوان کے طور پر لکھتے ہیں اور اس کے بعد اس کے متعلق سب متضاد حدیثیں بیان کر دیتے ہیں تاکہ فقیہ جس طرح چاہے فیصلہ کر سکے۔

بعض اوقات وہ متعدد حدیثیں بیان کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے مطابق عنوانات قائم کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ایک اور حدیث بیان کرتے ہیں جس کے مفہوم سے عنوان سے اخذ کردہ مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔

بعض جگہ وہ باب کی اصطلاح قول المحدثین کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔

۔ المحلی از سلام اللہ

یہ موطا کی ایک شرح ہے جو کہ سلام اللہ (۱۱۲۹ ہجری۔ ۱۷۱۶ عیسوی) نے لکھی ہے۔ کتاب
شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں فن حدیث کی باریکیاں بیان کی گئی ہیں۔ اس میں امام
کے مختصر حالات زندگی بھی درج ہیں اور موطا پر ایک تنقید بھی قلم بند کی گئی ہے۔ اس میں مشکل
لفظ کی وضاحت کے ساتھ فقہی مسائل پر بھی بحث کی گئی ہے۔

۔ المواہب الطیفۃ از محمد عابد سندھی

یہ امام حنیفہ کی مسند کی شرح ہے، جو محمد عابد سندھی (متوفی ۱۲۵۷ ہجری۔ ۱۸۴۱ عیسوی)
لکھی ہے۔ مصنف سندھ کے ایک عالم ہیں۔ ان کی یہ تصنیف اپنی نوعیت کی ایک منفرد تصنیف
۔ مسند ابوحنیفہ میں درج حدیث کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے ایسی تمام حدیثیں درج کر
ہیں جن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ فقہ کے اختلافی مسائل پر انہوں نے حنفی مسلک کی حمایت
ہے۔

تہ کتب کی ترتیب و تہذیب

۔ شارق الانوار النبویہ من صحاح الاخبار المصطفویہ از حسن بن حسن صغانی لاہوری

اس کتاب کے مصنف حسن بن حسن صغانی کے والد صغان سے ہجرت کر کے لاہور آگئے
۔ ۵۷۷ ہجری۔ ۱۱۷۴ عیسوی) میں بغداد صغانی اسی شہر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد
حاصل کی۔ ۶۱۵ ہجری (۱۲۳۹ عیسوی) میں بغداد چلے گئے۔ دو سال بعد عباسی خلیفہ نے ان کو
کے دربار میں اپنا ایلچی بنا کر دہلی بھیج دیا۔ وہ یہاں سات برس قیام کر کے واپس بغداد چلے
۔ اس کے بعد خلیفہ کے ایلچی کی حیثیت سے دوبارہ ہندوستان آئے۔ آپ ایک ممتاز محدث
او۔ ہر لسانیات تھے۔ علم حدیث سے آپ کی گہری وابستگی تھی۔

صغانی نے اس کتاب میں ان احادیث کو نئے انداز میں مرتب کیا ہے جو صحیحین میں سے
یک یا دونوں میں شامل کی گئی ہیں۔ اس ترتیب و تہذیب میں احادیث ابتدائی الفاظ کے

اعتبار سے باقاعدہ طور پر منقسم اور مرتب کی گئی ہیں مثلاً باب اول میں وہ احادیث ہیں جو موصولہ ا استفہامی ضمیر ''من'' سے شروع ہوتی ہیں۔ باب دوم میں وہ احادیث ہیں جو کلمہ ''ان'' سے شرو ہوتی ہیں۔ باب سوم میں وہ احادیث ہیں جو حرف نفی ''لا'' سے شروع ہوتی ہیں۔ باب چہارم م وہ احادیث ہیں جو لفظ ''اذا'' یا ''اذ'' سے شروع ہوتی ہیں۔

۲۔ کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال از علی متقی برہانپوری

اس کتاب کے مصنف علی متقی برہانپوری ۸۸۵ ہجری (۱۴۸۰ عیسوی) میں برہان پور م پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے کثرت سے کتابیں لکھیں۔ اس کتاب میں مصنف نے سیوطی کی ج الجوامع کی تمام حدیثوں کو مختلف عنوانات کے تحت مرتب کیا اور یہ ترتیب فقہ کی ترتیب کے مطا رکھی۔ پوری کتاب کو چند حصوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر حصہ کا نام کتاب رکھا۔ حروف تہجی کے لحا سے ان کو ترتیب دیا ہے۔ پہلا حصہ یا کتاب غایۃ الکمال پر مشتمل ہے جو کئی ابواب میں منقسم ہے دوسرے حصے یا کتاب کے تحت مستدرک کو شامل کیا گیا ہے۔ غایۃ الکمال سے پہلے منہاج اور ا کے بعد اکمال کو شامل کیا ہے۔ یہ دونوں الگ الگ کتاب کے تحت نہیں بلکہ کتاب کے ذیلی ابوا کے تحت شامل کی گئی ہیں۔ حیدر آباد دکن میں کنز العمال آٹھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس فہرست مضامین بھی بہت سہولت بخش ہے اور سب احادیث پر نمبر لگا دیے گئے ہیں۔ اس کتا میں احادیث کی تعداد ۴۶۱۸۰ ہے۔ حدیث کے مطالعہ اور حوالے کے لیے بہت مفید اور ا کتاب ہے۔ مصنف کے استاد ابوالحسن البکری کہا کرتے تھے کہ سیوطی نے الجوامع مرتب کر ساری دنیا کو ممنون کیا اور علی متقی نے اس کو دوبارہ مرتب کر کے خود سیوطی کو ممنون کر دیا۔

۳۔ مسند امام اعظم (مسند ابی حنیفہ) از محمد عابد سندھی

اس مسند کو رسائل فقہ کے عنوانات کے مطابق محمد عابد سندھی نے مرتب کیا تھا۔ اور انہو نے امام اعظم کی ان احادیث کو مرتب کیا ہے جو صدر الدین موسیٰ الحسکفی کے ذریعہ پہنچی ہیں۔

لغت حدیث

مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل ولطائف الاخبار از محمد طاہر پٹنی

یہ فرہنگ حدیث محمد طاہر پٹنی نے مرتب کی ہے۔ وہ ۹۱۴ ہجری (۱۵۰۸ عیسوی) میں گجرات میں پیدا ہوئے جو اب پٹن کہلاتا ہے۔ محمد طاہر نے ہند میں اپنی تعلیم مکمل کی اور تیس سال کی عمر میں حجاز چلے گئے۔ جہاں سے انہوں نے مشہور علما سے تحصیل علم کیا۔ یہ کتاب حدیث اور رآن دونوں کی بہت جامع فرہنگ ہے۔ اس میں الفاظ مصادر کے حروف کے اعتبار سے مرتب کیے گئے ہیں۔ احادیث میں جو الفاظ مرتب کیے گئے ہیں ان کے مصادر اور تمام مشتقات اس رہنگ میں موجود ہیں اور جن احادیث میں یہ الفاظ آئے ہیں ان کا متن بھی درج کر دیا ہے۔ محمد اہر نے الفاظ کے معنی لکھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ متعلقہ حدیث کے بارے میں وضاحت طلب ات کی تشریح بھی کی ہے۔

ربعین: از شاہ ولی اللہ

آنحضرت ﷺ کی ایک حدیث ہے کہ جو میرے امتیوں کے لیے دین سے متعلق چالیس دیثیں جمع کرے گا اس کا حشر اللہ تعالیٰ علمائے دین کے ساتھ کرے گا اور قیامت کے دن میں ان شفاعت کروں گا۔ چنانچہ اس حدیث کی تعمیل میں بیرون ہند کثیر تعداد میں اربعین مرتب کی ئیں۔ ہند میں ایسے جو مجموعے مرتب ہوئے ان میں شاہ ولی اللہ کا مرتب کیا ہوا مجموعہ قابل ذکر ہے۔ اس انتخاب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل سب احادیث مستند ہیں اور نحضرت ﷺ سے لے کر مرتب تک مسلسل روایات کی گئی ہیں۔ مرتب نے یہ احادیث اپنے تاد ابو طاہر مدنی سے سنیں اور انہوں نے اپنے والد سے اس طرح یہ سلسلہ اوپر تک جاتا ہے اور تاب میں یہ سلسلہ مکمل درج کیا گیا ہے۔

درالثمین فی مبشرات النبی الامین: از شاہ ولی اللہ

یہ بھی چالیس احادیث کا مجموعہ ہے جو شاہ صاحب نے مرتب کیا ہے اور ان کا یہ بیان ہے

کہ یہ احادیث انہوں نے آنحضرت ﷺ سے خواب میں سنیں، یہاں شاہ صاحب نے یہ حدیثیں تین حصوں میں تقسیم کی ہیں۔

۱۔ جو رسول ﷺ سے انہوں نے سنیں۔

۲۔ جو انہوں نے ایک وسیلہ سے سنیں۔

۳۔ جو انہوں نے ایک سے زیادہ روایوں سے سنیں۔

نوادر من الحدیث: از شاہ ولی اللہ

یہ مجموعہ بھی شاہ ولی اللہ کا مرتب کردہ ہے اگرچہ اس کا شمار بھی نادر قسم کے مجموعوں میں ہوت ہے۔ مگر نوعیت کے اعتبار سے یہ مجموعہ مذکور بالا سے مختلف ہے۔ علم کے دوسرے شعبوں مثلاً ادب تاریخ، طب وغیرہ کے نوادر کی طرح یہ بھی ایک نادر مجموعہ ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ: از شاہ ولی اللہ

یہ شاہ ولی اللہ کی مشہور ترین تصنیف ہے۔ احادیث کی معقولی اور تنقیدی تشریحات اس کتاب کی امتیازی خصوصیت ہیں۔ مصنف کی اسی تصنیف پر ان کو ''غزالی ہند'' کا لقب دیا گیا ہے۔ پاک و ہند میں تو اسی کتاب کو احیاء العلوم پر بھی فوقیت دی جاتی ہے۔

اس تصنیف کے آغاز میں شاہ ولی اللہ نے یہ واضح کیا ہے کہ اسلامی علوم کی اساس علم الحدیث ہے۔ جس کا تعلق پیغمبر اسلام کے اقوال و افعال سے ہے۔ اس علم کے کئی شعبے ہیں جن میں علم الاسرار سب سے اہم ہے۔ اس تصنیف کی تہہ میں یہ اصول کارفرما ہے کہ اسلام کا ہر ایک دینی حکم بہت معقول ہے اور افادی نقطہ نظر سے اس کو حق بجانب ثابت کیا جا سکتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ جب یہ ثابت ہو جائے کہ کوئی حدیث مستند اور معتبر ہے تو اس کے مطابق ہدایات پر انسان کا عمل اس امر پر منحصر نہ ہو کہ اس حدیث کی افادیت خود اس پر واضح ہو جائے کیوں کہ ہر شخص میں ایک بات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس لیے ہمیں اپنی سمجھ سے زیادہ اپنے پیغمبر پر اعتماد کرنا چاہیے۔

ایسی متعدد احادیث کی وضاحت کے لیے جن کی کوئی اور توجیح نہیں ہو سکتی، شاہ ولی اللہ نے

تیسرے عالم کے وجود کو تسلیم کیا ہے، جو عالم مثال کہلاتا ہے اور جو مادی اور روحانی دنیاؤں کے درمیان واقع ہے۔ اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس عالم میں جو شے بھی موجود ہے اس کا مماثل اسی درمیانی عالم یعنی عالم مثال میں موجود ہے۔

یہ کتاب دو بڑے حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلا حصہ دین کے اوامر ونواہی کی افادیت سے مستند ہونے کے عام اصولوں سے متعلق ہے۔ یہ حصہ بھی سات مباحث میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ہر بحث کے تحت کئی باب قائم کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں تمام مذہبی احکام وہدایات کی عقلی توجیح وتشریح کی گئی ہے۔ (۱۵۶)

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ پاک وہند میں خدمت حدیث سے متعلق شاہ صاحب کا کردار خاصا نمایاں اور قابل ذکر وقدر ہے۔

حدیث اور دکن

ہندوستان میں ۹۰ ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک دکن میں برابر سلاطین اسلام حکمران رہے ہیں۔ ان میں سے سلطان محمود شاہ نے سب سے پہلے محدثین کے وظائف مقرر کیے اور اشاعت حدیث کی ترغیب دلائی۔ اس وقت سے لے کر اب تک دکن میں کون کون محدث ہوئے یہ بحث بہت طویل اور تفصیل طلب ہے۔ یہاں مختصر تذکرہ صرف ان حضرات کا کیا جاتا ہے جو سلطان المحدثین مشہور ہوئے۔ جن کی تصانیف کو محدثین عرب وعجم نے سر آنکھوں پر رکھا اور جن کے سامنے مدنی ومکی محدثین نے زانوئے ادب تہہ کیے۔

سید عبدالاول حسینی۔ ان کے والد قصبہ زید پور (متصل جونپور) کے باشندے تھے نقل سکونت کر کے دکن میں آ گئے تھے۔ سید صاحب دکن ہی میں پیدا ہوئے۔ صحیح بخاری کی شرح فیض الباری لکھی اور سفر السعادت فیروز آبادی کا خلاصہ کیا۔

شیخ طیب۔ یہ اصل باشندے سندھ کے تھے۔ بعد میں دکن آ گئے تھے۔ وہ سید عبدالاول کے شاگرد تھے۔ انہوں نے پچاس برس تک برہانپور میں حدیث کا درس دیا۔

شیخ عبدالوہاب متقی۔ یہ شیخ علی متقی کے شاگرد تھے اور برہانپور میں خدمت حدیث

کرتے رہے۔

شیخ محمد فضل اللہ۔ یہ اصل میں جون پور سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ علی متقی کے شاگرد تھے۔ ان کا لقب نائب رسول تھا۔ برہان پور میں سکونت اختیار کی اور وہیں درس حدیث دیتے رہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی، نے فتح الملہم کے نام سے صحیح مسلم کی شرح لکھی تو نظام دکن نے ان کی پوری امداد کی۔ اس طرح ہندوستان ہی میں مولانا خلیل احمد سہارن پوری نے سنن ابی داؤد کی شرح لکھی جو بہت ستائش کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ ترمذی شریف کی شرح مفتی عبداللطیف صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے تصنیف کی۔ مفتی صاحب بجنور سے تعلق رکھتے تھے مگر انہوں نے حیدر آباد دکن میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ (۱۵۷)

علم حدیث اور شاہ ولی اللہ

حدیث کی باقاعدہ تدوین کا کام حضور اکرم ﷺ کی وفات کے کہیں تین سو سال بعد مکمل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث اپنے اسانید کے اختلاف کی بنا پر مختلف اقسام میں تقسیم ہو گئیں، مثلاً مستفیض، حسن، مرسل وغیرہ۔ احادیث کے اس اختلاف کا ایک صریح نتیجہ امت کا ان کی بابت شک وشبہ میں مبتلا ہو جانا تھا۔ جس نے آگے چل کر ان کو بہ اعتبار صحت اور شواہد جانچنے کے لیے علم الاسناد کی بنیاد رکھی۔

آنحضرت ﷺ کو نہ تو ہم نے دیکھا ہے اور نہ ہی بلاواسطہ آپ سے کچھ سنا ہے۔ اس لیے شریعت کی بقا کا مسئلہ بڑی حد تک خود سند کی بقا پر منحصر ہے۔ اب جو شخص حد درجہ سچا اور ضبط سے کام لینے والا نہیں اس کی بات کو وزن نہیں حاصل ہو سکتا۔ پس وہ کتاب جو اپنی اصل کے لحاظ سے صحیح نہیں اور نہ اس کی اصل کی صحت کا اعتبار ہے ظاہر ہے وہ کسی بھی طور پر قابل اعتماد قرار نہیں دی جائے گی۔

روایت کی زیادتی سے اکثر ان کے معانی ومفاہیم میں اختلاف پیدا ہو جانے کا بڑا احتمال رہتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک اور خوف بھی ہر لحظہ دامن گیر رہتا ہے کہ راوی کوئی غلط روایت تو نہیں منسوب کر رہا ہے۔

۸۶ ہجری میں جب اموی خلیفہ ولید نے عمر بن عبدالعزیزؒ کو مدینہ منورہ کا حاکم مقرر کیا تو انہوں نے علمائے مدینہ کو جمع کر کے احادیث کو نقل کرنے کی داغ بیل ڈالی۔ اس وقت تک امت مسلمہ کے پاس قرآن مجید کے ماسوا کوئی دوسری قانونی کتاب موجود نہیں تھی۔

یہ اور اس طرح کے دیگر بے شمار حقائق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے شاہ ولی اللہؒ کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے احادیث کی درجہ بندی فرما دی ہے۔ درجۂ اول میں وہ تمام احادیث شمار کی گئیں

ہیں جنہیں ناقدین حدیث نے باتفاق رائے کلیۃً صحیح قرار دیا ہے اور کوئی اعتراض قائم نہیں کیا ہے۔ انہیں فقہا نے بھی بطور سند استعمال کرنے میں کوئی تعرض نہیں کیا ہے۔ ان احادیث کی تین قابل ذکر کتب یہ ہیں۔ اول (شاہ صاحب کے نزدیک) موطا، دوم صحیح بخاری اور سوم صحیح مسلم۔

درجہ دوم کی ذیل میں جامع ترمذی، سنن ابی داؤد اور سنن نسائی شمار کی جاتی ہیں۔ یہ درجہ اول سے کافی قریب ہیں۔

درجہ سوم میں ان تمام احادیث کا شمار ہوتا ہے جنہیں علما اسلاف نے بیان تو کیا ہے لیکن ان کی صحت کا کوئی التزام نہیں رکھا ہے۔

درجہ چہارم ان احادیث پر مشتمل ہے جن کا دور اولین میں تو کہیں نام ونشان بھی نہیں ملتا۔ لیکن متاخرین نے ضرور روایت کیا ہے لہٰذا یہ قابل اعتماد اور معتبر نہیں۔

نتیجتاً یہ ضروری ہے کہ احادیث کی جانچ پڑتال اور چھان بین کے لیے جو معیار مقرر کیا جائے اس میں درجہ اول اور دوم کے تحت آنے والی احادیث (یعنی موطا، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی میں موجود) کے ماسوا درجہ سوم اور چہارم کی احادیث کو لائق اعتبار نہ سمجھا جائے۔ ہر چند کہ وہ اپنے لیے قوی تر اسناد ہی کیوں نہ رکھتی ہوں۔ اس کی اہمیت کچھ یوں اور بھی دو چند ہو جاتی ہے کہ اگر تمام احادیث کو لائق التفات سمجھا گیا تو ان سے بڑے اختلافات کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ علما حدیث کے نزدیک اس طبقے کی احادیث سے استدلال کرنا درست نہیں۔

باقی رہا سنن ابن ماجہ کا علمی درجہ تو اس ضمن میں محقق فقہا کا رویہ یہ ہے کہ وہ ہر حدیث جس میں کتاب منفرد ہے اگر موضوع نہیں تو ضعیف ضرور ہے۔

مندرجہ بالا چھ کتب کے علاوہ بھی احادیث کی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ رطب ویابس اور حشو وزوائد سے بھری پڑی ہیں اور ان کی روایات شاہ ولی اللہ کے نزدیک حجت نہیں ہیں۔

احادیث کی اس درجہ بندی نیز محققین اور غیر محققین کے مابین ایک واضح امتیاز قائم کر کے شاہ صاحب نے علم حدیث کے قالب میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ورنہ صورت تو یہ تھی کہ احادیث کے بارے میں شیخ الاسلام ابن حجر اور سیوطی کے عہد ہی سے اہل علم پر ایک غیر محققانہ

طریقہ غالب چلا آ رہا تھا۔ شاہ صاحب کی طرز بحث اور زاویہ فکر نے اس غیر محققانہ طریقہ کے مزید پھلنے پھولنے کے مواقع یکسر ختم کر دیے۔

من جملہ دیگر کارہائے گراں مایہ کے شاہ صاحب کا یہ کارنامہ واقعی قابل ذکر ہے کہ آپ نے ان تمام ناہمواریوں اور کمزوریوں کو دور کرنے کی حتی الامکان سعی فرمائی جو علم حدیث کے مطالعے اور اس کی تحقیق کے سلسلے میں عام طور پر اہل علم کے درمیان جڑ پکڑ چکی تھی۔ (۱۵۸)

شاہ صاحب نے جن اصول وقواعد سے احادیث کی درجہ بندی فرمائی ہے ان کی روشنی میں احادیث میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ اگر کوئی اختلاف نظر آتا بھی ہے تو اسے نہایت آسانی سے رفع کیا جا سکتا ہے۔ ایسے اختلافات کو مٹانے میں شاہ صاحب کو ید طولیٰ حاصل تھا اور اس ضمن میں جو کارہائے نمایاں آپ نے سرانجام دیے ہیں، اسے یہ امت کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

ایک بات کو دوسری بات پر ترجیح دینے سے ظن کو بلاشبہ فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن ان دونوں کے مابین تطبیق پیدا کرنے سے قطعی علم حاصل ہوتا ہے اس فن میں شاہ صاحب لاثانی تھے۔

مختلف احادیث میں شاہ صاحب نے جس کمال مہارت اور خوش اسلوبی سے تطبیق فرمائی ہے اس کی مثال درج ذیل ہے۔ اس کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب کو علم حدیث میں کس قدر تجرِ علمی حاصل تھا۔

حدیث کے ضمن میں آپ کا بصیرت افروز مشورہ یہ ہے کہ احادیث کی مشہور معروف کتاب کا مطالعہ از بس ضروری ہے مثلاً موطا، صحیحین، سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی کیوں کہ ان کی صحت مستند ہے، قابل اعتراض نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علم حدیث کی جو خدمت شاہ ولی اللہ نے کی ہے اس کے لیے برصغیر آپ کا ہمیشہ مرہون منت رہے گا۔

اصول حدیث

☆ اصول حدیث کا معنی ومفہوم
☆ اصول حدیث کا آغاز وارتقاء اور غرض وغائیت
☆ اصول روایت
☆ اصول درایت
☆ اقسام حدیث
☆ خبر واحد اور اس کی حجیت
☆ حدیث مشہور
☆ عزیز
☆ غریب
☆ مقبول
☆ مردود
☆ ضعیف
☆ المعلق
☆ مرسل
☆ المعضل
☆ المنقطع
☆ المدلّس
☆ موضوع
☆ المتروک
☆ المنکر
☆ معروف
☆ مرفوع
☆ الموقوف

اصول حدیث

اصول حدیث کا معنی ومفہوم

اصول کے لغوی معنی ایسی جڑ اور بنیاد کے ہیں جس پر کوئی چیز قائم ہو۔ جب اس لفظ کا علم حدیث پر اطلاق کیا جائے تو مطلب ہوگا کہ وہ جڑ بنیاد جس پر علم حدیث قائم ہے یا جس پر اس کی عمارت اٹھائی گئی ہے۔ اسے علم مصطلح الحدیث اور علم احادیث اور علم روایت ودرایت بھی کہتے ہیں۔

اصول حدیث-آغاز وارتقا اور غرض وغایت

قدیم زمانے میں علم حدیث کی تحصیل کا ذریعہ روایت تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو صحابہ سن کر یاد رکھتے اور پھر دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ پھر صحابہ سے تابعین اور ان سے تبع تابعین نے سن کر حدیث روایت کی۔ بعض اوقات ایک صحابی سے حدیث سن کر دوسرا صحابی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اس حدیث کی تصدیق کراتا۔

سماع الحدیث (حدیث کو سننا) ضروری تھا یہاں تک طلبہ اکثر دور دراز کا سفر اسی غرض سے کیا کرتے تھے کہ ان لوگوں کے درس میں شرکت کر سکیں جنہیں علم حدیث کے ماہرین مانا جاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے بہت سے اقوال میں ''رحلة'' فی طلب العلم (یعنی تحصیل علم میں سفر کرنے) کی تاکید آئی ہے۔ کیونکہ یہ کام اللہ کو پسند ہے اور اس کا اجر عظیم بھی ہے۔

روایت کے دوران میں استاد حدیثوں کو زبانی بیان کرتا تھا۔ یہ بھی ایک عام طریقہ تھا کہ اس کا شاگرد کسی روایت کی نقل کو پڑھ کر سناتا تھا اور دوسرے شاگرد سنتے رہتے تھے اور جو کچھ پڑھا جاتا تھا اس میں بوقت ضرورت استاد اصلاح کرتا جاتا تھا اور تشریحی حواشی لکھوا دیتا تھا۔ اس صورت میں جو حدیثیں اس طرح سیکھی جاتی تھیں ان کے متعلق یہ کہنے کا دستور تھا کہ فلاں شخص (یعنی استاد) نے مجھے بتایا۔ (حدثنی یا اخبرنی قراءة علیہ یعنی جب حدیث اس کے سامنے پڑھی

گئی)۔ وہ شخص جس نے اس طرح استاد کی نگرانی میں حدیثیں سنیں ہوں اس کے بعد خود دوبار دوسروں کے سامنے انہیں روایت کرسکتا تھا۔ کیونکہ اکثر اسے اس کام کے لیے اپنے استاد سے ایک ''اجازہ'' یعنی منظوری یا اجازت نامہ مل جاتا تھا۔ لیکن حدیث کی نقل و روایت کا قدیم طریقہ بعد میں بدل گیا اور تحریری متون کا نقل کر لینا یا ان کا باہمی مقابلہ کرنا عام طور پر طلبا حدیث کا مقص اوّلین بن گیا اور زبانی روایت کا دستور رفتہ رفتہ متروک ہو گیا۔ اب حدیثوں کو صرف نقل کرا جاتا تھا اور اس بات کی اجازت حاصل کر لی جاتی تھی کہ انہیں مروجہ الفاظ ''حدثنی'' (یعنی فلاں فلاں نے مجھے بتایا) کے ساتھ روایت کیا جاسکے۔ گویا کہ حدیث کے مضامین براہ راست استا سے زبانی حاصل کیے گئے تھے۔

بعض حلقوں میں کتابۃ الحدیث یعنی احادیث کا قلمبند کرنا شروع میں ممنوع سمجھا جاتا تھ اور صرف ان حدیثوں کو تسلیم کیا جاتا تھا جو معتبر آدمیوں کے حافظے میں محفوظ رہی ہوں اور جنہیں انہوں نے زبانی روایت کیا ہو۔ ان متون کو قبول نہیں کیا جاتا تھا جنہیں اکثر بغیر کافی احتیاط کے غیر معتبر یادداشتوں سے نقل کر لیا گیا ہو۔ ابن عساکر کی یہ تنبیہہ کہ ''حدیثوں کو حاصل کرنے کی خوب کوشش کرو مگر انہیں رجال (آدمیوں) سے حاصل کرو نہ کہ تحریری یادداشتوں سے، مبادا ان میں تحریف متن کی کمزوری آجائے۔ تاہم ایسے علما کا ذکر جو کاغذ اور کتاب سے بالکل اجتناب کرتے ہوں ہمیشہ محض بطور مستثنیات کیا جاتا ہے اور حدیث کو ضبط تحریر میں لانے کا دستور بہت قدیم زمانے میں بھی عام تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس ضمن میں یقیناً یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ کتابت حافظے کے معاون کا کام دیتی تھی اور یہ علم دراصل دل میں محفوظ رکھنے کے لیے بھی تھا اور کاغذ پر قلم بند کرنے کے لیے بھی۔ سیرت نبوی کے جو واقعات قلم بند کیے گئے ان کی باقاعدہ ابتد تقریباً نبوت کے سو برس کے بعد ہوئی۔ اس لیے ان مصنفین کا ماخذ کوئی کتاب نہیں تھیں بلکہ اکثر زبانی روایات تھیں۔

اس قسم کا موقع جب دوسری قوموں کو پیش آتا ہے یعنی کسی زمانہ کے حالات اگر کچھ عرصے کے بعد قلم بند کیے جائیں تو اس میں ہر قسم کی افواہیں اور کہی ان کہی باتیں بھی شامل کر لی جاتی ہیں،

جن کے راویوں کا نام ونشان تک معلوم نہیں ہوتا۔ ان افواہوں اور کہی ان کہی باتوں میں سے وہ واقعات بھی انتخاب کر لیے جاتے ہیں جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں مگر تھوڑی دیر بعد یہی خرافات ایک دلچسپ کہانی بن جاتی ہیں۔

ابتدا میں جب تک حدیث کی باقاعدہ تدوین نہیں ہوئی تھی تو جو کچھ حدیثیں تھیں وہ زیادہ طور پر زبانوں پر تھیں اور اس طرح ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ اس سے منافقوں اور دشمنان اسلام کو احادیث وضع کرنے کا موقع ہاتھ میں آ گیا۔ ان لوگوں نے مسلمانوں میں اختلاط اور ارتباط پیدا کر کے احادیث موضوعہ کی نشر و اشاعت شروع کر دی اور اس طرح اسلام نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

یہ تھی وہ غرض و غایت جس کی بنا پر اصول حدیث نے جنم لیا کہ کچھ ایسے ثقہ اور مسلمہ اصول وضع کیے جائیں جن کے اطلاق سے سچی اور جھوٹی حدیث میں فرق اور امتیاز پیدا ہو جائے کھرا اور کھوٹا الگ ہو جائے۔

یہ تھا وہ مقصد جس پر خود اور ساری امت کو عمل پیرا کرنے کے لیے صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین اور پھر دوسرے لاکھوں محدثین نے امانت حدیث کو صاف اور شفاف انداز میں ہم تک پہنچانے کا اہتمام کیا، تدوین حدیث کا آغاز کیا اور احادیث کو جمع کر کے ایک مدوّن صورت عطا کی۔ لیکن بے حد و حساب مرتبہ خراج تحسین کہ ان حضرات نے اس امانت کو پوری دیانت داری کے ساتھ بلا خیانت پہنچایا اور کوشش کی کہ اس میں رائی برابر بھی بد دیانتی یا خیانت نہ ہو۔ حالانکہ حدیث کے امینوں کو اس راستے میں ڈاکو بھی پڑے۔ انہوں نے اس سرمائے کو لوٹنا بھی چاہا لیکن یہ [illegible] ان ڈاکوؤں سے مرعوب نہیں ہوئے۔ ان کے سامنے ہتھیار پھینک کر اس سرمائے کو ان کی جھولی میں نہیں ڈال دیا بلکہ ہر طرح سے ان کے ساتھ ٹکر لی۔ ان کے منہ بھی توڑے، ہر مصیبت، [illegible]، تکلیف اور مشقت بھی برداشت کی، فاقے بھی برداشت کیے یہاں تک کہ اپنی زندگیاں بھی قربان کر دیں لیکن اپنے پیارے نبی ﷺ کے ارشادات کے سرمائے میں خیانت نہیں ہونے دی۔

وجہ یہ تھی کہ یہ ارشادات کسی عام آدمی کے ارشادات نہیں تھے۔ یہ ارشادات قرآن حکیم کی

تفصیل وتشریح تھی۔ ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت تھی۔ اس پر عمل پیرا ہونے میں ہر بشر کی نجا
تھی۔ یہ ہر بھٹکے ہوئے انسان کے لیے شمع ہدایت تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ اس امانت کو پو
تحقیق اور چھان پھٹک اور پاکیزگی کے ساتھ آگے منتقل کیا جائے۔ یہ وہ مقصد تھا جس کے
اصول حدیث کا آغاز اور اطلاق ہوا۔

صحابہ کرام کے عہد سے لے کر تدوین حدیث کی تکمیل کے دور تک اس دو صدی کے عر
میں وضع حدیث کی بیخ کنی اور وضاعین حدیث کی سرکوبی کے سلسلہ میں علما اور محدثین نے جو
مؤقف اختیار کیا ہے، جو شخص بھی بنظر غائر اس کا مطالعہ کرے گا، ان کی مساعی اور کاوشوں کا جا
لے گا وہ یہ فیصلہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ ناقدین حدیث جو کچھ کر گزرے ہیں اس سے زیاد
امکان بھی نہیں ہے اور نقد وجرح کے جو طریقے انہوں نے اختیار کیے ہیں وہ علمی تحقیق (سائنٹیف
ریسرچ) اور تنقید و تنقیح کے معیار پر سب سے زیادہ محکم اور قابل وثوق طریقے ہیں۔ یہاں تک
ہم پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے علما کو اس روئے زمین پر بسنے والی تمام قوموں میں
اخبار و روایات کو جانچنے اور پرکھنے کے دقیق علمی اصول وقواعد تجویز کرنے کے سلسلے میں اوّلیت کا
درجہ حاصل ہے۔ ان کی کاوشوں اور کوششوں پر ہماری آئندہ نسلیں بجا طور پر فخر کر سکتی ہیں۔

روایت حدیث میں حزم واحتیاط

روایت حدیث کے بارے میں صحابہ کرام کے حزم واحتیاط کا یہ عالم تھا کہ وہ حالات کو اس نت تک بیان نہیں کرتے تھے جب تک کہ ان کے پاس آخری راوی سے لے کر چشم دید گواہ تک سلسل کے ساتھ روایت موجود نہ ہو یعنی جو واقعہ لیا جائے وہ اس شخص کی زبانی ہو جو خود شریک قعہ رہا ہو، اگر وہ خود شریک واقعہ نہیں تھا تو اس واقعے تک تمام درمیانی راویوں کے نام ترتیب کے ساتھ بیان کیے جائیں اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم کیا جائے کہ وہ کون لوگ تھے؟ ان کے مشاغل کیا تھے؟ ان کا کردار کیا تھا؟ ان کی سمجھ کیسی تھی، ثقہ کہاں تک تھے، سطحی الذہن تھے یا نقطہ رس؟ عالم تھے جاہل؟ ان تمام جزئی باتوں کا پتہ چلانا نہایت دشوار تھا۔ لیکن محدثین نے اس کام کے لیے اپنی مریں وقف کر دیں اور ان تحقیقات سے اسماء الرجال کا ایک بے مثل فن ایجاد کیا جس کی بدولت اویوں کے سب حالات معلوم ہو سکتے ہیں اگر کسی راوی پر کذب، تہمت، بدعت، عقیدت یا افظے کی کمزوری وغیرہ کا الزام دیکھا تو محدثین نے بلا تکلف اس کو مجروح اور اس کی روایت کو رد کرنے کے قابل قرار دے دیا۔

ابتداء میں صحابہ کرام جب ایک دوسرے کو نبی ﷺ کی کوئی حدیث سناتے تو قطعاً اس کی صدیق کی ضرورت محسوس نہ کرتے کہ یہ حدیث سنانے والے نے از خود زبان نبوی سے سنی ہے یا سی دوسرے صحابی سے سن کر روایت کی ہے مگر جب وضع حدیث کا دور شروع ہوا تو ضرورت حسوس کی جانے لگی کہ اس وقت تک کوئی حدیث قبول نہ کی جائے جب تک کہ اس کے راوی کی ثقاہت اور عدالت کا یقین نہ ہو جائے۔

روایت کے لیے عمومی معیار

راوی معروف الحال ہو۔

۲۔ راوی صادق القول اور دیانتدار ہو۔

۳۔ بات کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

۴۔ اس کا حافظہ اچھا ہو۔

۵۔ اسے مبالغہ کرنے یا خلاصہ نکال کر بیان کرنے یا روایت میں کسی اور طرح تصرف کرنے عادت نہ ہو۔

۶۔ روایت کردہ بیان سے راوی کا کوئی اپنا ذاتی تعلق نہ ہو جس کی وجہ سے یہ خیال کیا جا سکے اس کی روایت متاثر ہو سکتی ہے۔

۷۔ دو اوپر نیچے کے راویوں کا آپس میں ملنا، زمانہ یا حالات کے لحاظ سے قابل تسلیم ہو۔

۸۔ روایت کی تمام کڑیاں محفوظ ہوں اور کسی راوی کا اوپر سے نیچے یا نیچے سے اوپر خلا نہ ہو۔

روایت حدیث کے اسی معیار کو برقرار رکھنے کے لیے محدثین نے اصول درایت اور روایت قائم کیے۔ ان اصول روایت و درایت کی بنیاد خود قرآن مجید نے قائم کی ہے اور حکم دیا ہے کہ روایت کی چھان بین کر لیا کرو۔ ارشاد ہے: ان جآئکم فاسق بنبا فتبینوا۔ (سورۂ الحجرات۔ ۶)

اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے اور کوئی روایت بیان کرے تو اس کی خوب اچھی طرح چھان بین کر لیا کرو۔

اس میں کسی بات کو روایت و درایت دونوں جہتوں سے اچھی طرح پرکھنے کی ہدایت موجود ہے۔

اصول درایت

اصول درایت میں محدثین نے بتایا کہ بعض شرائط کی عدم تکمیل سے روایت مجروح ہو جاتی ہے اور قابل اعتبار نہیں رہتی۔

اس اصول کی ابتدا خود صحابہ کرام کے عہد میں ہو چکی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہؓ نے سول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے ایک حدیث بیان کی جس کا حاصل تھا کہ ”آگ سے پکی ئی چیز کے کھانے سے وضو دوبارہ کرنا چاہیے“ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ سنا تو کہا ”اگر یہ یح ہے تو آگ پر پکے ہوئے پانی سے بھی وضو ٹوٹ جانا چاہیے“، یاد رہے حضرت ابن عباس ضرت ابو ہریرہؓ کو ضعیف الروایہ نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن چونکہ ان کی روایت درایت کے خلاف تھی س لیے انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا اور یہ سمجھے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کو سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہے

روایت کے اصول میں ایک یہ بھی ہے کہ جو روایت کتاب اللہ یا رسول اللہ ﷺ کی کسی مشہور سنت ے خلاف ہو اسے قبول نہیں کرنا چاہیے۔ صحابہ کرام کا اس پر بھی تعامل تھا اور وہ ایسی روایت کو صحیح لیم نہیں کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے سامنے ایک عورت نے کوئی حدیث بیان کی۔ آپ نے اس کو تسلیم کرنے ے انکار کر دیا کہ ہم ایک عورت کے کہنے پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو نہیں چھوڑ سکتے۔

یک حدیث ہے کہ میت کو اس کے پسماندگان کے نوحہ کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا۔ حضرت ئشہؓ نے یہ حدیث سنی تو اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ یہ قرآن مجید کے حکم **لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِزْرَ اُخْرٰی** ۔ (سورہ الانعام۔ ۱۶۵) (اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں ٹھائے گا) کے خلاف ہے۔

ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہؓ نے روایت بیان کی کہ برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اسے دھو

لینا چاہیے۔ حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ نے یہ سنا تو فرمایا "اچھا پھر برتن کا کیا ہوگا؟" ان دونو بزرگوں کا مطلب یہ تھا کہ کہ اگر ہاتھ کو دھوئے بغیر پانی میں ڈال دینے سے پانی ناپاک ہو جاتا ہے تو اس کی وجہ سے برتن بھی ناپاک ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ اس میں بڑا حرج ہے پس ایسا حکم ایک اصل رفع الحرج کے خلاف ہے اور اس لیے اس کی صحت پر اعتبار کرنا مشکل ہے۔

درایت کے اصول

تدوین حدیث کا دور آیا اور اس کی صحت وغیرہ کے اصول وضوابط متعین کیے گئے تو محدثین نے درایت کے اصول بھی منضبط کیے۔ علامہ سمعانی فرماتے ہیں:

"صحیح کی پہچان صرف یہی نہیں ہے کہ اس کو ثقہ راویوں نے بیان کیا ہو بلکہ فہم معرفت اور کثرت سماع اور مذاکرہ سے بھی اس کو پہچانا جاتا ہے"۔

شیخ ابوالحسن الشیرازی لکھتے ہیں کہ وہ امور جن کی وجہ سے اگر کسی خبر کو ثقہ نے بھی بیان کیا ہو تب بھی اسے رد کر دیا جاتا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ جو روایات مقتضیات عقلی کے خلاف ہوں تو ان کا باطل ہونا معلوم ہے کیونکہ شر تو مجوزات عقل کے مطابق ہے نہ کہ اس کے خلاف۔

۲۔ جو روایت کتاب اللہ کی کسی نص یا سنت متواترہ کے خلاف ہو تو سمجھا جائے گا کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے یا وہ منسوخ ہے۔

۳۔ جو روایت اجماع کے خلاف ہو وہ بھی قابل قبول نہیں۔

۴۔ ایک ہی شخص تنہا کوئی ایسی روایت بیان کرے جس کا علم تمام لوگوں کو ہونا ضروری ہو۔

۵۔ راوی تنہا ایسی روایت بیان کرے جس کو عادتاً اہل تواتر کے ذریعہ مروی ہونا چاہیے۔

فتح المغیث میں ہے کہ حدیث کا موضوع ہونا کبھی الفاظ کی عدم فصاحت سے بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے آنحضرت ﷺ افصح العرب والعجم تھے۔

علامہ ابن جوزی نے انہی اصول درابت کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔

ابن جوزی نے کہا ہے:

''جس حدیث کو دیکھو کہ عقل یا اصول کے خلاف ہے تو جان لو کہ وہ من گھڑت ہے۔ اس ئ نسبت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ اس کے رواۃ معتبر ہیں یا غیر معتبر۔ اسی طرح وہ حدیث ا بل اعتبار نہیں ہے جو حس اور مشاہدہ کے خلاف ہو اور وہ حدیث بھی غیر معتبر ہے جو نص کتاب، نت متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو اور کسی قسم کی تاویل کی اس میں گنجائش بھی نہ ہو یا وہ حدیث س میں ایک ذرا سی بات پر سخت وعید دی گئی ہو یا اس کے برعکس معمولی سے فعل پر بہت بڑے اب کا وعدہ کیا گیا ہو۔ اس قسم کی حدیثیں قصہ گو اور بازاری لوگوں کے کلام میں کثرت سے موجود دتی ہیں۔ اس طرح وہ حدیث بھی نا قابل اعتبار ہے جس میں لغویت پائی جائے مثلاً یہ کہ کدو بغیر ئح کے نہ کھاؤ۔ اس کو دیکھ کر بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس کا راوی کاذب ہے۔ یہ تمام قرینے وہ ں جو روایت میں پائے جاتے ہیں۔ کبھی یہ قرائن راوی میں پائے جاتے ہیں مثلاً غیاث کا واقعہ لیفہ مہدی کے ساتھ پیش آیا۔ جب کہ کوئی راوی تنہا ایسے شخص سے روایت کرے جس سے ملا بھی ہو یا تنہا کوئی ایسی بات بیان کرے جس کا علم اور لوگوں کو بھی ہونا ضروری تھا۔ جیسا کہ خطیب نے لفایہ کے شروع میں اس کی تصریح کی ہے یا وہ واقعہ اتنا اہم ہو کہ اس کے نقل کے اسباب وافر ہوں لاً یہ واقعہ کہ کسی دشمن نے لوگوں کو حج کرنے سے روک دیا''۔ (۱)

بقول علامہ شبلی نعمانی اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت متبار کے قابل نہ ہوگی اور اس کے متعلق اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ں یا نہیں؟

ا۔ جو روایت عقل کے مخالف ہو۔

۔ جو روایت اصول مسلمہ کے خلاف ہو۔

۔ جو محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔

۔ قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی کچھ گنجائش نہ ہو۔

۔ جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذا

۶۔ معمولی کام پر بہت بڑے انعام کا وعدہ ہو۔

۷۔ وہ روایت رکیک المعنی ہو۔

۸۔ جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہے جو کسی اور نے نہیں کی اور یہ راوی اس شخص سے نہ ملا ہو۔

۹۔ جو روایت ایسی ہو کہ اس کا ایک ہی راوی ہو حالانکہ بہت سے لوگوں کا اس سے واقف ہو ضروری ہو۔

۱۰۔ جس روایت میں ایسا قابل اعتنا واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وقوع میں آتا تو سینکڑوں راوی اس کو بیان کرتے اور اس کے باوجود صرف ایک ہی راوی نے اس کو بیان کیا ہو۔

ملا علی قاری نے موضوعات کے خاتمہ پر حدیثوں کے نامعتبر ہونے کے چند اصول تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کی مثالیں نقل کی ہیں ہم اس کا خلاصہ اس موقع پر نقل کرتے ہیں:

۱۔ جس حدیث میں ایسی فضول باتیں ہوں جو رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نہیں نکل سکتیں مثلاً یہ کہ جو شخص لا الہ الا اللہ کہتا ہے خدا اس کلمہ سے ایک پرندہ پیدا کرتا ہے جس کی ستر زبانیں ہوتی ہیں اور ہر زبان میں ستر ہزار لغت ہوتے ہیں۔

۲۔ وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو مثلاً یہ کہ بینگن کھانا ہر مرض کی دوا ہے۔

۳۔ جو حدیث صریح حدیثوں کے مخالف ہو۔

۴۔ جو حدیث واقعہ کے خلاف ہو مثلاً یہ کہ دھوپ میں رکھے ہوئے پانی سے غسل نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے برص پیدا ہوتا ہے۔ (اگرچہ بعض اوقات تجربہ کی رو سے یہ درست بھی ہے۔)

۵۔ جو حدیث انبیاء کرامؑ کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو مثلاً یہ حدیث کہ تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں۔ سبزہ زار، آب رواں اور خوبصورت چہرہ کا دیکھنا۔

۶۔ وہ حدیثیں جن میں آئندہ واقعات کی پیش گوئی بقید تاریخ مذکور ہو مثلاً یہ کہ فلاں سن اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا۔

۷۔ وہ حدیثیں جو طبیبوں کے کلام سے زیادہ مشابہ ہوں مثلاً یہ کہ ہریسہ کھانے سے قوت آتی

ہے یا یہ کہ مسلمان شیریں ہوتا ہے اور شیرینی پسند کرتا ہے۔

۸۔ وہ حدیثیں جن کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں مثلاً عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز تھا۔

۹۔ وہ حدیث جو صریح قرآن کے خلاف ہو مثلاً یہ کہ دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہوگی۔ اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے تو ہر شخص بتا دے گا کہ قیامت کب آئے گی حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔

۱۰۔ بعض وہ حدیثیں جو حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق ہیں۔

۱۱۔ جس حدیث کے الفاظ رکیک ہوں۔

۱۲۔ بعض وہ حدیثیں جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل میں وارد ہوئی ہیں۔ (۲)

درایت کا ایک پہلو یہ ہے کہ دو روایتوں میں اگر تعارض ہو تو تاویل کر کے ان کا تعارض دور کر دینا چاہیے۔ ایسی روایات کو جن کا تعارض دور ہو سکتا ہے اصطلاح محدثین میں مختلف الحدیث کہتے ہیں اور ایسی احادیث کے تعارض دور کرنے کے لیے محدثین نے مستقل تصانیف لکھی ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بنظر ظاہر دو متضاد روایتیں ہوتی ہیں لیکن ایک روایت کے راوی دوسری روایت کے راویوں سے ”عالی مرتبہ“ ہوتے ہیں اور یہی بات اس روایت کی ترجیح کی دلیل بنتی ہے۔

محدثین کا یہ طریق نہیں تھا کہ جیسے ہی کسی شخص سے کوئی بات سنی اسے ذخیرۂ احادیث میں شامل کر لیا۔ بلکہ وہ بڑی کاوش اور محنت سے ”سند عالی“ حاصل کرنے کی سعی کرتے اور کوشش کرتے تھے کہ جس طرح بھی ممکن ہو نبی اکرم ﷺ اور ان کے درمیان اس روایت کے واسطے کم سے کم ہوں۔ اس اہتمام کا آغاز خود عہد نبی کریم ﷺ میں ہو چکا تھا۔

سند عالی کی تلاش و جستجو میں محدثین نے بڑے بڑے سفر کیے اور بعض دفعہ نبی کریم ﷺ کے ایک یا دو جملوں کو سننے کے لیے اس زمانے میں جب کہ وسائل نقل و سفر بہت ہی محدود تھے۔ سینکڑوں میل کا دشوار گزار سفر طے کیا۔

اصول درایت ہی کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ موٹی سمجھ کے آدمی اور ایک نکتہ رس اور ذہین وفطین شخص کی روایتیں ایک معیار کی نہیں قرار پائیں گی۔ مثلاً ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ وعلیؓ کی روایتیں ایک عام بدوی کی روایت کے برابر نہیں سمجھی جاسکتیں، خصوصاً وہ روایتیں جن کا تعلق تفقہ اور دقیق مطالب کے ساتھ ہو۔ تاکہ اطمینان ہو جائے کہ کہیں راوی کو اصل بات یا واقعہ کے سمجھنے یا دیکھنے میں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی۔ بلکہ بعض محدثین، جیسے علامہ مازری تو اس احتیاط میں اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ انہوں نے کہا کہ یہ قول درست سہی ''کہ سب صحابہ عادل ہیں'' مگر کیا ہر وہ شخص جس نے نبی کریم ﷺ کو محض اتفاقاً دیکھ لیا ہو یا جو رسول اللہ ﷺ کے حضور بالالتزام حاضر رہے، آپ کی اعانت ونصرت کی اور اس نور کے قدم بقدم چلے جو آپ پر نازل ہوا۔ گو علامہ مازری کا یہ خیال درست نہیں کہ بعض صحابہ عادل نہیں تھے کیونکہ صفت عدل وتقویٰ میں سب کے سب صحابہ عادل ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صحابہ میں درجات کا تفاوت ضرور تھا۔ قرآن مجید نے اس فرق کو اس طرح بیان کیا ہے:

> لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قَاتَلَ ط اُولٰٓئِكَ
> اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قَاتَلُوْا ط وَ كُلًّا وَّعَدَ
> اللّٰهُ الْحُسْنٰى۔ (سورۃ الحدید۔۱۰)

> اے اصحاب رسول ﷺ تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے فتح سے پہلے اسلام کی راہ میں اپنا مال صرف کیا اور جنگوں کے مصائب برداشت کیے، ان لوگوں کے برابر نہیں ہوسکتے جنہوں نے بعد میں مالی یا جانی قربانیاں دیں۔

ظاہر ہے کہ اول الذکر لوگوں کا درجہ بلند ہوگا۔ ہاں! اللہ تعالیٰ نے ہر دو فریق سے الحسنٰی کا وعدہ کیا ہے۔

غرض عادل وثقہ تو سب صحابہ ہیں لیکن دوسری باتوں کی طرح اخذ روایت میں بھی بہرحال تفاوت وتفاضل پایا جاتا ہے۔ بعض صحابہ کو خاص طور پر فقیہہ سمجھا جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ

نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا الگ معیار قائم ہوتا ہے۔ مثلاً ایک راوی جو عادل ہے ایک ایسا معمولی قسم کا واقعہ بیان کرتا ہے جو عموماً پیش آ سکتا ہے تو اس کی روایت تسلیم کر لی جائے گی۔ لیکن اگر وہی راوی کوئی ایسی بات بیان کرے جو غیر معمولی ہو یا جسے سمجھنے اور اس کی حقیقت کو پانے کے لیے ذہانت اور تفقہ کی ضرورت ہے تو چونکہ واقعہ زیادہ ثبوت کا محتاج ہے اس لیے محض روایت ہی کو نہیں دیکھا جائے گا اور راوی کا نام درجہ عدل و وثوق پر ہی پورا اترنا کافی نہیں سمجھا جائے گا بلکہ روایت کے ساتھ درایت کا بھی لحاظ رکھنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ گو عام طور پر پانچ چھ برس کے باتمیز بچے کی روایت قبول ہے اور امام بخاری نے اپنے صحیح کی کتاب العلم میں ایک خاص باب بھی اس بارے میں قائم کیا ہے۔ جس میں امام بخاری نے استدلال کیا ہے کہ پانچ برس کی عمر کے بچے کی روایت قبول ہو سکتی ہے لیکن اگر درایت کے تمام مقتضیات کو نظر انداز کر کے پانچ برس کا کوئی بچہ فقہ و تفسیر کے کسی گہرے اور دقیق مسئلے کی روایت کرے جس کے متعلق یہ شبہ کرنے کے اسباب موجود ہوں کہ اس بچے نے مسئلے کو صحیح رنگ میں سمجھا بھی ہے یا نہیں تو اس کی روایت کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے محدثین نے لکھا ہے کہ کسی باتمیز بچے کی ان واقعات کے متعلق روایت مقبول ہے جن کا تعلق محض دید کے ساتھ ہے لیکن جو باتیں از قبیل نقلیات ہیں مثلاً افتا یا روایت اخبار وغیرہ تو ایسی باتوں میں اس کی روایت و درایت کی محتاج ہوگی۔

غرض محدثین اس اصول درایت سے کہ واقعہ جس درجے کا اہم ہو شہادت بھی اسی پائے کی ہونی چاہیے خوب آگاہ تھے۔ چنانچہ امام بیہقی کتاب المدخل میں یہ قول نقل کرتے ہیں کہ جب ہم نبی کریم ﷺ سے حلال و حرام یا دوسرے احکام شریعہ کے متعلق حدیث رروایت کرتے ہیں تو سند میں نہایت سختی کرتے ہیں اور راویوں کو خوب پرکھ لیتے ہیں لیکن جب فضائل اور ثواب و عذاب کی روایتیں آتی ہیں تو قدرتاً وہ شدت نہیں رہتی اور راویوں پر عموماً اعتماد کر لیتے ہیں۔ مشہور سیرت نگار ابن اسحاق کے متعلق حضرت امام حنبل کا قول ہے کہ ان کی یہ حیثیت ہے کہ سیرت، مغازی وغیرہ کی روایات ان سے اخذ کی جا سکتی ہیں لیکن جب حلال و حرام کے مسائل آئیں تو ہمیں زیادہ ثقہ لوگ درکار ہیں اور یہ کہہ کر انھوں نے اپنے ہاتھ کی انگلیاں خوب زور سے بند کر لیں۔ یہی وجہ ہے

کہ کتب تفسیر و سیرۃ کا ذخیرہ ہم پلہ نہیں اور محدثین نے بڑے بڑے قابل اسناد لوگوں کی روایات کورد کر دیا ہے۔

یہ اصول درایت ہی ہیں جن کی بنا پر حنفی فقہا نے لکھا ہے کہ راوی اگر تفقہ اور اجتہاد میں مشہور ہے جیسے کہ خلفائے راشدین یا عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ تھے تو اس کی روایت حجت ہوگی اور اس کے مقابلے میں قیاس چھوڑ دیا جائے گا۔ اگر روای ثقہ و عادل ہے لیکن فقیہ نہیں جیسے حضرت انسؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ ہیں تو اگر وہ روایت قیاس کے موافق ہوگی تو اس پر عمل ہوگا ورنہ درایت کا عمل جاری ہوگا۔ اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ روایت کی صحت کا تعین کرنے کے لیے درایت لازمی تھی اور محدثین نے اس میں کمال غور و تفکر سے کام لیا ہے۔

اصول روایت

اصول درایت کی طرح محدثین نے اصول روایت کی طرف بھی پوری توجہ کی ہے۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، آپ فرماتے ہیں:

یحمل هذا العلم من کل خلف عدوله ینفون عنه تعریف الغالین و انتحال المبطلین و تاویل الجاهلین

یعنی اخذ روایت عادل راوی سے ہی ہوسکتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک فرمایا کرتے تھے: الاسناد من الدین، ولولا الاسناد لقال من شاء ما شاء فانظروا عمن تاخذوه

یعنی یہ احادیث دین کا ایک حصہ ہیں پس جن سے روایت کرو ان لوگوں کی اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو اور انہیں بخوبی پرکھ لیا کرو۔

محمد بن سیرین نے لکھا ہے کہ:

ان هذا الحدیث دین

ابراہیم کہتے ہیں کہ جب محدثین کسی شخص سے کوئی روایت لینا چاہتے تو پہلے اس کی عبادات، نماز و نیکی تقویٰ، وضع قطع اور اچھے طور طریقے دیکھ لیتے تھے۔

ابن مہدی فرمایا کرتے تھے:

لا یکون امامًا ابدًا رجل یحدث عن کل احد

وہ شخص کبھی بھی امامت کا اہل نہیں ہوسکتا جو تحقیق کے بغیر ہر شخص سے روایت لے کر آگے بیان کردے۔

اصول روایت کے لحاظ سے اخذ روایت میں بنیادی طور پر ان امور کو پیش نظر رکھا جاتا ہے:

۱۔ راویوں کا عادل اور ثقہ ہونا۔

۲۔ سلسلۂ روایت یعنی سند کا ابتدا تا انتہا مسلسل اور غیر منقطع ہونا۔

۳۔ پوری سند اور سند کے مختلف مراحل میں راویوں کی تعداد۔

۴۔ منبع روایت۔

۵۔ طریق روایت۔

ان پانچ بنیادی باتوں کے تفاوت سے احادیث کو مختلف اقسام میں بانٹ دیا گیا ہے۔ جن کا تذکرہ آگے آئے گا۔ (۳)

چند کتب اصول حدیث کا تعارف

علامہ ابن حجر نے نزھۃ النظر میں لکھا ہے کہ اصول حدیث میں سب سے پہلی تالیف قاضی ابومحمد حسن بن عبدالرحمٰن بن خلاّد الرامہرمذی (م ۳۶۰ ہجری) کی ہے۔ اس کے متعلق الذھبیؒ نے لکھا ہے ''ما احسنہ من کتاب'' یعنی یہ کیا ہی اعلیٰ درجے کی کتاب ہے۔

الرامہرمذی سے پہلے فوت ہونے والے محمد بن حبان بن احمد البستی (م ۳۰۴ ہجری) نے ایک کتاب التقاسیم والانواع کے نام سے لکھی تھی لیکن وہ غالباً دست برد زمانہ کی نذر ہو چکی ہے۔

اس وقت ہمارے پاس اصول حدیث پر سب سے پہلی مستقل کتاب المحدث الفاصل کی ہے۔ یہ ابھی تک طبع نہیں ہوئی لیکن اس کے مخطوطے خوش قسمتی سے ابھی تک محفوظ ہیں۔ ایک مخطوطہ المکتبہ الظاہریہ، دمشق میں ہے اور ایک المکتبۃ الاخلاصیۃ، حلب میں ہے۔ اس مؤخر الذکر مخطوطے کا ذکر محمد راغب الطباخ نے مجلّہ المجمع العلمی العربی میں کیا ہے۔

الرامہرمذی ہی کے عہد میں ایک کتاب الثواب فی حدیث کے نام سے عبداللہ بن محمد بن جعفر بن حیان الاصفہانی (م ۳۶۰ ہجری) نے تالیف کی۔ ان کے بعد الحاکم ابوعبداللہ النیشاپوری (م ۴۰۵ ہجری) کی کتاب معرفۃ علوم حدیث (بار اول قاہرہ ۱۹۳۷ عیسوی، طبع معظم حسین) ہے۔ یہ طباعت آٹھ مخطوطوں کی مدد سے تیار کی گئی ہے۔ جن میں سے ایک نسخہ لندن میں ہے، تین قسطنطنیہ میں، ایک دمشق میں، ایک حلب میں اور دو نسخے قاہرہ میں ہیں۔ الحاکم کی اس کتاب کے متعلق ابن خلدون نے لکھا ہے کہ علوم حدیث کے بارے میں بہت سے لوگوں نے تالیفات کی ہیں۔ اس فن کے چوٹی کے اماموں میں الحاکم بھی ہیں۔ جن کی اس بارے میں تالیفات مشہور و معروف ہیں۔ اس کے مضامین کو انہوں نے بڑی خوبی اور ترتیب سے بیان کیا ہے اور علم حدیث کے محاسن کو نمایاں کیا ہے۔

الحاکم کے بعد ابونعیم احمد بن عبداللہ اصفہانی (م ۴۳۰ ہجری) نے طبقات المحدثین والرواۃ کے نام سے ایک بلند پایہ کتاب لکھی۔ پھر الخطیب البغدادی (م ۴۶۳ ہجری) کی دو کتابیں الکفایۃ اور الجامع الآداب الشیخ والسامع کے نام سے ملتی ہیں۔ علامہ ابن حجر نے لکھا ہے کہ اصول حدیث کے فنون میں سے شاید ہی کوئی فن ہوگا جس پر الخطیب نے کوئی مستقل کتاب نہ لکھی ہو۔ الکفایہ کے مخطوطے محفوظ ہیں۔ ایک مخطوطہ حلب کے مکتبۃ المدرسہ العثمانیہ میں، ایک المکتبۃ الظاہریہ دمشق میں، ایک المکتبۃ السلطانیہ مصر میں اور ایک حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔

الجامع کا ایک عمدہ مخطوطہ مکتبہ المجلس البلدی، اسکندریہ میں محفوظ ہے۔ قاضی عیاض (م ۵۴۴ ہجری) کی الالماغ اس موضوع پر نہایت لطیف تصنیف ہے۔ اس کا مخطوطہ دار الکتاب الظاہریہ، دمشق میں ہے۔ پھر الاعلام فی استیعاب الرواۃ عن الآئمۃ الاعلام کے نام سے علی بن ابراہیم الغرناطی (م ۵۷۷ ہجری) نے لکھی، ابوحفص عمر بن عبدالمجید القرشی نے مالا یسع المحدث جملہ کے نام سے اور عمر بن بدر (م ۵۲۳ ہجری) نے المغنی فی علم الحدیث کے نام سے تالیفات کیں۔ ان کے بعد سب سے مشہور تقی الدین ابوعمرو عثمان بن عبدالرحمان المعروف بہ ابن الصلاح (م ۶۴۳ ہجری) کا ہے۔ ان کی تالیف علوم الحدیث جو مقدمہ ابن الصلاح کے نام سے زیادہ مشہور ہے اور جو وقتاً فوقتاً املا کروائی گئی تھی اس فن کی نہایت بلند پایہ کتاب ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ بہت بڑی تعداد میں اس کی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ اس پر بے شمار حاشیے لکھے گئے، اس کی تلخیص کی گئیں اور اس کے مضامین کو منظوم کیا گیا۔ علامہ النووی (م ۶۷۶ ہجری) نے مقدمہ ابن الصلاح کی تلخیص ارشاد الی علم الاسناد کے نام سے قلم بند کی جس کی پھر ایک تلخیص خود ہی التقریب والتیسیر کے نام سے لکھی۔ النووی کی التقریب کی شرح السیوطی (م ۹۱۱ ہجری) نے تدریب الراوی (مصر ۱۳۰۷ ہجری) کے نام سے کی۔ یہ بلند پایہ کتاب ہے۔ مقدمہ ابن الصلاح کی ایک تلخیص المنہل الراوی فی اصطلاح الحدیث النبوی کے نام سے بدر الدین محمد بن ابراہیم بن سعد اللہ ابن جماعۃ (م ۷۳۳ ہجری) نے تیار کی اور ابن الصلاح کے بیان کردہ مضامین پر کچھ اضافہ کیا۔ المنہل کی شرح ان کے پوتے عزیز الدین محمد بن احمد ابن جماعۃ (م ۸۱۹ ہجری) نے المنہج السوی فی

شرح المنہل الراوی کے نام سے کی۔ مقدمہ ابن الصلاح کی ایک شرح بدر الدین محمد بن بہادر الزرکشی (م ۷۹۴ ہجری) نے اور ایک تلخیص محاسن الصلاح فی تضمین، کتاب ابن الصلاح کے نام ے البلقینی (م ۸۰۵ ہجری) نے قلم بند کی۔ محاسن کا مخطوطہ دار الکتب المملکیہ، برلن میں محفوظ ہے۔ زین الدین عبدالرحیم العراقی (م ۸۰۶ ہجری) کی شرح کا نام التقیید والایضاح لم اطلق واغلق من مقدمہ ابن الصلاح ہے۔ العراقی نے مقدمہ ابن الصلاح کو منظوم بھی کیا۔

مقدمہ ابن الصلاح کو ملخص کر کے محمد بن احمد بن خلیل (م ۳۹۶ ہجری) نے منظوم بھی کیا۔ ا نظم کا مخطوطہ دار الکتب المملکیہ برلن میں محفوظ ہے۔ مقدمہ کا ایک منظومہ "نظم الدرر فی علم الاثر" ۔ نام سے زین الدین عراقی کا بھی ہے۔ یہ الفیۃ العراقی کے نام سے مشہور ہے۔ ہند سے (دون تاریخ) طبع ہو چکا ہے۔ الفیۃ کی ایک شرح خود العراقی نے فتح المغیث، بشرح الفیۃ الحدیث کے نام سے کی تھی۔ الفیۃ کی ایک مطول شرح العراقی نے لکھنا شروع کی تھی لیکن وہ بہت دہ مفصل ہوگئی۔ اس لیے اسے چھوڑ کر یہ مختصر شرح لکھی۔ اس شرح کی ایک شرح اسماعیل بن ہیم ابن جماعۃ (م ۸۶۱ ہجری) نے لکھی۔ ایک حاشیہ قاسم بن قطلو بغا (م ۸۷۹ ہجری) کا ہے ایک برھان الدین ابراہیم بن عمر البقاعی (م ۸۸۵ ہجری) کا ہے، النکت علی شرح الفیۃ اقی، لیکن یہ مکمل نہیں ہوا۔ الفیۃ کے دوسرے شارحین کے نام یہ ہیں: زین الدین العینی ۸۹۳ ہجری)، قطب الدین محمد بن محمد الخیضری (م ۸۹۴ ہجری)، السخاوی (م ۹۰۲ ہجری)، فتح یث فی شرح الفیۃ الحدیث (لکھنؤ ۱۳۰۳ ہجری)، السیوطی (م ۹۱۱ ہجری)۔ یہ دونوں شرحیں یت قابل قدر اور بڑی جامع ہیں اور غالباً بہترین شروح ہیں۔

الفیۃ العراقی کے انداز پر اصول حدیث میں علامہ السیوطی نے بھی ایک نظم قلم بند کی تھی۔ جو فیۃ السیوطی فی مصطلح الحدیث کے نام سے مصر سے ۱۳۳۲ ہجری میں طبع ہو چکی ہے۔ اصول حدیث الفیۃ العراقی کو وہی مقام حاصل ہے جو علم نحو میں الفیۃ ابن مالک (م ۶۷۲ ہجری) کا ہے۔

ابن الصلاح کے مشہور و معروف مقدمہ کے بعد محمد بن اسحاق القوہوی (م ۶۷۲ ہجری) جامع الاصول لکھی۔ پھر ابو العباس شہاب الدین احمد بن فرح (م ۶۹۹ ہجری) نے قصیدہ

غرامیہ لکھا۔ اس کی متعدد لوگوں نے شروح لکھیں مثلاً عز الدین محمد بن احمد ابن جماعۃ (م۶ ۱ ہجری) نے زوال الشرح فی شرح منظومۃ ابن فرح کے نام سے شرح لکھی۔ ابن جماعۃ نے ا کے علاوہ منظومۃ ابن فرح کی دو اور شرحیں بھی لکھی تھیں۔

ابن فرح کے قصیدۂ غرامیہ کے بعد ابن دقیق العید کی کتاب الاقتراح فی بیان الاصطلا کا نام ملتا ہے۔ یہ بڑی قابل قدر کتاب ہے اس کا مخطوطہ دار الکتب الملکیۃ برلن میں محفوظ ہے۔

نخبۃ الفکر

اصول حدیث پر ایک جامع متن نخبۃ الفکر کے نام سے علامہ ابن حجر نے لکھا ہے۔ یہ کتا سنن ابن ماجہ کی ایک طباعت کے ساتھ النخبۃ الفکریہ کے نام سے بھی طبع ہو چکی ہے۔ خود مصن نے نزھۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر کے نام سے اس کی شرح قلم بند کی۔

ان دونوں کتابوں کو بھی مقدمہ ابن الصلاح کی طرح بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ س سے پہلے مصنف کے بیٹے کمال الدین محمد بن احمد بن حجر نے نتیجتاً النظر فی شرح نخبۃ الفکر کے سے ایک شرح لکھی۔ پھر ان کے معاصر کمال الدین ابوعبداللہ محمد بن الحسین بن علی الشمنی نے ا شرح قلم بند کی۔ پھر قاسم بن قطلوبغا (م۷۸۶ ہجری) محمد اکرم بن عبدالرحمٰن المکی نے ارمغ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر کے نام سے اور علی بن سلطان محمد الھر وی (م۱۰۱۴ ہجری) نے مصطلح اہل الاثر علی شرح نخبۃ الفکر کے نام سے، عبداللہ عبدالرؤف بن تاج الدین المناوی نے الیواقی الدرر فی شرح نخبۃ الفکر، ابوالحسن نورالدین محمد بن عبدالہادی السندی اور کمال الدین محمد بن محمد ان کتب کی شرحیں اور ان پر حاشیے لکھے۔ کمال الدین کی شرح کا مخطوطہ دار الکتب الملکیہ برلن محفوظ ہے۔

نخبۃ الفکر کو کمال الدین محمد بن الحسنی الشمنی نے منظوم کیا۔ جس کی شرح ان کے بیٹے تقی الدین ابوالعباس احمد بن محمد الشمنی (م۸۷۲ ہجری) نے العالی الرتبہ فی شرح نظم النخبۃ کے نام کی۔ (۴)

اقسام کتب حدیث

حدیث کی مختلف کتابوں کی مجموعی طور پر پانچ بڑی اقسام ہیں۔

ا۔ جامع

جامع اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں مقررہ آٹھ قسم کی حدیثیں ہوں۔ یعنی عقائد، احکام، تفسیر، آداب وسیر اور فضائل ومناقب وغیرہ۔ سب سے پہلی جامع عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی ''الصادقہ'' ہے۔ امام بخاری نے بھی اپنی جامع میں صحیح حدیثوں کا التزام کیا ہے۔

۲۔ مسند

مسند اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں احادیث کو اسماء صحابہ کی ترتیب سے ان کی خدمات کے پیش نظر جمع کیا جائے یا صحابہ کے حسب نسب کا لحاظ رکھا جائے مثلاً مسند ابی داؤد طیالسی (متوفی ۲۰۴ ہجری)، یہ اولین مسند ہے نیز مسند بقی بن مخلد (متوفی ۲۹۶ ہجری)۔ بقی کی مسند کو مصنف بھی کہتے ہیں کیوں کہ اس میں ہر صحابی کی مرویات کو فقہی انداز میں ابواب کی تقسیم کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ تمام مسانید سے زیادہ جامع وکامل مسند امام احمد بن حنبل ہے۔ مسند احمد میں بہت سی احادیث صحیحہ ایسی ہیں جو صحاح ستہ میں موجود نہیں ہیں۔ امام احمد مسند کے بارے میں فرماتے ہیں:

> ''یہ کتاب میں نے سات لاکھ پچاس ہزار حدیثوں سے منتخب کر کے جمع کی ہے۔ جس حدیث میں اختلاف پیدا ہو اس کے بارے میں مسند کی طرف رجوع کیجیے۔ اگر اس میں موجود ہو تو صحیح ہے ورنہ قابل احتجاج نہیں ہے۔''

لیکن امام ذھبی نے امام احمد کے اس قول سے اتفاق نہیں کیا ہے۔

۳۔ معجم

معجم حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں حروف تہجی کے اعتبار سے شیوخ، بلدان اور قبائل کے ناموں کے مطابق حدیثیں جمع کی گئی ہیں۔ مشہور ترین معجم طبرانی کی معجم کبیر، معجم صغیر اور معجم

متوسط ہیں۔

۴۔ مستدرک

مستدرک حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں وہ احادیث جمع ہوں جو کسی مصنف کی شرائط کے مطابق ہوں مگر اس کی کتاب میں موجود نہ ہوں۔ امام حاکم نیشاپوری کی مستدرک علی الصحیحین سب سے زیادہ مشہور ہے۔ امام ذھبی نے اس کا خلاصہ لکھا ہے۔ حاکم نے بخاری و مسلم پر الزام عائد کیا ہے کہ ان کی بعض روایات خود بخاری و مسلم کے نزدیک بھی ضعیف ہیں اور اس کے باوصف انہوں نے ان کی مرویات اپنی کتابوں میں شامل کر دی ہیں۔

۵۔ مستخرج

حافظ عراقی کے قول کے مطابق مستخرج کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مصنف کسی کتاب کی احادیث کو کتاب کے جامع و مؤلف کے علاوہ اپنی سند سے روایت کرے اور اس کی سند مؤلف کتاب کے شیخ کے ساتھ یا اس سے اوپر جا کر مل جائے۔ اس ضمن میں مستخرج ابی بکر اسماعیل البخاری، مستخرج ابی عوانہ علی مسلم، مستخرج ابی علی طوسی الترمذی اور مستخرج محمد بن عبدالملک بن ایمن علی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۶۔ الاجزا

حدیث کی جس کتاب میں صرف ایک ہی صحابی یا راوی کی مرویات جمع ہوں اس کو ”جز“ کہتے ہیں مثلاً جز ابی بکر۔

اس طرح حدیث کی جس کتاب میں ایک ہی مسئلہ سے متعلق احادیث کو یکجا کیا گیا ہو اس کو بھی جز کہتے ہیں۔

۷۔ سنن

سنن وہ کتاب حدیث ہے جس میں صرف احکام کی احادیث جمع ہوں مثلاً سنن ابی داؤد اور سنن ابن ماجہ۔

۸۔ رسالہ

جس کتاب میں کسی ایک ہی مقصد کی حدیثیں جمع کی جائیں اس کو رسالہ کہتے ہیں۔ اس کے موجد حضرت زید بن ثابت ہیں جنہوں نے کتاب الفرائض جمع کی۔

۹۔ اربعین

اربعین وہ کتاب ہے جس میں چالیس حدیثیں جمع کی جائیں۔ سب سے پہلا اربعین شیخ عبداللہ بن مبارک (۱۸۱ ہجری) کا معلوم ہوتا ہے۔

علم اصول حدیث اور اس کی چند شاخیں

حدیث نبوی کے متن و عبارت کا درس و مطالعہ اور کتب روایت کا حفظ و اہتمام بے حد ضروری ہے اور اس کے ساتھ ساتھ درایت حدیث کے پہلو کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ اور بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ درایت حدیث ہی وہ فن ہے جس میں حضور اکرم ﷺ کے اقوال و افعال کا تاریخی و تحلیلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہ علم حدیث نبوی کی عبارت سے وہی تعلق رکھتا ہے جو علم تفسیر کو قرآن حکیم سے یا احکام کو واقعات کے ساتھ ہوتا ہے۔ درایت حدیث سے متعلق مباحث حدیث کے ابتدائی دور میں جداگانہ حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے موضوعات، غرض و غایت اور طرز و انداز کے اعتبار سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ جب تدوین حدیث اور تصنیف و تالیف کا دور آیا تو ہر عالم نے علم کے ایک الگ گوشے کو اپنا لیا اور اس درایت حدیث سے متعلق علم کی مزید بھی شاخیں وضع کر دیں۔ ''علوم الحدیث'' میں درایت حدیث کے درج ذیل علوم آتے ہیں۔

۔ علم جرح وتعدیل

یہ وہ علم ہے جو خاص الفاظ کے ذریعے راویوں کی عدالت و ثقاہت یا ان کے عیب و ضعف سے بحث کرتا ہے۔ جرح و تعدیل کا یہ علم درایت حدیث کے فن کا ثمرہ اور اس کی بہت بڑی سیڑھی ہے۔ بہت سے عالم اس فن میں عصر صحابہ سے لے کر متاخرین کے عہد تک گفتگو کرتے چلے آئے ہیں۔

اس فن سے متعلق ابن سعد زہری بصری متوفی ۲۳۰ ہجری کی تصنیف وتالیف طبقات ابن سعد نہایت جامع ہے۔ یہ پندرہ جلدوں میں ہے۔

۲۔ علم رجال حدیث

اس علم میں حدیث نبوی کے راوی ہونے کے اعتبار سے شخصیات کا حال معلوم کیا جاتا ہے۔ اس علم میں مشغول ہونے والے اولین شخص امام بخاری تھے۔ طبقات ابن سعد میں بھی اس کا بہت سا مواد موجود ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں عزالدین بن الاثیر نے ''اسد الغابۃ فی اسماء الصحابہ'' جمع کی۔ البتہ انہوں نے اس میں صحابہ کے علاوہ دیگر رواۃ حدیث کا بھی حال بیان کیا۔ اس کے بعد حافظ ابن حجر عسقلانی نے ''الاصابۃ فی تمیز الصحابہ'' تصنیف کی جس کو ان کے شاگرد سیوطی نے اپنی کتاب ''عین الاصابۃ'' میں مختصر کر دیا۔

۳۔ علم مختلف الحدیث

اس علم میں ان احادیث سے بحث کی جاتی ہے جس میں بظاہر تناقص نظر آتا ہے۔ اس علم کے ذریعے ان کے مابین جمع وتطبیق کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جمع وتطبیق کا طریقہ یہ ہے کہ مطلق احادیث کو مقید اور عام کی تخصیص کر دی جائے یا ان کو تعدد واقعہ پر محمول کیا جائے۔ اس کو ''تطبیق حدیث'' کا علم بھی کہا جاتا ہے۔(۵)

امام نووی لکھتے ہیں:

> یہ حدیث کا ایک نہایت اہم فن ہے۔ سب علما کو اس کے جاننے کی ضرورت ہے۔ اس فن کا مقصد یہ ہے کہ دو بظاہر متضاد المعنی احادیث میں جمع وتوفیق کی کوشش کی جائے یا ایک کو راجح اور دوسری کو مرجوع قرار دیا جائے۔ اس فن میں وہ علما دسترس رکھتے ہیں جو حدیث وفقہ کے جامع ہوں یا ماہر اصول ہونے کے ساتھ ساتھ حدیث کے معنی میں مہارت رکھتے ہوں۔ امام شافعی نے اس فن پر تصنیف کا آغاز کیا مگر تکمیل کی نوبت نہ آئی البتہ اس پر انہوں نے کام کرنے کی راہ کھو ن۔(۶)

مثلاً ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''لا عدویٰ'' (بیماری متعدی نہیں ہوتی)۔ دوسری حدیث میں فرمایا ''کوڑھ سے یوں بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو''۔ یہ دونوں صحیح حدیثیں ہیں۔ ان دونوں کے مابین جمع و تطبیق کا طریقہ یہ ہے کہ بیماریاں بذات خود متعدی نہیں ہوتیں۔ البتہ مریض کے تندرست سے ملنے کو اللہ تعالیٰ نے اس کی بیماری کے متعدی ہونے کے ذریعہ بنادیا ہے۔ بعض اوقات تندرست آدمی بیمار سے ملتا ہے اور بیمار نہیں ہوتا۔ جس طرح دوسرے اسباب میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ امام شافعی، ابن قتیبہ، ابو یحییٰ زکریا بن یحییٰ ساجی اور ابن الجوزی نے ''مختلف الحدیث'' کے موضوع پر کتابیں لکھیں۔

۴۔ علل الحدیث

اس علم میں ان پوشیدہ اور دقیق علل و اسباب پر بحث کی جاتی ہے جن کی بنا پر حدیث کی صحت میں قدح وارد ہوتی ہے۔ مثلاً حدیث منقطع کا موصول ہونا، موقوف کا مرفوع ہونا اور ایک حدیث کو دوسری میں داخل کرنا اور علاوہ ازیں جہاں ہم ضعیف حدیثوں کی قسموں میں سے ''معلل'' کا ذکر کریں گے وہاں بتائیں گے کہ وہ کون سے اہم علل ہیں جن کی بنا پر حدیث ضعیف قرار پائی ہے، اگرچہ بظاہر اس میں کوئی عیب نظر نہیں آتا۔ اس موضوع پر ابن المدینی، امام مسلم، ابن ابی حاتم، علی بن عمر دارقطنی، محمد بن عبداللہ حاکم اور ابن الجوزی نے کتابیں تحریر کی ہیں۔

۵۔ غریب الحدیث

یہ علم ان احادیث سے بحث کرتا ہے جن کا مطلب و مفہوم بہت سے لوگوں پر عربی زبان سے سات مروی مختلف لہجوں کی وجہ سے واضح نہیں ہوتا۔

اس علم میں سب سے پہلے ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ بصری نے ایک مختصر کتاب تصنیف کی۔ پھر ابوالحسن نضر بن شمیل مازنی نے اس سے بڑی کتاب لکھی۔ بعد ازاں ابو عبید قاسم بن سلام نے ایک ایسی کتاب لکھی جس کی تصنیف میں پوری عمر کھپا دی۔ علاوہ ازیں ابن قتیبہ اور پھر زمخشری نے اپنی کتاب ''الفائق فی غریب الحدیث'' مرتب کی۔ اس کے بعد مجد الدین المعروف ابن الاثیر نے

"النہایہ فی غریب الحدیث والاثر" تحریر کی۔

٦۔ ناسخ ومنسوخ

یہ علم ان احادیث متعارضہ سے بحث کرتا ہے جن میں جمع وتطبیق کا امکان نہ ہو اور بعض احادیث کو ناسخ اور بعض کو منسوخ قرار دیا جائے۔ حدیث ناسخ کا علم بعض اوقات نبی اکرم ﷺ سے بھی حاصل ہوتا ہے۔

جیسے آپ نے فرمایا:

"میں تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا کرتا تھا اب ان کی زیارت کیجئے" نیز فرمایا:

"میں تمہیں قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ ذخیرہ کرنے سے منع کیا کرتا تھا۔ اب اجازت ہے کہ جتنا چاہو کھاؤ"۔

ناسخ ومنسوخ احادیث پر مندرجہ ذیل علما نے کتابیں تحریر کیں۔

احمد بن اسحاق دیناپوری (۳۱۸ ہجری)، محمد بن بحر اصبہانی (۳۲۲ ہجری)، ھبۃ اللہ بن سلامہ (۴۱۰ ہجری)، محمد بن موسیٰ حازمی (۵۷۴ ہجری) اور ابن الجوزی (۵۹۷ ہجری) (۷)

اقسام حدیث

طبعی تقسیم کے مطابق حدیث کی درج ذیل دو اقسام ہیں:

۱۔ مقبول

صحیح حدیث کو مقبول کہتے ہیں۔

۲۔ مردود

ضعیف حدیث کو مردود کہتے ہیں۔

یہ حدیث کی طبعی تقسیم ہے جس کے تحت بہت سی قسمیں مزید ہیں اور جن کے درجات میں صحت وضعف، احوال رواۃ اور متون حدیث کے اعتبار سے بہت زیادہ فرق ومدارج پایا جاتا ہے۔

مگر محدثین نے حدیث کی ایک ثلاثی تقسیم بھی کی ہے۔ جس کو وہ تقسیم سابقہ کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں۔ اس لیے کوئی حدیث ایسی نہیں جو ان تین بنیادی اقسام میں شامل نہ ہو۔ وہ تین قسمیں یہ ہیں۔ ۱۔ صحیح ۲۔ حسن ۳۔ ضعیف

پھر ان اقسام ثلاثہ کی بہت سے قسمیں ہیں۔

امام حازی فرماتے ہیں:

علم حدیث کی قسمیں سو تک پہنچ جاتی ہیں۔ ہر نوع ایک مستقل علم کی حیثیت رکھتی ہے اگر طالب علم اپنی پوری عمر بھی اس کام میں کھپا دے تو اس کی انتہا کو نہیں پہنچ سکتا۔

محدث ابن الصلاح نے اپنی کتاب ''علوم الحدیث'' میں حدیث کی ۶۵ اقسام کا ذکر کیا ہے اور تحریر کیا ہے کہ یہ آخری حد نہیں ہے بلکہ اس کی لاتعداد قسمیں ہو سکتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ راویان حدیث اور مرویات کے احوال وصفات کا کچھ ٹھکانہ نہیں ہے۔ ذیل میں خبر اور اس کی دو بنیادی اقسام پر بحث کی گئی ہے۔

خبر

لغت میں خبر دینا سے مراد بتانا اور معلومات دینا ہے۔ اس کی جمع اخبار آتی ہے۔ اصطلاح میں خبر کے معنی میں تین اقوال آتے ہیں۔

پہلا قول یہ ہے کہ خبر سے مراد حدیث نبوی ﷺ ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے منقول کو ''حدیث'' اور غیر نبی سے منقول کو ''خبر'' کہتے ہیں۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اس لفظ کے عام معنی ہیں۔ اس اعتبار سے نبی کریم ﷺ سے منقول کو ''حدیث'' لیکن جو آپ سے یا کسی غیر سے منقول ہو سب کو ''خبر'' کہتے ہیں۔

ہم تک پہنچنے کے اعتبار سے خبر کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ متواتر

جن احادیث کی سندیں بہت زیادہ غیر معین تعداد میں ہوں تو وہ متواتر کہلاتی ہیں۔

۲۔ اخبار آحاد۔ خبر واحد

جن احادیث کی سندیں متعین و محدود عدد کے ساتھ ہوں، تو انہیں اخبار آحاد یا خبر واحد کہتے ہیں۔ اب ان دونوں کی مزید ذیلی اقسام ہیں۔

خبر متواتر کی شرائط اور اقسام

تواتر فعل سے مشتق، اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اس کے معنی تسلسل کے ہیں۔ جیسے ہم کہیں کہ تواتر المطر کہ بارش مسلسل اور متواتر آرہی ہے۔

اصطلاحی طور پر خبر متواتر سے مراد وہ حدیث ہے جسے ایک بڑی جماعت روایت کرے اور ان کثیر تعداد میں راویوں کا کسی جھوٹ پر متفق ہونا عادتاً محال ہو۔

مطلب یہ ہے کہ ایسی حدیث یا خبر جسے سند کے طبقوں میں سے ہر طبقہ میں اتنے کثیر اور زیادہ راوی روایت کریں کہ عقلاً یہ تصور بھی نہ کیا جا سکتا ہو کہ جس حدیث کو اتنی کثیر تعداد میں راوی بیان کر رہے ہیں، وہ تمام کے تمام کسی جھوٹی حدیث کے بنانے یا گھڑنے میں متفق ہو گئے ہیں۔

متواتر کی شرائط

خبر متواتر کے مندرجہ بالا مفہوم سے واضح ہوتا ہے کہ خبر متواتر میں چار شرائط کا پایا جانا لازمی ہے۔

۱۔ اس خبر کو کثیر تعداد میں راوی بیان یا روایت کریں۔ کثیر تعداد کی تعریف میں پسندیدہ قول یہ ہے کہ کم از کم دس راوی تو ضرور ہوں۔ بعض نے بارہ، بعض نے بیس، بعض نے چالیس اور بعض نے ستر تک کی شرط بھی رکھی ہے۔

۲۔ یہی کثرت سند کے تمام طبقوں میں موجود ہو۔

۳۔ ان سب کا کسی جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو۔

۴۔ یہ خبر ظاہری حواس اور مشاہدہ پر مبنی ہو۔

خبر متواتر کی قسمیں

۱۔ متواتر لفظی

متواتر لفظی وہ حدیث ہے جس کو تمام راوی سند کے اول، اوسط اور آخر میں ایک ہی قسم کے الفاظ کے ساتھ بیان کرتے ہوں۔

ساتھ ہی اکثر علما کا خیال یہ ہے کہ اگر متواتر میں لفظی مطابقت و مماثلت کی شرط لگائی جائے تو قرآن کریم کے سوا اس کی دوسری کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ بخلاف ازیں بعض علما کا یہ کہنا ہے کہ بہت سی حدیثیں متواتر لفظی ہیں مثلاً:

۱۔ وہ حدیث جن میں چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔

۲۔ حدیث من کذب علی متعمداً۔

۳۔ حدیث من بنیٰ للہ مسجدا۔

۴۔ وہ حدیث جس میں آپ ﷺ کی شفاعت کا ذکر آیا ہے۔

۵۔ وہ حدیث جس میں کھجور کے اس تنے کے رونے کا ذکر کیا گیا ہے جس کے ساتھ سہارا لگا

کہ آپ ﷺ خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

۶۔ موزوں پر مسح کی حدیث۔

۷۔ واقعہ معراج۔

۸۔ وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ کی انگلیوں سے پانی پھوٹنے لگا اور سب لشکر سیراب ہو گیا۔

۹۔ قتادہ کی دو آنکھیں واپس لانے والی حدیث۔

۱۰۔ تھوڑے سے کھانے سے سب لشکر کو سیر کرنے والی حدیث۔ (۸)

حافظ ابن حجر نے فتح الباری شرح بخاری میں تحریر کیا ہے کہ حدیث من کذب علی متعمداً کو چالیس سے زائد صحابہ نے روایت کیا ہے اور ان میں عشرہ مبشرہ صحابہ بھی شامل ہیں۔

۲۔ متواتر معنوی

متواتر معنوی سے مراد وہ حدیث ہے جس کو اکثر راویوں نے بیان کیا ہو مگر ان کے درمیان الفاظ کا یکساں ہونا شرط نہیں ہے، مفہوم متحد ہونا چاہیے اگر چہ روایت کے الفاظ مختلف ہی ہوں۔ یہ بھی راویوں کی ایسی جماعت ہوتی ہے جس کا جھوٹ پر جمع ہونا عقلاً محال ہو۔ متواتر معنوی کے دائرے میں بکثرت حدیثیں موجود ہیں مثلاً دعا کے وقت ہاتھ اٹھانے کی حدیث۔

تدریب الرّاوی میں تو خبر متواتر کی یہی دو اقسام مذکور ہیں مگر ان پر درج ذیل مزید اضافہ علامہ انور شاہ کشمیری سے منقول ہے۔

۳۔ متواتر علمی

وہ مسئلہ جس پر ہر قرن وعہد کا ایک بڑا مجمع و جماعت عمل پیرا ہو۔

۴۔ متواتر طبقی

وہ امر جس کو ایک نسل اور طبقہ اپنے سے پہلی نسل و طبقہ سے نقل کرے مثلاً قرآن کریم کو ہر بعد والی نسل و طبقہ نے ماقبل کی نسل و طبقہ سے نقل کیا ہے۔

۵۔ متواتر استدلالی

وہ امر جس کے دلائل متواتر ہوں یعنی کسی چیز کے دلائل اتنی تعداد میں متحد ہوں کہ ان کا مجموعہ اس کے حق میں قطعیت کا فائدہ دے اس لیے سب کا مدلول ایک ہو۔ البتہ یہ کہ بعض دلائل صراحت کے ساتھ اس امر کے مطلوب ہونے پر دلالت کریں اور بعض بالواسطہ، یعنی دلائل میں صراحت کے ساتھ اس کے کرنے کا مطالبہ ہو اور بعض میں کرنے والے کی مدح اور نہ کرنے والے کی مذمت ہو۔ مثلاً نماز کے دلائل تواتر کی حد تک ہیں۔ بعض میں اس کی صریح مطالبہ ہے اور بعض میں نماز پڑھنے پر مدح اور نہ پڑھنے پر مذمت و سزا کا ذکر ہے۔

خبر واحد

خبر واحد سے مراد وہ حدیث ہے جسے ایک آدمی روایت کرے اور جس میں متواتر کی شرطیں جمع نہ ہوں۔

یہ حدیث علم نظری کا فائدہ دیتی ہے یعنی وہ علم جس کا دارومدار غور و فکر اور نظر و استدلال پر ہو۔

خبر واحد کی حجیت

خبر واحد کے لفظ سے اس کا جو مفہوم دماغ میں پیدا ہوتا ہے اسی پر خبر واحد کا انحصار نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ اگر تواتر کسی ایک طبقہ میں بھی فوت ہو جائے تو اس خبر کو خبر واحد ہی کہا جاتا ہے، خواہ وہ خبر کتنے ہی افراد سے روایت کی گئی ہو یعنی اس کا صرف یہ مفہوم نہیں ہے کہ اس کا روایت کرنے والا ہر دور میں صرف ایک ہی شخص ہو۔ جو لوگ متواتر کے سوا خبر واحد کو مطلقاً حجت نہیں مانتے ان کو ذرا اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر کسی حدیث کے راوی صحابہ و تابعین کے دور میں بکثرت موجود ہوں، پھر کسی ایک دور میں اساتذہ و تلامذہ کی نقل و حرکت کی قلت و کثرت، ماحول کی موافقت یا نا موافقت کی وجہ سے کسی قدر کم ہو جائے تو کیا ایسی خبر کو بھی رد کر دینا عقلاً مناسب ہے؟ یہی وجہ ہے کہ بعض معتزلہ جو خبر واحد کے سب سے پہلے منکر ہیں اس پر غور کرتے کرتے اس فیصلہ پر مجبور ہو

گئے ہیں کہ اگر ہر دور میں اس کے راوی دو دو موجود ہوں تو پھر ایسی خبر کو حجت کہہ دیا جائے گا، اس کی تردید کی اب کوئی وجہ نہیں رہتی حالانکہ صرف دو راویوں سے کسی خبر کو متواتر نہیں کہا جا سکتا، وہ خبر واحد ہی رہتی ہے مگر اس کو ایسی قوت ضرور حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کو مفید یقین کہا جا سکتا ہے۔

پھر اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ ایسی تمام تقسیمیں اس قدر محدود وقت کے اندر اندر کی گئی ہیں کہ اس میں ذخیرہ حدیث کو بالکل ساقط الاعتبار قرار دینا بہت بڑی غفلت ہے۔ تدوین حدیث کا دور تیسری صدی ہجری کے آخر تک قریب قریب ختم ہو جاتا ہے۔ پہلی صدی تک آنحضرت ﷺ کو دیکھنے والے صحابی خود موجود تھے اور آپ کی احادیث کا ذخیرہ مختلف طرح سے ان کے پاس محفوظ تھا۔ ان کے بعد دوسری صدی ہجری شروع ہی نہیں ہونے پائی تھی کہ تدوین حدیث کا باضابطہ آغاز ہو گیا۔ اتنے قلیل عرصہ میں تمام ذخیرہ حدیث کا یک قلم مشکوک ہو جانا بعید از قیاس ہے۔

اگر تدوین حدیث صحابہ و تابعین کے دور کے بعد شروع ہوتی تو حدیث کے ثبوت میں شبہ کرنا معقول ہوتا جب کہ حفظ احادیث کا سلسلہ خود آپ کے زمانہ سے برابر متصل طور پر چلا آ رہا ہے اب اس میں شک و شبہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔

امام شافعیؒ نے اپنے رسالہ میں اس پر مستقل ایک مقالہ لکھا ہے اور آنحضرت ﷺ کے زمانہ ہی کے واقعات سے خبر واحد کی حجیت ثابت کی ہے اور اس ضمن میں وہ کچھ واقعات بیان کرتے ہیں مثلاً:

۱۔ تحویل قبلہ سے قبل اہل قباء کا قبلہ بھی بیت المقدس تھا۔ لیکن جب آنحضرت ﷺ کے قاصد (حضرت جبرائیلؑ) صبح کی نماز میں تحویل قبلہ کی خبر لے کر ان کے پاس پہنچے تو سب نے نماز کے اندر ہی اپنا رخ بیت اللہ (خانہ کعبہ) کی طرف بدل دیا۔ اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے نزدیک دینی مسائل میں خبر واحد حجت تھی۔

۲۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں میں ابوعبیدہؓ، ابوطلحہؓ اور ابی کعبؓ کو (حرمت سے پہلے) شراب پلا رہا تھا کہ دفعتاً ایک شخص آیا اس نے خبر دی کہ شراب حرام ہو گئی ہے۔ یہ سن کر فوراً ابوطلحہؓ نے کہا انسؓ اٹھو اور شراب کے مٹکے توڑ ڈالو۔ میں اٹھا اور شراب کے برتن توڑ ڈالے۔ ظاہر

ہے کہ پہلے شراب پی جا سکتی تھی لیکن یہاں صرف ایک شخص کے بیان پر اس کی حرمت کا یقین کر لیا گیا اور اس کے برتن توڑ دیے گئے۔

۳۔ خود آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے۔ آپ ﷺ نے زنا کے ایک مقدمہ میں زانی کے اقرار پر اس کو کوڑے لگانے کا حکم دیا اور جس عورت کے ساتھ اس شخص نے زنا کرنے کا اقرار کیا تھا اس کے پاس اپنے ایک صحابی انیس کو بھیجا اور فرمایا کہ اس سے دریافت کرو۔ اگر وہ بھی اقرار کر لے تو اس کو رجم کر دو ورنہ اس شخص پر حد قذف لگاؤ۔ کیوں کہ اس نے بلا شرعی ثبوت کے ایک عورت پر زنا کی تہمت کیسے رکھی۔ انیس پہنچے، اس عورت نے بھی زنا کا اقرار کیا اور وہ بھی رجم ہو گئی۔

۴۔ یزید بن شیبان کہتے ہیں کہ ہم مقام عرفات میں تھے۔ اتفاقاً ہمارا مقام آنحضرت ﷺ کی قیام گاہ سے دور تھا۔ اس دوران ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کا قاصد یہ پیام لے کر آیا کہ ہم جہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، اپنی اسی جگہ پر رہیں وہاں سے منتقل ہونے کی ضرورت نہیں۔ میدان عرفات میں جہاں بھی قیام ہو جائے فریضہ وقوف ادا ہو جاتا ہے۔

۵۔ ہجرت کے نویں سال آنحضرت ﷺ نے حضرت صدیق اکبرؓ کو حج کا امیر بنا کر بھیجا اور ان کے بعد حضرت علیؓ کو روانہ کیا کہ وہ کفار کو سورۂ توبہ کی آیت سنا کر ہوشیار کر دیں کہ انہوں نے خود بد عہدی کی ہے۔ اب اللہ کا بھی ان سے کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا۔

ان سب واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ تاجدار ختم نبوت کے دور میں بھی دین کے بارے میں ایک ثقہ اور صادق شخص کا قول کافی تھا۔

اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے جہاں جہاں بھی عامل اور قاصد بھیجے ان میں عدد کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ قیس بن عاصم، زبرقان بن بدر اور ابن زبیر وغیرہ کو اپنے اپنے قبائل کی طرف روانہ کیا۔ بحرین کے وفد کے ساتھ ابن سعید بن العاص کو بھیجا، معاذ بن جبل کو یمن کے مقابل بھیجا اور جنگ کے بعد ان کو شریعت کی تعلیم دینے کا حکم دیا، لیکن کہیں منقول نہیں ہے کہ آپ کے عاملین کے ساتھ کسی نے یہ مطالبہ کیا ہو کہ چونکہ یہ ایک ہی شخص ہے لہٰذا اسے صدقات و

عشر نہیں دیے جائیں گے۔

اس طرح آپ ﷺ نے مختلف شہروں میں بارہ قاصد روانہ فرمائے اور صرف اس بات کی رعایت کی کہ ہر سمت میں ایسا شخص بھیجا جائے جو اس نواح میں متعارف ہوتا کہ اس کے جھوٹا ہونے کا شبہ نہ رہے اور ان کو اطمینان ہو جائے کہ وہ آنحضرت ﷺ کا قاصد ہے۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ کے عاملوں اور قاضیوں کے پاس جب بھی آپ ﷺ کے خطوط پہنچے تو ہمیشہ انہوں نے ان کو نافذ کیا اور خواہ مخواہ کے شبہات کو کوئی راہ نہیں دی۔ پھر آپ کے بعد بھی آپ کے خلفا و عمال کا یہی دستور رہا۔ حتیٰ کہ مسلمانوں میں ہمیشہ ایک ہی خلیفہ، ایک ہی امام، ایک ہی قاضی اور ایک ہی امیر ہونا ایک مسلمہ حقیقت تھی جس میں کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا۔ (۹)

تاریخ تو یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے صحابی ابو سعید خدری ایک حدیث نقل کرتے ہیں اور اس سے دین کی ایک سنت ثابت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ابو ہریرہؓ ایک روایت کرتے ہیں اس سے ایک سنت ثابت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ایک صحابی کے بیان پر دین کے مسائل اور سنتیں ثابت ہوتی چلی جاتی تھیں وہاں پر کسی خبر واحد یا متواتر کا سوال نہیں اٹھایا جاتا تھا۔

خبر واحد پر عمل نہ کرنے کی صورت

ہاں یہ ممکن ہے کہ اگر کسی کے پاس خبر واحد پہنچی ہو تو اس نے اس پر اس لیے عمل نہیں کیا کہ اس کے نزدیک وہ خبر واحد صحت کو نہیں پہنچی یا وہ حدیث دو معنوں کی حامل ہو اور اس نے دوسرے معنی پر عمل کر لیا ہو یا اس کے مقابلے میں اس سے زیادہ صحیح حدیث اس کے پاس موجود ہو۔ لہٰذا جب تک وجوہ ترجیح یا اسباب ترک میں سے کوئی سبب اس کے پاس موجود نہ ہو ہرگز کسی کے لیے خبر واحد کا ترک کرنا جائز نہیں ہے۔

خبر واحد کے مراتب

اس کے ساتھ یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ ایک وہ حدیث جس پر سب کا اتفاق ہو اور ایک وہ جو کسی خاص مسئلے کے متعلق صرف ایک راوی سے روایت کی گئی ہو اس میں مختلف تاویلوں

ی گنجائش بھی نہ ہو دونوں برابر نہیں ہوسکتیں۔ پہلی حدیث کا تسلیم کرنا بلاشبہ قطعی ہے۔ اگر اس کا وئی منکر ہو تو اس سے توبہ کرائی جائے۔ لیکن دوسری قسم کی حدیث اس درجہ قوی نہیں۔ اگر اس دیث میں کوئی شک کرے تو اس سے توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اس پر بھی عمل کرنا واجب وگا۔ جب تک کہ اسباب ترک میں سے کوئی سبب نہ پایا جائے جیسا کہ گواہوں کے بیان پر فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہاں بھی غلطی اور شک کا احتمال باقی رہتا ہے لیکن پھر بھی جب تک کہ تحقیق نہ ہو ظاہر حال پر عمل کیا جاتا ہے۔ (۱۰)

خبر واحد کے خلاف مفید ظن ہونے کا سب سے بڑا استدلال

خبر واحد کی حجیت کے خلاف منکرین حدیث کے پاس سب سے بڑا استدلال یہ ہے کہ وہ مفید ظن ہوتی ہیں اور دین کی بنیاد محض ظن پر قائم نہیں ہوسکتی۔

ظن کو رائے بھی کہا جاتا ہے بلاشبہ قرآن حکیم میں رائے زنی کی ممانعت کی گئی ہے۔ یعنی محض اپنی عقل سے کسی شرعی بنیاد کے بغیر کوئی بات کہہ دینا دین کے ضابطوں میں منع ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے تھے ”میں کس آسمان کے نیچے اور کس زمین کے اوپر رہوں گا اگر میں قرآن کی کسی آیت کے بارے میں صرف اپنی رائے سے کوئی بات کہوں یا کوئی ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں“۔

حضرت ابوموسیٰ فرماتے تھے:

”اگر کسی کے پاس کوئی علم کی بات ہو تو لوگوں کو سکھلا دے اور اگر علم نہیں رکھتا تو وہ بات منہ سے نہ نکالے جس کا اس کو علم نہیں تاکہ متکلفین میں اس کا شمار نہ ہو جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تکلف یہ ہے کہ جب کسی بات کا علم نہ ہو تو بے علمی کو چھپانے کے لیے اپنی جانب سے کوئی بات گھڑ لی جائے۔ اس کو ظن کہتے ہیں۔

قرآن حکیم میں بھی کہا گیا ہے:

۱۔ ولا تقف ما لیس لک به علم (سورۂ بنی اسرائیل۔ ۳۶)

اس بات کے پیچھے نہ پڑو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔

۲۔ **قل ما اسئلکم علیه من اجر ومآ انا من المتکلفین۔** (سورۂ ص۔۸۶)

آپ کہہ دیجیے کہ میں تم سے اپنے پر کوئی مزدوری نہیں چاہتا اور میں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

۳۔ **یایها الذین امنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم۔** (سورۂ الحجرات۔۱۲)

اے ایمان والو بہت سے گمان کرنے سے بچا کرو کیونکہ بعض خیال وگمان گناہ کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

۴۔ **وما لهم به من علم ط ان یتبعون الا الظن وان الظن لا یغنی من الحق شیئا**

(سورۂ النجم۔۲۸)

اور ان کو اس کا کچھ علم نہیں۔ یہ صرف خیالات پر چلتے ہیں اور خیالات حق کی جگہ کچھ کارآمد نہیں ہوئے۔

۵۔ **ولکن ظننتم ان الله لا یعلم کثیرا مما تعملون ٥ وذالکم ظنکم الذی ظننتم بربکم اردٰکم فاصبحتم من الخسرین۔** (سورۂ حم السجدہ۔۲۲۔۲۳)

لیکن تم کو یہ خیال تھا کہ بہت سی چیزیں جو تم کرتے ہو اللہ ان کو نہیں جانتا اور تمہارے اسی خیال نے جو تم نے اپنے رب کے متعلق بنا رکھا تھا تم کو ہلاک کیا اور تم نقصان میں رہ گئے۔

۶۔ **یظنون بالله غیر الحق ظن الجاهلیة۔** (سورۂ آل عمران۔۱۵۴)

وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق جاہلوں کے سے جھوٹے خیالات رکھتے تھے۔

۷۔ **وما یتبع الذین یدعون من دون الله شرکاء ط ان یتبعون الا الظن وان هم اِلّا یخرصون۔** (سورۂ یونس۔۸۶)

جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو شریک پکارتے ہیں یہ صرف خیال کے پیچھے پڑے ہوئے

ہیں اور صرف اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔

ان تمام آیات میں ظن انہی خیالات کو کہا گیا ہے جو خود اپنے دماغ سے تراش لیے جائیں مگر وہ خواہ حد یقین کو پہنچ جائیں یا شک کے مرتبہ میں رہ جائیں۔

غرض سلف میں سے بیشتر اپنی جانب سے تخمینہ اور خیال آرائی کو ظن اور رائے کہتے ہیں جو رائے کتاب اللہ اور سنت رسول کے تحت ہو اس کو مطلقاً رائے نہیں کہا جاتا تھا اور نہ ہی وہ مذموم ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کے کلام میں اسی تقسیم کی طرف اشارہ موجود ہے۔ جس نے کوئی ایسی رائے ایجاد کی جو قرآن میں نہیں اور نہ ہی آنحضرت ﷺ کی سنت کے موافق ہے وہ نہیں جانتا کہ کل قیامت میں اس کا حشر کیا ہوگا۔

ان الفاظ سے رائے کی دو قسمیں ظاہر ہوتی ہیں ایک وہ جو کتاب اللہ میں موجود ہو دوسری وہ جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو اور سنت رسول سے اس کی موافقت نہ ہو۔

اس کے مقابلے میں علم اس کو کہا جاتا ہے جو قرآن و حدیث نے بتایا یا صحابہ سے منقول ہوا۔

ان کلمات سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ رائے اور علم، اسی طرح ظن اور علم سلف میں دو متقابل چیزیں تھیں۔ واقعی بات کو علم اور تخمینی باتوں کو ظن کہا جاتا تھا۔

قرآن کی ان تمام آیات میں اس طرح کے ظن اور رائے سے اجتناب کی تلقین کی گئی جو کتاب اللہ اور سنت رسول کے مخالف ہو لیکن وہ ظن جو کہ ادلہ شرعیہ کے مطابق پیدا ہوا ہو، قرآن نے اس کی کہیں مذمت نہیں کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ سلف میں اور قرآنی محاورات میں ظن کا اطلاق زیادہ تر بے تحقیق بات پر اور علم کا اطلاق واقعی بات پر کیا گیا ہے۔ ان آیات میں ان ظنی احکام کے خلاف جو ظنی احادیث سے ثابت ہوں کوئی اشارہ تک بھی نہیں ہے۔ یہ وہ ظنون ہیں جو حق کے صریح خلاف محض اپنی دماغی ایجاد اور خواہش نفس کی بنا پر پیدا کر لیے گئے۔

خبر واحد کے مفید یقین ہونے پر قرآن سے ایک استدلال

ابن حزم لکھتے ہیں کہ ایک قسم کی حدیث وہ ہے جس کی خبر دینے والا ایک ہی شخص ہے جس سے وہ نقل کرتا ہے وہ بھی ایک ہی شخص ہے۔ اسی طرح ایک ہی ایک راوی کے واسطے سے خبر آنحضرت ﷺ تک متصل ہو جاتی ہے اگر یہ واسطے حسب ضابطہ سچے اور عادل اشخاص ہیں تو اس پر عمل کرنا بھی واجب ہے۔ حارث بن اسد محاسبی، حسین بن علی الکرابیسی کا یہی عقیدہ تھا۔ ترجمان السنہ میں مولانا بدر عالم کے مطابق قرآن حکیم بھی اس کی صحت پر شاہد ہے۔

فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین و لینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون

ایسا کیوں نہیں ہوا کہ ہر جماعت میں سے ایک طائفہ دین کی تعلیم کے لیے نکل کر ہوتا تا کہ جب وہ لوٹ کر اپنی قوم کے پاس آتا تو ان کو ڈراتا شاید وہ بھی بری باتوں سے بچنے لگتے۔

لغت میں طائفہ کسی چیز کے ایک حصے کو کہتے ہیں۔ اس لیے اس کا اطلاق ایک شخص سے لے کر جماعت تک ہو سکتا ہے۔ لہٰذا آیت بالا کی بموجب ہر جماعت کا فرض ہے کہ جب ایک شخص یا کوئی جماعت ان کو دین کی باتیں پہنچائے تو وہ ان کو قبول کریں اور مانیں۔

قرآن حکیم میں ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

یایها الذین امنوا ان جآء کم فاسق بنبا فتبینوا ان تصیبوا قوما بجهالة فتصبحوا علی ما فعلتم ندمین۔ (سورۃ الحجرات۔

اے ایمان والو! جب کوئی فاسق شخص تمہارے سامنے کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بے تحقیق کسی قوم پر چڑھائی کر دو۔ بعد میں اپنے کیے پر نادم و شرمندہ ہو جاؤ۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے خبر واحد کو قبول کیا ہے۔ اگر ایک شخص

خبر قابل قبول نہ ہوتی تو وہ اس کو تحقیق کی بجائے مکمل طور پر رد کرنے کا حکم دیتا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب سے خبریں پہنچانے کے لیے بھی جو ذریعہ اختیار فرمایا ہے وہ بھی خبر واحد ہی ہے یعنی اللہ کا رسول ایک ہی ہوتا ہے۔ اگر دین میں اصولی لحاظ سے ایک شخص کی خبر قابل قبول نہ ہوتی تو اللہ کے تمام رسول اپنے اپنے وقت میں تنہا اپنی خبر پر دوسروں کو ایمان لانے کا حکم کیسے دے سکتے تھے۔ قرآن کریم نے جہاں بھی زور دیا ہے راوی کی عدالت اور اس کے صدق پر زور دیا ہے۔ حتیٰ کہ صرف زنا کے ایک معاملہ کے سوا جان کے معاملہ میں بھی دو شخصوں کے بیان کا اعتبار کر لیا ہے اور کسی جگہ بھی خبروں کی تصدیق کے لیے تواتر کی شرط نہیں لگائی۔

نقل کے اعتبار سے خبر واحد کی اقسام

نقل یعنی ہم تک پہنچنے کے اعتبار سے خبر واحد کی درج ذیل تین قسمیں ہیں۔

ا۔ مشہور ۲۔ عزیز ۳۔ غریب

مشہور اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ حدیث کی اس قسم کو مشہور اس لیے کہتے ہیں کہ وہ عام اور ظاہر ہوتی ہے۔

مشہور اصطلاحی

اس سے مراد وہ حدیث ہے جسے تین یا تین سے زائد افراد نقل کریں بشرطیکہ تواتر کی حد تک کو نہ پہنچے، مثلاً حدیث:

ان الله لا يقبض العلم انتزاعا ينتزعه۔ (متفق علیہ، ترمذی، احمد، ابن ماجہ)

مشہور غیر اصطلاحی

اس سے مراد ایسی خبر ہے جو معتبر شرطوں کے بغیر لوگوں کی زبانوں پر مشہور ہو جائے۔ خواہ اس کی ایک سند ہو یا ایک سے زیادہ سندیں ہوں یا سرے سے ہی اس کی کوئی سند نہ ہو۔

مذکورہ بالا تفسیر و تعریف کے علاوہ مشہور کی کچھ مزید تفسیرات بھی ہیں جن کو مشہور غیر اصطلاحی کی تعبیر کہا جاتا ہے۔

فقہا و اصولین کے نزدیک مشہور کی تعریف

فقہا اور اصولین کے مطابق مشہور وہ حدیث ہے جس کے ناقل عہد صحابہ میں تین سے م اور بعد کے زمانوں میں تین سے زائد ہوں اور وہ حدیث امت میں مقبول ہو یعنی "مشہور" ان کے نزدیک متواتر اور خبر واحد کے درمیان ایک قسم ہے۔

مشہور عرفی

مشہور عرفی وہ حدیث ہے جو زبان زد عام و خاص ہو خواہ اس میں شہرت کی شرائط موجود ہوں یا نہ ہوں۔ مشہور عرفی کی، ان طبقات کے اعتبار سے جن کے درمیان ان کی شہرت ہوتی ہے، درج ذیل چھ متعدد اقسام ہیں۔

۱۔ جو خاص طور پر محدثین میں مشہور ہو۔ مثلاً حضرت انسؓ کی حدیث ہے کہ ''بے شک رسول اللہ ﷺ نے ایک ماہ تک رکوع کے بعد دعائے قنوت پڑھی اور رعل اور زکوان قبیلوں پر بددعا کی۔

۲۔ جو علما اور عوام میں مشہور ہو۔ مثلاً یہ حدیث ''کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔'' (متفق علیہ)

۳۔ جو فقہا میں مشہور ہو۔ مثلاً یہ حدیث کہ اللہ تعالیٰ کو حلال اور جائز کاموں میں سے ناپسند کام طلاق ہے۔

۴۔ جو اصولیوں کے درمیان مشہور ہو۔ مثلاً یہ حدیث کہ میری امت سے خطا اور نسیان (کا گناہ) اٹھالیا گیا ہے اور جس پر انہیں مجبور کیا جائے (اس کا بھی گناہ) اٹھالیا گیا ہے۔

۵۔ جو نحویوں کے درمیان مشہور ہو۔ مثلاً یہ حدیث 'صہیب کتنا ہی اچھا بندہ ہے اگر وہ اللہ سے خوف کرتا تو اس کی نافرمانی نہ کرتا (حالانکہ اس حدیث کی کوئی اصل اور سند نہیں ہے)

۶۔ جو عام لوگوں میں مشہور ہو۔ مثلاً یہ حدیث کہ ''جلدی شیطان کی طرف سے ہے''۔

مشہور کا حکم

مشہور حدیث خواہ اصطلاحی ہو یا غیر اصطلاحی، اسے مطلقاً صحیح یا غیر صحیح سے موصوف نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ بعض مشہور صحیح ہیں، بعض حسن اور بعض ضعیف ہیں اور بعض موضوع بھی ہیں۔

لیکن اگر مشہور اصطلاحی ثابت ہو جائے تو یہ اس خبر کے لیے ایک عمدہ خوبی اور نمایاں فضیلت ہے کہ وہ اسے عزیز اور غریب حدیث پر راجح قرار دیتی ہے۔

عزیز

لغوی تعریف

لفظ عزیز صفت مشتبہ کا صیغہ ہے اور عَـزَّ یَـعِـزُّ سے مشتق ہے قلیل اور نادر کے معنی میں عَـزَّ یَـعَـزُّ سے مشتق ہے مضبوط اور ٹھوس کے معنی میں۔ اس کا نام عزیز اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کا وجود قلیل اور نادر ہے یا اس لیے کہ یہ دوسری سند کی وجہ سے قوی اور مضبوط ہو جاتی ہے۔

اصطلاحی تعریف

عزیز حدیث اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے راوی سند کے تمام طبقوں میں دو سے کم نہ ہو

تعریف کی شرح

یعنی سند کے طبقوں میں سے کسی طبقے میں بھی دو سے کم راوی نہ ہوں لیکن اگر سند کے طبقوں میں تین یا زائد راوی پائے جائیں تو کوئی ضرر اور مضائقہ نہیں بشرطیکہ دو راوی باقی خواہ وہ ایک ہی طبقے میں ہوں۔ کیوں کہ اعتبار ہمیشہ سند کے طبقوں میں سے کم طبقے کا ہوتا ہے۔

یہی تعریف راجح ہے، حافظ ابن حجر نے بھی نخبۃ الفکر میں اسے ہی تحریر فرمایا ہے۔ جب بعض علما نے کہا ہے کہ عزیز یہ ہے کہ دو یا تین راوی روایت کریں۔

مثلاً امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت انسؓ سے بیان کیا ہے اور امام بخاری نے ابو ہریرہؓ سے بھی روایت کیا ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”تم میں سے کوئی بھی وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے اس کے والدین اور اس کی اولاد سے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں“۔

اسے حضرت انسؓ سے قتادہؒ اور عبدالعزیز بن صہیبؒ نے بیان کیا ہے پھر قتادہ سے شعبہ اور سعید نے بیان کیا ہے پھر ہر ایک سے ایک جماعت نے روایت لی ہے۔

غریب

لغوی تعریف

یہ صفت مشبہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں اکیلا، منفرد یا جو اپنے رشتہ داروں سے دور ہو۔

اصطلاحی تعریف

وہ حدیث جسے ایک ایک مفرد راوی بیان کرے غریب کہلاتی ہے، خواہ وہ سند کے تمام طبقوں میں یا بعض طبقوں میں اور خواہ ایک ہی طبقے میں ہو اور سند کے باقی طبقوں میں موجود زیادتی کوئی نقصان اور ضرر نہیں دے گی کیوں کہ اعتبار اول طبقے کا ہوگا۔

غریب حدیث کا دوسرا نام

بہت سے علما نے غریب پر ایک اور نام کا بھی اطلاق کیا ہے وہ ہے فرد۔ اس طرح یہ لفظ غریب کا مترادف ہے۔ بعض علما نے ان دونوں لفظوں میں فرق کیا ہے اور ہر ایک کو ایک مستقل نوع قرار دیا ہے لیکن حافظ ابن حجرؒ انہیں لغتاً اور اصطلاحاً مترادف قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ بے شک اہل اصلاح ان میں کثرت استعمال اور قلت استعمال کے اعتبار سے فرق کرتے ہیں تو فرد کا اطلاق اکثر وہ فرد مطلق پر کرتے ہیں جب کہ یہ غریب کا اطلاق اکثر غریب نسبی پر کرتے ہیں۔

ذیل میں غریب حدیث کی دو اقسام غریب مطلق اور غریب نسبی کا بیان ہے

غریب مطلق

غریب مطلق وہ حدیث ہے جس کی اصل سند میں غرابت (تفرد) واقع ہو یعنی اس کی اصل سند میں اسے ایک راوی بیان کر رہا ہے (اصل [illegible] میں مراد صحابی والی طرف ہے اور صحابی سند

کی کڑیوں میں سے ایک حلقہ اور ایک کڑی ہے یعنی جب ایک حدیث کو اکیلا صحابی بیان کردے تو اس کا نام غریب مطلق یا فرد مطلق ہیں۔

اس کی مثال **انما الاعمال بالنیات** (متفق علیہ) کی حدیث ہے کہ

اس حدیث کو اکیلے حضرت عمر بن خطابؓ نے بیان کیا ہے۔ بعض اوقات یہ تفرد آخر سند تک برقرار رہتا ہے جب کہ بعض اوقات اس ایک متفرد راوی سے (تفرد کو) زیادہ راوی بیان کرتے ہیں۔

غریب نسبی

غریب نسبی وہ حدیث ہے جس میں غرابت سند کے درمیان ہو۔ یعنی اصل سند میں ایک سے زیادہ راوی بیان کریں پھر ان راویوں سے ایک اکیلا راوی بیان کرے۔ حدیث کی اس قسم کا نام غریب نسبی یا فرد نسبی اس لیے رکھا گیا ہے کہ کہ اس میں تفرد ایک معین شخص کی نسبت سے واقع ہوا ہے۔

غریب نسبی کی قسمیں

غریب یا فرد کی کچھ انواع ایسی بھی موجود ہیں جن کا غریب نسبی میں شمار اور اعتبار کیا جاسکتا ہے کیوں کہ ان میں غرابت مطلقاً نہیں ہوتی بلکہ ان میں غرابت ایک معین شخص کی نسبت سے حاصل ہوتی ہے مثلاً:

(الف) جس حدیث کو صرف ایک ثقہ راوی بیان کرے جیسے محدثین کا یہ کہنا کہ اس کو صرف فلاں ثقہ راوی نے بیان کیا ہے۔

(ب) ایک معین راوی دوسرے معین راوی سے اکیلا بیان کرے جیسے محدثین کا کہنا کہ اس حدیث کو فلاں اکیلا فلاں سے بیان رہا ہے اگرچہ وہ حدیث دوسری سندوں سے اس کے علاوہ راویوں سے مروی ہورہی ہو۔

(ج) ایک ملک والے دوسرے علاقے والوں سے بیان کریں جیسے محدثین کا قول ہے کہ اس حدیث کو اہل مکہ اہل شام سے روایت کررہے ہیں۔

(د) ایک شہر والے یا علاقے والے دوسرے شہر والوں یا علاقے والوں سے اکیلے بیان کریں جیسے محدثین کا یہ کہنا کہ اس حدیث کو اکیلے بصرہ والے مدینہ والوں سے یا اس حدیث کو اکیلے شام والے حجاز والوں سے بیان کر رہے ہیں۔

متن اور سند کے اعتبار سے غریب

متن اور سند کے لحاظ سے غریب اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے متن کو صرف ایک راوی بیان کرے۔

سند کے اعتبار سے غریب نہ کہ متن کے اعتبار سے

ایسی حدیث جس کے متن کو صحابہؓ سے ایک جماعت نے بیان کیا ہے پھر اسی حدیث کو دوسرے صحابی سے ایک اکیلا راوی بیان کرے سند کے لحاظ سے غریب کہلاتی ہے۔ خواہ متن غریب نہ بھی ہو اور اسی قسم کے متعلق امام ترمذی فرماتے ہیں غریب من ھذا الوجہ کہ یہ حدیث اس سند کے اعتبار سے غریب ہے۔ (۱۱)

خبر واحد کی تقسیم دوم

قوت وضعف کے اعتبار سے

خبر واحد خواہ وہ مشہور ہو یا عزیز یا غریب اپنی قوت وضعف کے اعتبار سے یا ثبوت وعد ثبوت کے اعتبار سے مقبول ومردود، دو قسموں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

۱۔ مقبول

مقبول وہ خبر یا حدیث ہے جس کی خبر دینے والے کا صدق غالب وراجح ہو یا جس راویوں کا صدق ان کے کذب پر راجح وغالب قرار دیا گیا ہو۔ مقبول کی حیثیت یہ ہے کہ اس ساتھ حجت پکڑنا اور اس پر عمل کرنا واجب ہے۔

۲۔ مردود

مردود وہ خبر یا حدیث ہے جس کے خبر دینے والے کے صدق کو غالب وراجح نہ کہا گیا ہو۔ مردود کی حیثیت یہ ہے کہ نہ تو اس سے حجت پکڑی جائے گی اور نہ اس پر عمل کیا جائے گا۔

خبر مقبول ومردود کی آگے مزید اقسام اس طرح ہیں۔

مقبول کی قسمیں

خبر مقبول کی اپنے مراتب کے مختلف ہونے کے اعتبار سے دو بڑی اور بنیادی قسمیں ہیں۔

۱۔ صحیح ۲۔ حسن

پھر ان میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں ہیں۔

اسی طرح مقبول کی چار قسمیں بن جاتی ہیں۔

۱۔ صحیح لذاتہ ۲۔ حسن لذاتہ ۳۔ صحیح لغیرہ ۴۔ حسن لغیرہ

صحیح لذاتہ

لغوی تعریف

لفظ صحیح لغوی طور پر سقیم و مریض کے الٹ کے طور پر استعمال ہوتا ہے جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے اجسام کے ساتھ متعلق ہے جب کہ وہ حدیث اور دوسرے معنوی مفاہیم کے لیے مجازاً استعمال ہوتا ہے۔

اصطلاحی تعریف

اصطلاح میں صحیح حدیث یا خبر کی تعریف یہ ہے کہ وہ حدیث یا روایت جس کی سند اپنے قائل تک متصل ہو۔ اس کے تمام راوی عادل اور ضابطہ ہوں اور اپنے ہی جیسوں سے نقل کریں اور یہ کیفیت روایت کی سند کے شروع سے لے کر آخر تک قائم رہے۔ نیز اس میں کوئی شذوذ (انفرادیت) یا کوئی مخفی علت بھی نہ ہو۔

تعریف کی مزید وضاحت

حدیث صحیح مذکورہ بالا کی تعریف میں چند اہم نکات مخفی ہیں جن کی وضاحت اس طرح ہے۔

۱۔ اتصال سند

اس کے معنی یہ ہیں کہ حدیث کے ہر راوی نے اس روایت کو اپنے سے اوپر والے راوی سے براہ راست حاصل کیا ہو اور یہ کیفیت شروع سند سے آخر تک قائم رہی ہو۔

۲۔ راویوں کا عادل ہونا

یعنی اس کے تمام راوی مسلمان، عاقل اور بالغ ہوں، فسق و فجور سے دور اور اخلاق و آداب کے منافی امور سے بھی مبرا ہوں۔

۳۔ راویوں کا ضابطہ ہونا

یعنی اس کے تمام راوی حفظ اور ضبط تام سے موصوف ہوں اور یہ ''حفظ وضبط'' ذہنی حافظہ (یادداشت) اور کتاب کی حفاظت دونوں پر مشتمل ہے۔

۴۔ شذوذ نہ ہونا

اس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی ثقہ راوی اپنے سے زیادہ ثقہ راوی کی مخالفت نہ کر رہا ہو۔

۵۔ مخفی علت نہ ہونا

اس سے مراد یہ ہے کہ اس حدیث کے سند و متن میں بظاہر صحیح وسالم ہونے کے باوجود کوئی ایسا مخفی نقص نہ ہو جو اس کے صحیح ہونے پر اثر انداز ہو سکتا ہو۔

صحیح حدیث کے لیے بنیادی شرط

مذکورہ بالا توضیح سے واضح ہوا کہ حدیث کے صحیح ہونے کے لیے جن پانچ شرطوں کا یکجا پایا جانا ضروری ہے وہ یہ ہیں:

اتصال سند، عدالت راوی، حفظ وضبط راوی، عدم علت اور عدم شذوذ

مثال

امام بخاری اپنی جامع الصحیح میں لکھتے ہیں:

''ہمیں حدیث بیان کی عبداللہ بن یوسف نے، وہ کہتے ہیں ہمیں خبر دی مالک نے، وہ ابن شہاب (زہری) سے بیان کرتے ہیں، وہ محمد بن جبیر مطعم سے، وہ اپنے باپ جبیر بن مطعمؓ سے بیان کرتے ہیں، انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ آپ ﷺ نماز مغرب میں سورۃ طور کی قرأت کر رہے تھے۔ (۱۲)

یہ حدیث صحیح ہے کیونکہ:

الف۔ اس کی سند متصل ہے کیوں کہ اس کے ہر راویؒ نے اپنے استاد سے سنا ہے۔

ب۔ اس کے تمام راوی عادل اور ضابطہ ہیں مثلاً:

عبداللہ بن یوسف	ثقہ متقن ہیں۔
مالک بن انس	امام اور حافظ ہیں۔
ابن شہاب الزہری	فقیہ، حافظ، متفق علیٰ جلالتہ واتقانہ
محمد بن جبیر	ثقہ ہیں۔
جبیر بن مطعم	صحابی ہیں۔

''ھذا حدیث صحیح وھذا حدیث غیر صحیح'' کا مفہوم

محدثین کرام جب کسی حدیث کے بارے میں ''ھذا حدیث'' صحیح (یہ حدیث صحیح ہے) کا کم لگاتے ہیں تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس حدیث میں مذکورہ بالا پانچ کی پانچ شرطیں پوری وجود ہیں تاہم اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ حدیث نفس الامر میں قطعی طور پر بغیر کسی شبہ کے صحیح ہے، کیوں کہ کسی بڑے سے بڑے ثقہ کو بھی خطا یا نسیان کا لاحق ہو جانا کوئی بعید نہیں ہوتا۔ اور جب ہ کسی حدیث کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ ''ھذا حدیث'' غیر صحیح یہ حدیث صحیح نہیں ہے تو اس کا فہوم یہ ہوتا ہے کہ مذکورہ پانچ شرطیں یا ان میں سے کچھ اس میں موجود نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ یں کہ یہ حدیث نفس الامر میں قطعی طور پر جھوٹی ہے کیوں کہ وہم و نسیان کے مریض سے بھی صحیح ا ر سچ بات کا بیان ہو جانا کوئی مشکل یا بعید نہیں ہے۔ (۱۳)

یا کسی سند کو یقینی طور پر ''اصح الاسانید'' ''صحیح ترین سند'' کہا جا سکتا ہے؟

راجح یہی ہے کہ یقینی طور پر مطلقاً کسی سند کے بارے میں ''اصح الاسانید'' کا حکم لگانا ست نہیں ہے کیوں کہ سند کے مراتب صحت کی مطلوبہ شرائط کے تحت مختلف ہوتے ہیں اور انتہائی ں درجہ کی تمام شرائط کا کسی ایک سند میں پایا جانا بہت ہی نادر بات ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ملق طور پر کسی سند کے بارے میں ''اصح الاسانید'' حکم لگانے سے احتراز ہی کیا جائے۔

یح احادیث میں اولین تصنیف

وہ کتاب جس میں رسول اللہ ﷺ کی صرف صحیح ترین حدیثیں جمع کی گئی ہیں ''صحیح بخاری'' اور بعدازاں ''صحیح مسلم'' ہے۔ امت مسلمہ نے ان کی قبولیت پر اجماع کیا ہے۔

ان دونوں میں کون سی کتاب زیادہ صحیح ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بخاری ان دونوں میں سے زیادہ صحیح اور بہت سے علمی فوائد کی حامل ہے نیز یہ کہ بخاری کی احادیث میں اتصال سند کی شرط نہایت شدید اور رجال انتہائی ثقہ ہیں۔ علاوہ ازیں فقہی نکات واستنباط اس قدر زیادہ ہیں کہ صحیح مسلم میں نہیں ہیں۔

لیکن دونوں کتابوں میں مذکورہ ترجیح مجموعی حیثیت سے ہے ورنہ صحیح مسلم میں بعض احادیث ایسی ہیں جو صحیح بخاری سے بھی زیادہ صحیح ہیں۔ علما کی ایک جماعت صحیح مسلم کی اولیت کی بھی قائل ہے مگر پہلا قول ہی راجح ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ ان دونوں صحیحین میں تمام کی تمام صحیح احادیث نہیں سموئی گئیں بلکہ امام بخاری کا کہنا ہے کہ ''میں نے اس کتاب میں صرف صحیح احادیث کو جمع کیا ہے علاوہ ازیں بہت سی صحیح احادیث کو طوالت کے خوف سے چھوڑ دیا ہے۔''

امام مسلم کہتے ہیں کہ ''میرے نزدیک جو حدیثیں صحیح تھیں ان تمام کو میں نے اس تالیف میں جمع نہیں کیا ہے بلکہ وہی احادیث درج کیں ہیں جن پر علما محدثین کا اجماع تھا۔''

علما یہ بھی کہتے ہیں کہ ان دونوں آئمہ سے رہ جانے والی صحیح احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ امام بخاری خود فرماتے ہیں ''میں نے جو صحیح حدیثیں چھوڑی ہیں اور ان کو اپنی تالیف میں درج نہیں کیا ان کی تعداد بہت زیادہ ہے مزید فرماتے ہیں کہ مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح احادیث یاد ہیں۔

صحیح حدیث کے مراتب

۱۔ سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ کوئی حدیث ''اصح الاسانید'' سے روایت شدہ ہو مثلاً مالک عن نافع عن ابن عمر۔

۲۔ دوسرے درجہ میں وہ حدیث آتی ہے جو درجۂ اول سے قدرے کم درجہ کے رجال کی سند سے مروی ہو مثلاً حماد بن سلمہ عن ثابت عن انس۔

۳۔ تیسرے درجہ میں وہ حدیث آتی ہے جس کے راوی کم سے کم درجۂ صحت یعنی صفت ثقاہت سے موصوف ہوں مثلاً سہیل بن ابی صالح عن ابیہ عن ابی ہریرہ۔

اس کے ساتھ درج ذیل تقسیم بھی ملحق ہے جس میں صحیح حدیث کو سات مراتب میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔ جس حدیث پر بخاری و مسلم کا اتفاق ہو اور یہ سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔

۲۔ وہ حدیث جو صرف بخاری میں ہو۔

۳۔ وہ حدیث جو صرف مسلم میں ہو۔

۴۔ وہ حدیث جو بخاری اور مسلم دونوں کی شرطوں کے مطابق ہو مگر ان میں بیان نہ ہوئی ہو۔

۵۔ وہ حدیث جو صرف بخاری کی شرطوں پر ہو مگر امام صاحب نے بیان نہ کیا ہو۔

۶۔ جو صرف مسلم کی شرط پر ہو مگر انہوں نے بیان نہ کیا ہو۔

۷۔ جو ان دونوں کے علاوہ آئمہ کے نزدیک صحیح ہو۔

شرط شیخین

اس بارے میں کئی اقوال ہیں مگر سب سے راجح بات جو کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ شرط شیخین یا ان میں سے کسی ایک شرط سے مراد یہ ہے کہ کوئی حدیث اسی سند سے روایت کی گئی ہو جو ان دونوں کے ہاں یا ان میں سے کسی ایک کے ہاں بیان شدہ ہو اور اس سند میں وہی صفات ہوں جن کا ان آئمہ نے اعتبار و التزام کیا ہو۔

متفق علیہ

علمائے حدیث جب کسی حدیث کے بارے میں متفق علیہ کہتے ہیں تو اس سے مراد شیخین (بخاری و مسلم) کا اس حدیث کو صحیح کہنے پر اتفاق ہوتا ہے نہ کہ "اتفاق امت"۔ تاہم علامہ ابن

الصلاح کہتے ہیں کہ اس مفہوم میں اتفاق امت بھی ضروری ہے اور وہ انہیں حاصل ہی ہے کیوں کہ امت نے ان شیخین کی احادیث کو شرف قبولیت سے نوازا ہے۔ (۱۵)

کیا کسی صحیح حدیث کا عزیز ہونا ضروری ہے؟

کسی حدیث کے صحیح ہونے کے لیے ان کا عزیز ہونا ضروری نہیں ہے۔ ''عزیز'' کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کم از کم دو سندوں سے مروی ہو۔ صحیحین میں ایسی کئی احادیث موجود ہیں جو اصطلاحاً ''غریب'' ہیں (یعنی ان کی صرف ایک ہی سند ہوتی ہے)

الحسن لذاتہ

لغوی تعریف

یہ صفت مشبہ کا صیغہ ہے جو حسن سے مشتق ہے جس کے معانی جمال اور خوبصورتی کے ہیں۔

اصطلاحی تعریف

حدیث حسن کی اصطلاحی تعریف میں علما کا کسی حد تک اختلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حسن صحیح اور ضعیف کے مابین کی ایک قسم ہے۔ اس بارے میں علما محدثین کے مختلف اقوال اس طرح ہیں:

امام خطابی کہتے ہیں:

حدیث حسن وہ حدیث ہے جس کا مصدر معلوم اور رجال معروف و مشہور ہوں۔ عام احادیث اسی نوع اور اسی درجہ کی ہیں۔ اکثر علما اسے قبول کرتے ہیں اور فقہا اس سے استدلال کرتے ہیں۔ (۱۶)

امام ترمذی کہتے ہیں:

جس حدیث کی سند میں کوئی راوی متہم بالکذب نہ ہو، نہ ہی وہ شاذ ہو نیز اس طرح کی کئی

سندوں سے بھی مروی ہو تو وہ ہمارے نزدیک حسن ہوتی ہے۔ (۱۷)

امام ابن حجر کہتے ہیں:

وہ خبر واحد جس کے راوی عادل اور ضابطہ ہوں، سند متصل ہو، حدیث معلل یا شاذ بھی نہ ہو تو وہ ''صحیح لذاتہ'' ہے اور اگر ضبط خفیف ہو تو حسن لذاتہ ہے۔ (۱۸)

علما حدیث نے ان تعریفات میں سے امام ابن حجر کی تعریف کو سب سے زیادہ عمدہ قرار دیا ہے یعنی وہ حدیث جس کے راوی عادل مگر خفیف الضبط ہوں۔

حدیث حسن کا حکم

حجت پکڑنے میں یہ حدیث صحیح ہی کی طرح ہے اگرچہ قوت میں اس سے کم درجے کی ہے اس لیے فقہا اس کی حجت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ بڑے بڑے محدثین اور اصولی بھی اس سے حجت پکڑنے کے قائل ہیں۔

بعض تساہل برتنے والوں نے اسے صحیح کی انواع میں درج کیا ہے جیسے حاکم، ابن حبان اور ابن خزیمہ وغیرہ نے باوجود اس کے کہ وہ اقرار کرتے ہیں کہ حسن حدیث پہلے مذکور شدہ صریح صحیح حدیث سے کم درجے پر ہے۔ (۱۹)

حدیث حسن کی مثال

''ہم سے قتیبہ نے حدیث بیان کی، کہ جعفر بن سلیمان الضبعی نے ہم سے بیان کیا کہ ابی عمران الجونی سے روایت ہے، ابوبکر اپنے والد ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ میں نے انہیں سنا جب دشمن بھی سامنے موجود تھا، وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جنت کے دروازے تلواروں کے سائے تلے ہیں۔''

ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اس حدیث کو حسن اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کی سند کے چاروں راوی ثقہ ہیں لیکن جعفر بن سلیمان الضبعی مرتبہ صدوق کے حامل ہیں۔ یعنی ''سچا'' اور اس میں اس کے خفیف الضبط ہونے کا اشارہ ہے لہٰذا حدیث صحیح کی بجائے حسن کے

مرتبے پر آ گئی۔

محدثین کے قول "حدیث صحیح الاسناد" یا "حسن الاسناد" کا مرتبہ و مقام

۱۔ محدثین کا کہنا "ھذا حدیث صحیح الاسناد" اس کا درجہ ان کے اس قول سے کم ہے "ھذا حدیث صحیح"

۲۔ ایسے ہی ان کا کہنا "ھذا حدیث حسن الاسناد" یہ کم درجے میں ہے بہ نسبت ان کے اس قول کے "ھذا حدیث حسن"

کیوں کہ کبھی سند صحیح یا حسن ہوتی ہے جب کہ شذوذ یا علت کی وجہ سے متن صحیح یا حسن نہیں ہوتا گویا جب محدث کہتا ہے "ھذا حدیث صحیح"، تو وہ اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ اس حدیث میں صحت کی پانچ شرطیں مکمل طور پر موجود ہیں لیکن جب وہ یہ کہتا ہے کہ "ھذا حدیث صحیح الاسناد" تو وہ صحت کی شرطوں میں سے صرف تین کی ضمانت دیتا ہے جو یہ ہیں۔

سند کا متصل ہونا، راویوں کا عادل ہونا اور راویوں کا ضابطہ ہونا۔

وہ شذوذ یا علت کی نفی کی ضمانت نہیں دیتا کیونکہ اس کے پاس ان کا ثبوت نہیں ہوتا۔ لیکن جب کوئی حافظ (محدث سے بلند درجے والا) جس کے قول پر اعتماد کیا جاتا ہے اگر اسی پر اکتفا کرے کہ "ھذا حدیث صحیح الاسناد" اور اس کی کوئی علت بیان نہ کی گئی ہو تو ظاہر اور غالب بات یہی ہے کہ یہ متن صحیح ہو گا۔ کیونکہ متن میں اصل اور حقیقت علت اور شذوذ کا نہ ہونا ہے۔ (۲۰)

امام ترمذی کی اصطلاح "حدیث حسن صحیح" کا مفہوم

"حسن صحیح" کی ترکیب بظاہر ایک مشکل ترکیب ہے کیوں کہ اصطلاحی طور پر حسن کا مرتبہ صحیح سے ادنیٰ ہے تو اس فرق کے باوجود ان کو ایک ہی مرتبہ میں کیونکر اکٹھے کیا جا سکتا ہے۔ علما محدثین نے امام ترمذی کی اس اصطلاح کے کئی جواب دیے ہیں اور ان میں سب سے عمدہ توجیح حافظ ابن حجر ہی کی ہے جسے حافظ سیوطی نے بھی پسند کیا ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے۔

(الف) اگر حدیث کی دو یا دو سے زیادہ سندیں ہوں تو معنی یہ ہو گا کہ یہ حدیث ایک سند کے لحاظ

سے حسن اور دوسری کے لحاظ سے صحیح ہے۔

(ب) اور اگر اس کی ایک ہی سند ہو تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک طبقہ علما کے ہاں یہ حدیث حسن اور دوسرے طبقہ کے ہاں صحیح ہے۔

الصحیح لغیرہ

تعریف

وہ حسن لذاتہ حدیث کہ جب اسی جیسی یا اس سے قوی حدیث دوسری سند سے روایت کی جائے تو اس کا نام صحیح لغیرہ رکھتے ہیں کیوں کہ اس میں صحت خود پہلی سند کی وجہ سے نہیں آتی بلکہ وہ اس کے علاوہ دوسری سند کے ملنے سے آتی ہے۔

صحیح لغیرہ کا مرتبہ

یہ حسن لذاتہ سے بلند مرتبہ ہوتی ہے لیکن صحیح لذاتہ سے نچلے درجے پر ہوتی ہے۔

مثال

محمد بن عمرو ابی سلمہ سے وہ ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر مجھے اپنی امت کے لیے مشقت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں انہیں ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دے دیتا۔

امام ابن الصلاح نے اس حدیث کی سند پر یوں تبصرہ کیا ہے کہ محمد بن عمرو بن علقمہ علما صدق وصفا میں شمار ہیں لیکن حفظ واتقان میں کمزور ہیں۔ اسی کمزوری حافظہ کی بنا پر بعض محدثین نے ان کو ضعیف کہا ہے جب کہ بعض انہیں ان کی بزرگی اور صداقت کے پیش نظر ثقہ کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی حدیث حسن ہوئی۔ اس حدیث کو جب دوسری اسانید کی تائید حاصل ہو گئی اور ایک راوی کے ضعیف الحدیث ہونے کی وجہ سے متوقع اندیشہ جاتا رہا اور مذکورہ معمولی کمزوری کی کمی پوری ہو گئی تو یہ سند صحیح قرار پائی اور مرتبہ صحیح تک پہنچ گئی۔ (۲۱)

الحسن لغیرہ

تعریف

وہ ضعیف حدیث جس کی سندیں زیادہ ہوں اور اس کے ضعیف ہونے کا سبب راوی کا فاسق یا کاذب ہونا نہ ہو۔

اس تعریف کا حاصل یہ ہے کہ ضعیف حدیث دو امور کی وجہ سے حسن کے درجے کو پہنچ جاتی ہے۔

۱۔ وہ حدیث ایک یا زیادہ دوسری سندوں سے مروی ہو اور وہ سندیں پہلی سند جیسی ہوں یا اس سے قوی ہوں۔

۲۔ اس حدیث کے ضعف کا سبب راوی کے حافظے کی کمزوری ہو یا سند میں انقطاع ہو یا کوئی راوی مجہول ہو۔

الحسن لغیرہ کا مقام و مرتبہ

حسن لغیرہ حدیث حسن لذاتہ سے نچلے درجے کی ہوتی ہے۔ لہٰذا اسی بنیاد پر جب حسن لذاتہ اور حسن لغیرہ باہم متعارض ہوں تو حسن الذاتہ کو مقدم اور راجح سمجھا جائے گا۔

حکم

حدیث کی یہ قسم مقبول اور قابل حجت شمار ہوتی ہے۔

مثال

سنن ترمذی میں وارد شدہ اس حدیث کو محدث ترمذی نے حسن قرار دیا ہے۔

شعبه عن عاصم بن عبيد الله عن عبدالله بن عامر بن ربيعة عن ابيه ان امراة من بنى فرارة تزوجت علىٰ نعلين فقال رسول الله ﷺ ارضيت من نعسک وما لک بنعلين؟ قالت : نعم فاَجازه

یعنی بنوفرارہ کی عورت نے جوتوں کی ایک جوڑی پر بطور حق مہر نکاح کرایا

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تو اپنے بارے میں اس حال پر راضی اور خوش ہے تو وہ کہنے لگی ہاں! تو آپ ﷺ نے اس نکاح کو جائز قرار دیا اور نافذ کیا۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس بارے میں حضرت عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت ابو حدرد سے مرویات موجود ہیں۔

مذکورہ سند میں عاصم راوی اپنے حافظے کی کمزوری کی وجہ سے ضعیف ہے لیکن چونکہ یہ حدیث دوسرے طرق سے مروی ہے اس لیے امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔

خبرِ مردود یا خبرِ غیر مقبول

معانی و مفہوم

خبر غیر مقبول یا مردود سے مراد وہ روایت ہوتی ہے جس کے بیان کرنے والے کا صدق راجح نہ ہو۔ اور اس کا سبب صحیح حدیث کی شرطوں میں بیان شدہ کسی ایک یا ایک سے زیادہ شرطوں کا فقدان ہوتا ہے۔

خبر غیر مقبول کی اقسام اور اس کے مردود ہونے کے اسباب

علمائے حدیث نے غیر مقبول خبر کی چالیس سے زیادہ اقسام بیان کی ہیں اور ان میں سے تقریباً ہر ایک کا کوئی نہ کوئی مخصوص نام بھی ہے سوائے چند ایک کے۔ ایسی تمام روایات کو علمائے حدیث ''ضعیف'' کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ کسی حدیث کے غیر مقبول یا مردود ہونے کے اسباب تو بہت زیادہ ہیں لیکن ان میں سے دو اسباب نہایت اہم ہیں۔

۱۔ سلسلۂ سند میں کسی راوی کا ساقط ہونا۔

۲۔ یا اس سے کسی راوی میں کسی طرح کے طعن (عیب) کا ثابت ہونا۔

ان دو اسباب کی بنیاد پر ہی غیر مقبول احادیث کی کئی قسمیں بنتی ہیں جن کے متعلق ہم بحث کریں گے مگر سب سے پہلے ہم حدیث کے ضعیف ہونے کا تجزیہ کرتے ہیں۔

حدیثِ ضعیف

لغوی تعریف

ضعیف لفظ قوی اور طاقتور کی ضد ہے جو حسی اور معنوی دونوں قسم کی کیفیتوں کی وکالت کرتا ہے۔ یہاں اس لفظ کی معنوی کیفیت ہی مراد ہے۔

اصطلاحی مفہوم

اصطلاحی طور پر ضعیف سے مراد روایت ہے جو حسن حدیث کی صفات سے عاری ہو ضعیف کہلاتی ہے یعنی اس کی شرطوں میں سے کوئی نہ کوئی شرط مفقود ہو۔

علامہ بیقونی اپنے اشعار میں لکھتے ہیں:

ہر وہ روایت جو مرتبہ حسن سے قاصر ہے، ضعیف ہے اور اس کی بہت سے اقسام ہیں۔

ضعیف کے مراتب ودرجات

ضعیف روایات اپنے ضعف کی کمی بیشی کی وجہ سے کئی مراتب ودرجات کی ہوتی ہیں بعض تو صرف ضعیف ہیں اور بعض شدید ضعیف ہیں مگر ان میں ''موضوع'' سب سے بڑھ کر ناپسندید اور بری قسم ہے۔ (۲۲)

ضعیف ترین سندیں

جس طرح صحیح روایات کی بحث میں اصح الاسانید کا تذکرہ گزرا ہے۔ اس کی بنیاد پر علمانے ضعیف کی بحث میں ان اسانید کا ذکر کیا ہے جو ضعیف ترین ہیں اور امام حاکم نیشاپوری نے ''اوھی الاسانید'' کا بڑا مجموعہ ذکر کیا ہے۔

ضعیف حدیث بیان کرنے کا حکم

محدثین کے نزدیک ضعیف احادیث اور جن احادیث کی سندوں میں تساہل ہے کو، ان کا ضعف بیان کیے بغیر، درج ذیل بیان کرنا دو شرطوں کے ساتھ جائز ہے۔ اس کے برعکس موضوع احادیث کو، ان کا موضوع ہونا بیان کیے بغیر، بیان کرنا ناجائز ہے۔

۱۔ ان کا تعلق عقائد سے نہ ہو جیسے صفات باری تعالیٰ ہیں۔

۲۔ حلال و حرام سے متعلق شرعی احکام کے بیان میں نہ ہوں۔

سند میں اسقاط کے باعث حدیث کا غیر مقبول ہونا

سند میں اسقاط سے مراد ہے کہ سلسلہ سند میں سے کوئی ایک یا زیادہ راوی ذکر نہ ہوں او یہ عدم ذکر کسی سے عمداً ہو یا سہواً، سند کے شروع میں ہو یا درمیان یا آخر میں، نیز یہ عدم ذکر ظاہ اور واضح ہو یا مخفی اور پوشیدہ۔ یہ سب صورتیں ''سقط من الاسناد'' میں آتی ہیں۔ سند میں یہ اسقاط اسقاط جلی اور اسقاط خفی دو طرح کا ہوتا ہے۔

اسقاط جلی

اسقاط کی یہ صورت بالکل واضح ہوتی ہے کہ ماہرین فن اور طلبہ علوم حدیث سب ہی اس سے باخبر ہوتے ہیں اور اس کی کئی صورتیں ہوتی ہیں مثلاً راوی کی اپنے شیخ سے ملاقات ثابت نہیں ہوسکی۔ یا تو ان کا دور ہی مختلف تھا یا دور تو ایک تھا مگر سلسلہ سند ثابت کرنے کے لیے اجازۃ وجادہ وغیرہ کچھ بھی حاصل نہ ہوسکا تھا۔

لہٰذا اسانید کی بحث و تحقیق کے لیے طالب علم کو راویوں کی پوری تاریخ مثال کے طور پ تواریخ میلاد، تاریخ وفیات، زمانہ طالب علمی وغیرہ کی پوری معلومات حاصل ہونا ضروری ہیں۔ علمائے حدیث نے ظاہری سقط کو مقام سقط اور ساقط شدہ راویوں کی تعداد کے لحاظ سے چار نام دیے ہیں۔

۱۔ المعلق ۲۔ المرسل ۳۔ المعضل ۴۔ المنقطع

اسقاط خفی

یعنی وہ سقط جو واضح اور ظاہر نہ ہو۔ اس کی معرفت صرف ان ماہر علمائے فن کو ہی حاصل ہوتی ہے جو مختلف اسانید، ان کی علل اور دیگر باریکیوں سے واقف ہوتے ہیں۔ اس کی درج ذیل د صورتیں ہوسکتی ہیں۔

۱۔ مدلس ۲۔ مرسل خفی

المُعلّق

لغوی تعریف

یہ لفظ علق فعل سے مفعول بہ ہے جس کے معنی ہیں لٹکانا۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ اُس ﷺ نے ایک چیز سے دوسری چیز کو لٹکا دیا یا باندھ دیا۔ حدیث کی اس نوع کو معلق کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ سند اوپر کی جانب سے (یعنی جس طرف صحابی ہوتا ہے) متصل مگر دوسری جانب سے منقطع ہوتی ہے گویا یہ سند اس چیز کی مانند ہو گئی جو کسی چھت کے ساتھ لٹکی یا بندھی ہوئی ہو۔

اصطلاحی تعریف

جس حدیث کی ابتدائے سند سے ایک یا زیادہ راوی اکٹھے ہی حذف کر دیے گئے ہوں اسے حدیث معلق کہتے ہیں۔

ابتدائے سند سے راویوں کا حذف دو طرح سے ہوتا ہے۔

(الف) یا تو پوری کی پوری سند حذف کر کے یوں کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔۔۔۔۔۔

(ب) یا یہ کہ حدیث بیان کرتے وقت صرف صحابی یا کبھی تابعی اور صحابی کا ذکر دیتے ہیں اور باقی کو حذف کر دیتے ہیں۔ (۲۳)

مثال

صحیح بخاری کی کتاب الصلوٰۃ کے باب ما یذکر فی الفخذ میں ایک حدیث ہے وقال ابو موسیٰ، غطی النبی ﷺ رکبتیہ حین دخل عثمان۔

یعنی ابو موسیٰ کہتے ہیں کہ جب عثمان رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے گھٹنے ڈھانپ لیے۔

مذکورہ روایت معلق ہے کیوں کہ امام بخاری نے شروع سند کے تمام راویوں کو سوائے صحابی حضرت ابو موسیٰ کے، حذف کر دیا ہے۔

معلق کا حکم

علمائے حدیث کے نزدیک معلق حدیث مردود اور غیر مقبول شمار ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں مقبول کی شرائط میں سے ایک شرط اتصال سند مفقود ہے۔ اس کی سند کے شروع سے ہی ایک یا زیادہ راوی مفقود ہوتے ہیں اور ان راویوں کے حالات کا بھی علم نہیں ہوتا وہ کیسے ہیں۔

بخاری اور مسلم میں بیان شدہ معلق احادیث کا حکم

معلق حدیث نامقبول ہوتی ہے۔ یہ ایک عام اور مطلق حکم ہے لیکن اگر کسی ایسی کتاب میں کوئی معلق حدیث آ جائے جس میں صرف صحیح احادیث جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہو مثلاً صحیحین تو اس کا حکم خصوصی ہوگا۔

(الف) جو روایات صیغۂ جزم یعنی یقینی الفاظ کے ساتھ مروی ہوں ان کی منسوب الیہ راوی کی طرف سے نسبت ہوتی ہے (نہ کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف) مثلاً قال، ذکر۔

(ب) اور جو روایات صیغۂ تمریض یعنی غیر یقینی الفاظ کے ساتھ بیان ہوں مثلاً قیل، ذکر حکی۔ ان کی اپنے منسوب الیہ راوی کی طرف بھی نسبت صحیح نہیں ہوتی۔

ان میں صحیح، حسن یا ضعیف سب ہی کا امکان ہوتا ہے لیکن ان میں کوئی حدیث از حد ردّی اور لایعنی نہیں ہوتی۔ لہٰذا ان کا مناسب حکم لگایا جائے گا۔

مُرسَل

لغوی تعریف

یہ لفظ اُرسَل فعل سے اسم مفعول ہے جس کا معنی ہے چھوڑ دینا۔ گویا حدیث بیان کرنے والے نے سند کو ویسے ہی چھوڑ دیا اور کسی معین و معروف راوی کے ساتھ اسے مقید نہیں کیا۔

اصطلاحی تعریف

وہ حدیث جس کی سند کے آخر سے تابعی کے بعد والا راوی ساقط ہو مرسل کہلاتی ہے۔

مرسل حدیث کی صورت

مرسل احادیث کی صورت یہ ہوتی ہے کہ تابعی خواہ صغیر ہو یا کبیر، اس طرح کہے کہ...... قال رسول اللہ ﷺ کذا...... او فعل کذا...... او فعل بحضرتہ کذا، یعنی رسول اللہ ﷺ نے ایسے کہا ...... یا ایسے کیا...... یا آپ ﷺ کی موجودگی میں ایسے کیا گیا۔ محدثین کرام مذکورہ بالا صورت کو مرسل سے تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً صحیح مسلم، کتاب البیوع میں ہے۔

حدثنی محمد بن رافع، ثنا حطین، ثنا اللیث، عن عقیل، عن ابن شهاب، عن سعید بن المسیب ان رسول الله ﷺ نهی عن المزابنة

یعنی رسول اللہ ﷺ نے بیع مزابنہ سے منع فرمایا ہے۔

اس سند کے آخری راوی سعید بن المسیب تابعی کبیر ہیں جو براہ راست رسول اللہ ﷺ سے، اپنا درمیانی واسطہ ذکر کیے بغیر، حدیث بیان کر رہے ہیں۔ انہوں نے سند کے آخر سے کم از کم صحابہ کا ذکر ساقط کر دیا ہے اور عین امکان ہے کہ صحابی کے علاوہ کوئی اور تابعی بھی محذوف ہو۔

فقہا اور اصولیین کے ہاں ”مرسل“

مذکورہ صورت محدثین کے ہاں ”مرسل“ کہلاتی ہے مگر فقہا واصولیین کے ہاں سند کا انقطاع کسی بھی شکل میں ہو، وہ اسے مرسل سے تعبیر کرتے ہیں۔ خطیب بغدادی کا بھی یہی مذہب ہے۔

حدیث مرسل کا حکم

مرسل روایت دراصل ضعیف اور مردود احادیث کی ایک قسم ہے کیونکہ اس میں اتصال سند مفقود ہوتا ہے جب کہ یہ صحیح حدیث کی ایک لازمی شرط ہے اور محذوف راوی کا کوئی تعین نہیں ہوتا۔ ممکن ہے وہ کوئی غیر صحابی ہو اور اس صورت میں اس کے غریب ہونے کا احتمال بڑھ جاتا ہے۔

تاہم محدثین اور آئمہ کا حدیث مرسل کے حکم اور اس کے حجت ہونے کے بارے میں اختلاف ہے کیوں کہ سند کا یہ انقطاع ایک خصوصی نوعیت کا حامل ہے۔ اس صورت میں بالعموم صحابی ہی ساقط ہو جاتا ہے اور صحابہ سب کے سب عادل شمار ہوتے ہیں اور ان کی معرفت متعین نہ بھی ہو کوئی حرج نہیں بہر حال اس بارے میں درج ذیل تین قول مشہور ہیں:

۱۔ مرسل ضعیف اور مردود ہے۔

جمہور محدثین اور اکثر اصولین اور فقہا مرسل روایت کو ضعیف اور مردود شمار کرتے ہیں اور ان کی دلیل یہ ہے کہ محذوف راوی نامعلوم ہے۔ ممکن ہے وہ صحابی کے علاوہ کوئی اور ہی ہو اور اس کا حال نامعلوم ہے۔

۲۔ مرسل صحیح اور قابل حجت ہے۔

امام ابو حنیفہ، مالک اور احمد کے مشہور قول کے مطابق مرسل روایت صحیح اور قابل احتجاج ہوتی ہے جب کہ علما کا ایک طبقہ ایک اضافی شرط یہ عائد کرتا ہے کہ ارسال کرنے والا ثقہ ہو اور اس کی شہرت یہی ہو کہ وہ صرف ثقہ ہی سے ارسال کرتا ہو۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ کوئی بھی ثقہ اور معتمد تابعی یہ بات جائز اور حلال نہیں جانتا کہ موثوق واسطہ کے بغیر یوں ہی کہہ دے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور اس نے کسی با اعتماد ثقہ راوی سے سنا ہی نہ ہو''۔

۳۔ مرسل مشروط طور پر مقبول ہے۔

امام شافعیؒ اور بعض دیگر آئمہ کرام مرسل روایت کی مقبولیت کے لیے چار شرطیں عائد کرتے ہیں۔ تین کا تعلق ارسال کرنے والے روای سے ہے اور ایک اس حدیث سے متعلق ہے اور وہ یہ ہے:

۱۔ ارسال کرنے والا کبار تابعین میں سے ہو۔

۲۔ اگر اس سے مرسل عنہ کی تفصیل معلوم کی جائے تو کسی ثقہ کا نام بتائے۔

۳۔ اور اگر دیگر با اعتماد حافظ حدیث بھی اس روایت میں مرسل مذکور کے شریک ہوں تو وہ اس کی مخالفت نہ کریں۔

ان شرائط کے ساتھ درج ذیل میں سے بھی کوئی ایک شرط اس کے ساتھ موجود ہو:

الف۔ یہ حدیث کسی دوسری سند سے متصل طور پر ثابت ہو۔

ب۔ یا دوسری اسانید کے ذریعے بھی یہ روایت مرسل طور پر ثابت شدہ ہو مگر ارسال کرنے والا بعض دیگر علما کا شاگرد ہو جو پہلے مرسل کے اساتذہ کے علاوہ ہوں۔

ج۔ یا کسی صحابی کے قول کے موافق ہو۔

د۔ یا اکثر اہل علم اس کے مطابق فتوے دیتے ہیں۔

جب ان شرائط کے ذریعے مرسل روایات صحیح طور پر ثابت ہو جائیں اور ان کی اسانید بھی متعدد ہوں تو اگر ان کے معارض کوئی غریب مگر صحیح حدیث بھی ثابت ہو اور ان میں جمع ممکن نہ ہو تو ان مراسیل کو ترجیح دی جائے گی۔

صحابی کی مرسل

کوئی صحابی آپ ﷺ کا کوئی فرمان یا آپ کا کوئی فعل بیان کرے مگر اس نے براہ راست آپ ﷺ سے نہ سنا ہو، نہ مشاہدہ کیا ہو تو اسے مرسل صحابی کہتے ہیں اور اس امر کا باعث کئی اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً صحابی کا کم عمر ہونا، متاخر الاسلام ہونا یا ویسے ہی مجلس سے غائب ہونا وغیرہ۔ اس نوع کی احادیث کی تعداد جو صغار صحابہ سے مروی ہیں بہت زیادہ ہے۔

مرسل صحابی کا حکم

جمہور علما محدثین کا صحیح اور مشہور قول یہ ہے کہ صحابی کی مرسل روایت صحیح اور قابل حجت ہوتی ہے کیوں کہ صحابی کا تابعین سے روایت کرنا بہت ہی نادر ہے اور جب وہ تابعین سے روایت کرتے ہیں تو واضح بیان کر دیتے ہیں اور جب وہ وضاحت نہ کریں اور ’’قال رسول اللہ ﷺ‘‘ کے الفاظ استعمال کریں تو قاعدہ یہ ہے کہ انہوں نے ضرور کسی دوسرے صحابی سے سنا ہوتا ہے اور صحابی کا عدم ذکر حدیث کے لیے کسی طرح مضر نہیں ہوتا‘‘۔ (۲۴)

المعضّل

لغوی اور اصطلاحی مفہوم

یہ لفظ "اَعْضَلَ" فعل سے اسم مفعول ہے۔ اعضلہ کا معنی ہے، ایک نے دوسرے کو عاجز کر دیا، تھکا دیا، یا مشکل میں ڈال دیا۔

اصطلاحی طور پر اس سے مراد وہ حدیث ہے جس کی سند میں سے دو یا دو سے زیادہ راوی یکے بعد دیگرے ایک ہی جگہ سے ساقط ہوں مثلاً:

امام حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں اس کی مثال یوں پیش کی ہے:

القعنبی عن مالک انه بلغه عن ابا هريره رضى الله عنه قال قال رسول الله ﷺ للمملوک طعامه و کسوته بالمعروف ، ولا يكلف من العمل الاما يطيق

یعنی مالک پر غلام کا حق ہے کہ اسے کھانا دے اور لباس دے معروف طریقے سے اور اس سے وہی کام لیا جائے جو وہ کر سکتا ہے۔

امام حاکم کہتے ہیں کہ یہ روایت معضل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مالک اور ابو ہریرہؓ کے مابین دو راوی یکے بعد دیگرے ایک ہی جگہ سے ساقط ہیں اور ہمیں اس کی خبر موطا کے علاوہ ایک دوسری سند سے حاصل ہوئی ہے جس میں اس کی تفصیل یوں ہے: **عن مالک عن محمد بن عجلان عن ابیه عن ابی هریرہؓ۔**

معضل حدیث کا حکم

یہ حدیث مرسل اور منقطع کی بہ نسبت زیادہ کمزور شمار ہوتی ہے کیوں کہ اس میں ساقط شدہ راویوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور اس کے ضعف پر علمائے حدیث کا اختلاف ہے۔

معضل کا معلق کی بعض صورتوں کے ساتھ جمع ہونا

بعض اوقات کچھ اسانید میں معضل اور معلق اسانید کی صفات جمع ہو جاتی ہیں اور ان میں عموم خصوص من وجہ کی نسبت ہوا کرتی ہے۔ یعنی ایک صورت میں یہ دونوں جمع ہو جاتی ہیں مگر دو صورتوں میں جدا جدا رہتی ہیں۔

الف۔ جمع ہونے کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ جب کسی سند کی ابتدا سے صرف دو راوی یکے بعد دیگرے حذف کر دیے گئے ہوں تو ایسی سند ایک ہی وقت میں معلق ہونے کے ساتھ معضل بھی ہوگی۔

ب۔ اور دو صورتوں میں اس سے جدا رہنے کی کیفیت یوں ہوتی ہے:

۱۔ جب کسی سند کے درمیان سے یکے بعد دیگرے دو راوی ایک ہی جگہ سے محذوف ہوں تو ایسی روایت صرف معضل ہوگی نہ کہ معلق۔

۲۔ اور جب کسی سند کی ابتدا سے صرف ایک راوی محذوف ہو تو ایسی روایت صرف معلق کہلائے گی۔ (۲۵)

المنقطع

لغوی اور اصطلاحی مفہوم

انقطاع اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اتصال کی ضد ہے۔ لغوی معنی ہوئے کٹ جانا، کاٹنے ا توڑنے والا۔

اصطلاح میں اس سے مراد وہ حدیث ہے جس کی سند متصل نہ ہو اور یہ انقطاع بے شک کسی بھی وجہ سے واقع ہوا ہو۔

یعنی ہر وہ سند جس میں سلسلۂ روایت کسی بھی مقام سے کسی بھی طور پر متصل نہ رہے منقط کہلائے گی۔ یہ انقطاع خواہ سند کے شروع میں ہو، درمیان میں ہو یا آخر میں اور ایک راوی ساق ہوا ہو یا دو۔ اس سے واضح ہوا کہ ''مرسل، معلق یا معضل'' سب ہی اس میں شامل ہیں۔ مگر متا علمائے حدیث کے ہاں ''منقطع'' کا اطلاق اسانید کی انہی کیفیات پر کیا جاتا ہے جو مرسل، معلق معضل نہ ہوں۔ متقدمین میں بھی یہی استعمال غالب ہے اسی لیے نووی منقطع کی بحث میں بیا کرتے ہیں۔

''عام طور پر اس کا اطلاق اس روایت پر ہوتا ہے جس میں تابعی سے پہلے والا کوئی راو براہ راست صحابی سے روایت کرے۔''

متاخر اہل حدیث کے ہاں منقطع کی تعریف

متاخرینِ اہل حدیث کے مطابق وہ روایت جس کی سند متصل نہ ہو مگر مرسل، معلق، معضل کے علاوہ انقطاع کی جو صورت بھی ہو منقطع کہلاتی ہے۔

☆ یعنی راوی کا حذف اگر ابتدائے سند میں ہو تو...... معلق

☆ اگر آخر سند میں ہو تو...... مرسل

☆ اور اگر ایک ہی جگہ سے دو راوی مسلسل حذف ہوں تو...... معضل

ان کے علاوہ کو منقطع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر نخبۃ الفکر اور اس کی شرح میں ایسے ہی بیان کرتے ہیں۔ نیز خیال رہے کہ یہ انقطاع سند میں ایک، دو یا تین مقامات پر بھی ہو سکتا ہے

مثلاً:

عبدالرزاق عن الثوری عن ابی اسحق عن زید بن یثع عن حذیفة مرفوعا "ان ولیتموها ابا بکر فقوی، امین

یعنی اگر تم خلافت کو ابوبکر کے سپرد کرو گے تو تم اسے قوی، باصلاحیت اور امین پاؤ گے۔

مذکورہ بالا سند میں ثوری اور ابواسحق کے درمیان سے "شریک" نامی ایک راوی ساقط ہے، کیوں کہ ثوری نے ابواسحق سے براہ راست نہیں سنا ہے اور انقطاع کی یہ صورت ایسی ہے کہ اس پر مرسل، معلق یا معضل کی تعریف صادق نہیں آتی اسے صرف منقطع کہا جائے گا۔

ایسی روایات بہ اتفاق علما ضعیف ہوتی ہیں کیوں کہ ان میں حذف شدہ راوی مجہول ہوتا ہے۔(۲۶)

المدلّس

تدلیس سے مراد

مدلس تدلیس سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ لغت میں سامان کے عیب کو خریدار سے پوشیدہ کھنے اور چھپانے کو تدلیس کہتے ہیں۔ یہ لفظ "دلس" سے لیا گیا ہے۔ اس کا مفہوم "اندھیرا" یا "اندھیرے کا اختلاط" ہوتا ہے۔

احادیث کی یہ نوع اسی لیے اس نام سے موسوم کی گئی ہے کہ جب کسی نے طالب حدیث سے اس کا عیب چھپا لیا اور اس کی حقیقت کو اندھیرے اور اخفا میں رکھا تو وہ روایت مدلس ہو گئی۔

صطلاحی طور پر سند کے عیب کو چھپانا اور اس کی تحسین کو ظاہر کرنا تدلیس کہلاتا ہے۔

تدلیس کی اقسام

ا۔ تدلیس الاسناد

علمائے حدیث نے تدلیس کی اس نوع کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ امام ابوبکر احمد بن ع البزاز اور امام ابوحسن بن القطان کی اختیار کردہ صحیح اور دقیق تعریف اس طرح ہے۔

"راوی اپنے کسی ہم عصر سے جس سے کہ اسے سماع حاصل ہو، کوئی ایسی روایت بیا کرے جو درحقیقت اس سے نہیں بن سکا مگر اس کی جانب نسبت کرتے ہوئے سماع کی تصریح نہ کرے۔"

اس تعریف کی شرح اس طرح ہے کہ راوی نے کسی شیخ سے کچھ روایات سنی ہوتی ہیں، ا کچھ نہیں بلکہ کسی اور سے سنی ہوتی ہیں تو راوی کوئی حدیث اپنے معروف شیخ کی طرف نسبت کر بیان کر دیتا ہے۔ حالانکہ یہ حدیث جو وہ بیان کر رہا ہے اس سے نہیں سن سکا اور اصل شیخ جس سنی ہے اس کا نام کسی وجہ سے حذف کر دیتا ہے اور ایسے موقع پر قال یا عن وغیرہ کے الفاظ استعما کرتا ہے جن میں سماع کا شبہ اور احتمال تو ہے مگر تصریح نہیں اور تصریح سماع سے گریز کی وجہ بھی ی ہوتی ہے کہ کہیں اسے کذاب لوگوں میں شمار نہ کر لیا جائے۔ خیال رہے کہ ایسے ساقط کردہ شیخ ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔

تدلیس الاسناد اور مرسل خفی میں فرق

امام ابوالحسن بن القطان مذکورہ تعریف کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ تدلیس الاسناد ا رسال میں فرق یہ ہے کہ ارسال میں راوی کسی ایسے شیخ سے روایت کرتا ہے جس سے اس کا سما ثابت ہی نہیں ہوتا جب کہ تدلیس میں سماع ثابت ہوتا ہے یعنی مدلس اور مرسل (ارسال خفی) دونوں ہی اپنے شیوخ سے غیر مسموع روایت بیان کرتے ہیں جب کہ الفاظ سماع کے موہوم ہو ہیں لیکن مدلس نے صرف زیر بحث روایت یا روایات سنی نہیں ہوتیں۔ علاوہ ازیں بعض دیگر ہوتی ہیں جب کہ مرسل (ارسال خفی) نے اپنے شیخ سے بالکل ہی کوئی روایت نہیں سنی ہوتی۔ نہ

زیر بحث اور نہ کوئی اور البتہ محض ملاقات ہوئی ہوتی ہے یا اس کا زمانہ پایا ہوتا ہے مثلاً:

امام حاکم معرفۃ علوم الحدیث میں اپنی سند سے بیان کرتے ہیں۔

علی بن خشرم قال انا ابن عیینه عن الزهری فقیل له، سمعة من الزهری؟ فقال لا ولا ممن سمعه من الزهری. حدثنی عبدالرزاق عن معمر عن الزهری.

مذکورہ مثال میں ابن عیینہ نے اپنے اور زہری کے مابین دو راوی ساقط کر دیے ہیں چونکہ ابن عیینہ کو زہری سے بھی سماع حاصل ہے اور ایک عام طالب علم یہ وہم کر سکتا ہے کہ زہری سے براہ راست روایت کی جا رہی ہے۔

۲۔ تدلیس تسویہ

تدلیس کی یہ قسم بھی دراصل تدلیس الاسناد ہی کی ایک صورت ہے۔ اس کا معنی و مفہوم یہ ہے کہ راوی اپنے شیخ سے روایت کرے مگر اثنا سند سے دو ثقہ راویوں کے درمیان میں سے کسی ضعیف راوی کو ساقط کر دے جب کہ ان دونوں راویوں کی آپس میں ملاقات ثابت شدہ ہو۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ راوی اپنے ثقہ شیخ سے کوئی حدیث روایت کرتا ہے اور وہ ثقہ کسی ضعیف راوی سے اور وہ کسی ثقہ راوی سے روایت کرتا ہے جب کہ یہ دونوں ثقہ آپس میں ملاقات کر چکے ہوں تو یہ مدلس راوی جس نے پہلے ثقہ سے حدیث سنی، اس درمیان والے ضعیف کو گرا دیتا ہے اور ونوں ثقہ راویوں کو آپس میں ملا دیتا ہے اور ان دونوں کے مابین سماع کے محتمل الفاظ استعمال کرتا ہے اور بظاہر پوری سند کو ثقات کی سند بنا دیتا ہے۔ مثلاً

امام ابی حاتم کتاب العلل میں روایت کرتے ہیں: **اسحق بن راهویه عن بقیة حدثنی ابو وهب الاسدی عن نافع عن ابن عمر ...... حدیث لا تحمدو اسلام لمراحتی تعرفو اعقده رابه**

یعنی کسی شیخ کے اسلام کی اس وقت تک تعریف نہ کرو جب تک کہ اس کے عقیدہ کو اچھی طرح جانچ پرکھ نہ لو۔

امام ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ میرے والد نے بتایا کہ اس سند میں تفصیل ہے جسے سمجھنے والے بہت کم ہیں۔ اس سند کی حقیقت درج ذیل ہے۔

عبیدا للہ بن عمرو (ثقہ) عن اسحاق بن ابی فروۃ (ضعیف)

عن نافع عن ابن عمر عن النبی ﷺ

عبیداللہ بن عمرو کی کنیت ابو وہب ہے اور وہی اسدی ہے بقیہ نے اسے اس کی کنیت او نسبت کے ساتھ بیان کر دیا ہے تا کہ اس کے اصل نام کی طرف خیال نہ جائے حتیٰ کہ جب اس کے شیخ اسحاق بن ابی فروہ کا نام بھی چھوڑ دیا گیا تو اس کا پتہ ہی نہیں چل سکتا کہ وہ کون ہے۔

۳۔ تدلیس الشیوخ

اس کا مطلب و مفہوم یہ ہے کہ راوی اپنے کسی شیخ سے کوئی حدیث روایت کرے جس سے کہ اسے سماع حاصل ہے مگر بیان کرتے ہوئے اس کا ایسا نام، کنیت یا نسب اور وصف ذکر کرے جو معروف نہ ہو اور اس عمل سے غرض بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ پہچانا نہ جا سکے۔

مثلاً ابوبکر بن مجاہد جو آئمہ قرأ میں سے ہیں وہ اپنی بعض روایات میں یوں کہہ دیتے ہیں حدثنا **عبداللہ بن ابی عبداللہ** اور اس سے ان کی مراد ”ابوبکر بن ابی داود السجستانی“ ہوتے ہیں۔

تدلیس کا حکم

تدلیس الاسناد کے بارے میں علما کہتے ہیں کہ یہ ایک نہایت مکروہ عمل ہے۔ اکثر علما نے اس کی مذمت کی ہے۔ امام شعبہ کے بیانات تو اس بارے میں بہت ہی سخت اور شدید ہیں۔ مثلاً یہ کہ تدلیس جھوٹ ہی کے ہم پلہ ہے۔

تدلیس الشیوخ کے بارے میں علمائے حدیث کی رائے یہ ہے کہ یہ اس سے بھی بڑھ کر بری اور قبیح ہے۔ حافظ عراقی کا کہنا ہے کہ جان بوجھ کر تدلیس انسویہ کا ارتکاب بہت بڑا عیب ہے۔“

تدلیس الشیوخ کے بارے میں رائے یہ ہے کہ یہ تدلیس الاسناد سے قدرے کم مکروہ ہے کیونکہ مدلس اس میں کسی راوی کو ساقط نہیں کرتا بلکہ مروی عنہ کی پہچان کو مشکل بنا دیتا ہے اور سامع

کو حقیقت تک پہنچنے میں خاصی دقت ہوتی ہے اس لیے مقاصد کے اعتبار سے اس کے احکام بھی مختلف ہیں۔ (۲۷)

تدلیس کے اسباب

الف۔ تدلیس الشیوخ پر آمادہ کرنے والے مقاصد چار ہیں۔

۱۔ شیخ کا ضعیف ہونا یا اس کا غیر ثقہ ہونا۔

۲۔ اس کی وفات کا موخر ہونا اس طرح کہ اس شیخ سے سماع کرنے میں اس راوی کی مشارکت اس سے چھوٹی اور کم درجے کی جماعت کر رہی ہو۔

۳۔ شیخ کا چھوٹی عمر کا ہونا (صغر سنی) اس طرح کہ وہ اس راوی سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔

۴۔ اس سے روایت کرنے کی کثرت یعنی اس سے بہت سی احادیث بیان کرتا ہے اس لیے کثرت سے اس کے نام کو ایک ہی شکل وصورت میں بیان کرنا پسند نہیں کرتا۔

ب۔ تدلیس اسناد پر ابھارنے والے پانچ مقاصد

۱۔ سند کے عالی ہونے کا وہم دلانا۔

۲۔ جس شیخ سے لمبی حدیث سنی اب اس سے کچھ حصے کا فوت ہو جانا۔

باقی تین اسباب وہی ہیں جو تدلیس الشیوخ میں پہلے تین مذکور ہوئے ہیں۔

مدلس کی مذمت کی اسباب

۱۔ جس سے سنا نہیں، اس سے سماع کا وہم دلانا۔

۲۔ کشف وبیان اور وضاحت سے ہٹ کر احتمال وشبہ کے انداز میں روایت کرتا ہے۔

۳۔ اسے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ جو تدلیس میں کر رہا ہوں اگر اس کی تصریح کر دوں تو یہ وضاحت پسندیدہ نہیں ہوگی۔

مدلس کی روایت کا حکم

مدلس کی روایت کے قبول کرنے میں علما نے کئی اقوال پر اختلاف کیا ہے۔ مشہور قول یہ

ہیں۔

- ☆ مدلس کی روایت مطلقاً غیر مقبول اور مردود ہے اگر چہ وہ سماع کی صراحت کرے کیونکہ خود تدلیس ایک جرح ہے یعنی وہ راوی کو ضعیف کر دیتی ہے۔
- ☆ اس میں تفصیل ہے۔
- ☆ اگر راوی سماع کی صراحت کرے تو اس کی روایت قبول ہوگی۔ یعنی اگر وہ سمعت یا اس طرح کا کوئی لفظ کہے تو اس کی روایت قبول ہوگی۔
- ☆ اگر راوی سماع کی صراحت نہ کرے تو اس کی روایت قبول نہیں کی جائے گی یعنی اگر وہ ''عن'' یا اس جیسا کوئی لفظ کہے تو اس کی روایت قبول نہیں ہوگی۔ (۲۸)

تدلیس معلوم کرنے کے دو طریقے

الف۔ مدلس راوی از خود وضاحت کرے بجائے اس کے کہ اسے دریافت کیا جائے۔

ب۔ کوئی ماہر فن امامِ حدیث اپنے علم و معرفت اور تحقیق و جستجو کی بنا پر تفصیل بتائے۔

المرسل خفی

معنی و مفہوم

مرسل، اَرْسَلَ فعل سے اسم مفعول کا صیغہ ہے جس کے معنی ''چھوڑ دینا'' یا آزاد کر دینا'' کے ہیں۔ حدیث میں اس سے مراد ہے کہ بیان کرنے والے نے سند کو متصل کرنے کی بجائے ویسے ہی چھوڑ دیا۔

- ☆ خفی اسے کہتے ہیں جو جلی یا واضح نہ ہو۔ چونکہ ارسال کی یہ نوعیت واضح نہیں ہوتی اور خاص بحث و تحقیق کرنے کے بغیر اس کی حقیقت نہیں کھلتی اس لیے اسے ''مرسل خفی'' کا نام دیا گیا ہے۔

اصطلاحی طور پر مرسل خفی سے مراد وہ حدیث ہے جو کہ راوی اپنے کسی ہم عصر یا ملاقات

کردہ شخص سے کوئی ایسی روایت بیان کرے، جو اس سے نہ سنی ہو مگر الفاظ ایسے استعمال کرے جس میں سماع اور غیر سماع کا احتمال ہو، مثلاً سنن ابن ماجہ میں ہے:

عمر بن عبد العزيز عن عقبه بن عامر مرفوعا رحم الله حارس الحرس

ترجمہ: اسلام کے پہرہ دینے والوں پر اللہ تعالیٰ رحم کرے۔

اس سند میں عمر بن عبدالعزیز کی ملاقات عقبہ بن عامر سے ثابت نہیں ہے اور اس کا تذکرہ امام ترمذی نے اپنی کتاب ''اطراف'' میں کیا ہے۔

مرسل خفی کی پہچان

مرسل خفی کی پہچان درج ذیل تین امور میں سے ایک کے ذریعے ہوتی ہے۔

الف۔ بعض آئمہ کا نص بیان کرنا کہ فلاں راوی جس سے بیان کر رہا ہے اس سے اس کی ملاقات نہیں ہے یا اس سے اس کا مطلقاً سماع ثابت نہیں ہے۔

ب۔ وہ خود اپنے متعلق بتائے کہ میں جس سے حدیث بیان کر رہا ہوں اس سے ملاقات نہیں ہے یا اس سے کچھ بھی نہیں سنا۔

ج۔ یہی حدیث دوسری سند سے مروی ہو جس میں اس راوی اور مروی عنہ کے درمیان ایک راوی کی زیادتی ہو۔

اس تیسرے امر میں علما کا اختلاف ہے کیوں کہ اس چیز کا بعض اوقات ''المزید فی متصل الاسانید'' سے تعلق ہوتا ہے۔

مرسل خفی کا حکم

یہ ضعیف ہے کیوں کہ اس کا تعلق منقطع سے ہے جب اس کا انقطاع ظاہر ہو جائے تو اس کا حکم منقطع والا ہوگا۔

حدیثِ موضوع

جب کسی راوی میں یہ عیب ثابت ہو جائے کہ وہ رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولتا ہے اور خود ساختہ یا من گھڑت باتیں آپ ﷺ کی طرف منسوب کرتا ہے تو اس کی روایت کو ''موضوع'' کہتے ہیں۔

لغوی اور اصطلاحی مفہوم

موضوع کا لفظ وَضَعَ فعل سے اسم مفعول کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں ''اس نے اس کو گرا دیا یا مٹا دیا'' اور زیر بحث روایت کو موضوع اس لیے کہتے ہیں کہ یہ رتبہ و مقام کے اعتبار سے انتہائی نیچے گری ہوتی ہے۔

اصطلاح محدثین میں وہ جھوٹی، مصنوعی اور خود ساختہ و من گھڑت بات جس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی جائے موضوع حدیث کہلاتی ہے۔

یہ ضعیف روایات کی سب سے بڑی اور قبیح ترین قسم ہے۔ بلکہ بعض علما نے تو ایسی روایت کو ضعیف میں بھی شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

موضوع روایات کا حکم

علمائے امت کا اس پر اتفاق ہے کہ جانتے بوجھتے ہوئے موضوع روایات بیان کرنا، آگے پہنچانا مکمل طور پر حرام اور گناہ کی بات ہے۔

وضاعین کا طریقہ کار

بعض اوقات کوئی شخص کوئی اچھی اور دلکش سی بات اپنی طرف سے بنا کر خود ساختہ سند کے ذریعے روایت کر دیتا ہے اور بعض اوقات حکما اور دانشوروں میں سے کسی کا کوئی عمدہ سا قول لے کر

خودساختہ سند کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کے نام سے روایت کر دیا جاتا ہے۔

موضوع روایات کی پہچان کا طریقہ

موضوع روایات درج ذیل چار طریقوں سے پہچانی جاتی ہیں:

۱۔ حدیث وضع کرنے والا خود اقرار کرے کہ میں نے فلاں فلاں احادیث وضع کر کے پھیلا دی ہیں۔

۲۔ راوی کی زبان سے اتفاق کے ساتھ کوئی ایسی بات نکل جائے جو اس کے اقرار و اعتراف کی قائم مقام ہو مثلاً جس کسی شیخ سے وہ روایات بیان کرتا ہے اس کے متعلق پوچھ لیا جائے کہ اس کی ولادت کب ہوئی تھی اور جب وہ ایسی تاریخ بتائے کہ اس کی وفات اس کی بیان کردہ تاریخ ولادت سے پہلے ہو چکی ہو اور مذکورہ روایت صرف اس شخص کے پاس ہو تو سمجھا جائے گا کہ یہ خودساختہ روایت ہے۔

۳۔ راوی ذاتی طور پر اپنی بات میں کوئی ایسا قرینہ نہ پائے اور اس سے اس کی روایت کے موضوع ہونے پر دلیل ہو۔

۴۔ یا روایت میں کوئی ایسا قرینہ ہو جو اس کے موضوع ہونے پر دلیل ہو۔ مثلاً روایت کے الفاظ اور اس کی ترتیب انتہائی رکیک اور بودی ہو یا اس کا معنی ومفہوم عام تصریحات اور قرآن کریم کی روح کے خلاف ہو۔

وضع کے اسباب اور واضعین کی قسمیں

۱۔ حدیث وضع کرنے والا اپنی دانست میں لوگوں کو نیکی اور خیر کی ترغیب دینے کا حریص ہوتا ہے یا انہیں گناہوں اور برائیوں سے روکنا چاہتا ہے لہٰذا وہ اپنی نیک مگر نادان نیتی سے کچھ باتیں بنا کر احادیث کی صورت میں بیان کرتا ہے۔ ایسے لوگ عام طور پر کوئی شبہ نہیں کہ عابد و زاہد ہوتے ہیں لوگ ان کی باتوں کو بھی جلد قبول کر لیتے ہیں مگر یہ سب سے بڑے وضاع حدیث ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً میسرہ بن عبدربہ امام ابن حبان اپنی کتاب

الضعفا میں ابن مہدی سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے میسرہ سے پوچھا کہ آپ ایسی حدیثیں کہاں سے لاتے ہیں کہ اگر کوئی فلاں فلاں چیز پڑھے تو اسے یہ اجر وثواب ملے گا۔ تو اس نے جواب دیا یہ باتیں میری اپنی خودساختہ ہوتی ہیں میں اس طرح لوگوں کو خیر اور نیکی کی طرف راغب کرتا ہوں۔ (۲۹)

۱۔ سیاسی و مذہبی فرقوں کے ظہور کے بعد لوگوں نے اپنے اپنے مذہب و فرقے کی تائید اور تقویت کے لیے حدیثیں وضع کیں۔

۳۔ زندیق لوگ جب اسلام میں کسی اور طرح علی الاعلان رخنہ اندازی سے عاجز رہے تو پوشیدہ طور پر انہوں نے یہ راہ اپنالی اور ایسی ایسی مکروہ اور ناپسندیدہ باتیں احادیث و روایات کی شکل میں لوگوں کے اندر پھیلا دیں اور پھر انہی کی بنیاد پر اسلام کو بدنام کرنے لگے مثلاً محمد بن سعید شامی ایک معروف زندیق تھا۔ اس کے ان مکروہ افعال کی بنا پر ہی اسے سولی پر لٹکا دیا گیا اور وہ المصلوب کہلایا۔ اس کی ایک روایت اس طرح ہے ”میں خاتم النبین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں الا یہ کہ اللہ چاہے۔ (۳۰)

۴۔ بعض کمزور ایمان لوگ حکام وقت کی خواہشات کی مناسبت سے کچھ روایات وضع کرکے ان کے سامنے بیان کرتے اور انہیں خوش کرکے ان کے ہاں اپنا مرتبہ بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔

۵۔ بعض نام نہاد واعظ اور قصہ گو قسم کے لوگ عوام میں بے سروپا روایات بیان کرتے ہیں۔ جن میں عجیب سا تجسس ہوتا ہے اور اس طرح وہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کی محفلوں میں بیٹھیں اور نذرانے بھی پیش کریں۔

۶۔ بعض لوگ محض سستی شہرت کے لیے ایسی عجیب وغریب روایات بیان کرتے ہیں کہ یہ کسی اور کے پاس نہیں ہیں یا وہ سندیں تبدیل کر دیتے ہیں تاکہ لوگ ان کی طرف راغب اور مائل ہوں اور ان کو شہرت ملے۔

المتروک

معنی ومفہوم

لغوی طور پر یہ لفظ ترک فعل سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، معنی میں ''ترک کیا گیا یا چھوڑ دیا گیا''۔ جب انڈے کے خول سے بچہ باہر نکل آتا ہے تو التریکۃ کہتے ہیں یعنی متروکہ کہ اب اس میں کوئی فائدہ نہیں۔

اصطلاح میں وہ حدیث جس کی سند میں کوئی راوی ایسا ہو کہ اس پر جھوٹا ہونے کا الزام ہو تو اس کی روایت کو متروک کہتے ہیں۔

راوی پر جھوٹا ہونے کے الزام کے اسباب

جب کسی راوی میں مندرجہ ذیل باتوں میں سے کوئی ایک ثابت ہو جائے تو اسے متہم بالکذب یعنی جھوٹا سمجھا جاتا ہے۔

۱۔ اگر کوئی حدیث صرف اسی ایک ہی سے مروی ہو اور معلوم ومعروف شرعی قواعد کے خلاف ہو۔

۲۔ یا راوی عام بول چال میں جھوٹا مشہور ہو۔

متروک کا مقام ورتبہ

سب سے بری اور قبیح روایت موضوع ہوتی ہے اس کے بعد متروک۔ اب اس سے صاف اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محدثین کی نگاہ میں متروک کا کیا درجہ ومقام ہے۔

المنکر

معنی و مفہوم

جب کسی راوی میں فاش غلطیاں اور انتہائی فسق و فجور کے عیوب ثابت ہوں تو اس کی روایت کو منکر سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہ لفظ ''اقرار'' کے مقابل ''الانکار'' مصدر سے ''منکر'' اسم مفعول ہے اصطلاحی طور پر اس کی کئی تعریفیں بیان کی گئی ہیں مثلاً:

۱۔ وہ حدیث جس کے کسی راوی میں فاش اغلاط، انتہائی غفلت یا فسق و فجور کا ظہور ہو۔

۲۔ نخبۃ الفکر میں حافظ ابن حجر نے یہ تعریف بیان کی ہے:

وہ حدیث جسے کوئی ضعیف راوی، ثقہ کے برخلاف بیان کرے۔

منکر و شاذ میں فرق

شاذ وہ حدیث ہوتی ہے جس کو کوئی مقبول راوی اپنے سے زیادہ ثقہ کے خلاف بیان کرے۔

جب کہ ''منکر'' وہ ہوتی ہے جس کو کوئی ضعیف راوی کسی ثقہ کے خلاف بیان کرے۔

ان تعریفوں سے واضح ہوتا ہے کہ منکر اور شاذ دونوں قسم کی روایات میں مخالفت ہوتی ہے مگر شاذ میں مخالفت کرنے والا کوئی مقبول راوی ہوتا ہے اور منکر میں ضعیف۔ اس لیے حافظ ابن حجر نے فرمایا جس نے ان دونوں کو برابر اور ایک کیا اس سے بھول ہوئی ہے۔

مثالیں

پہلی تعریف کے مطابق اس کی مثال سنن نسائی اور ابن ماجہ کی درج ذیل روایت ہے ''ابو

ذکیر یحییٰ بن محمد قیس کے واسطے سے ہشام بن عروہ اپنے باپ عروہ سے وہ حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً بیان کرتا ہے کہ تم ڈوکے خشک کھجوروں کے ساتھ کھاؤ بے شک بنی آدم جب اسے کھاتا ہے تو شیطان غصے میں ہوتا ہے۔''

امام نسائی کہتے ہیں کہ یہ حدیث منکر ہے۔ اسے اکیلے ابو ذکیر نے بیان کیا ہے جو کہ شیخ صالح ہے لیکن صرف اکیلے ہیں۔

دوسری تعریف کے مطابق وہ روایت جس کو ابن ابی حاتم نے حبیب بن حبیب الزیات کی سند سے بیان کیا ہے، وہ ابو اسحٰق سے وہ عیزار بن حریث سے وہ ابن عباس سے وہ نبی کریم ﷺ سے بیان کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا۔

''جس نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کرتا رہا اور بیت اللہ کا حج کیا اور رمضان کے روزے رکھے اور مہمان کی مہمان نوازی کا حق ادا کیا وہ جنت میں جائے گا۔''

امام ابو حاتم فرماتے ہیں کہ حبیب بن حبیب الزیات کی یہ حدیث منکر ہے کیوں کہ دوسرے ثقات راویوں نے اس حدیث کو ابو اسحٰق سے موقوف کیا ہے جو کہ معروف ہے۔

مقام و مرتبہ

منکر کی دونوں قسموں کی تعریفوں سے واضح ہوتا ہے کہ منکر انتہائی ضعیف حدیث کی قسموں میں سے ہے کیوں کہ یا تو اس راوی کی روایت ہوتی ہے جو فحش الفاظ یا کثیر الغفلت یا فسق کی صفت کے ساتھ موصوف ہے یا اس راوی کی روایت ہوتی ہے جو ضعیف ہے اور اپنی روایت میں ثقہ راویوں کی مخالف کرتا ہے اور یہ دونوں قسمیں سخت ضعیف ہیں۔

معروف

معنی و مفہوم

یہ عرف سے ماخوذ اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ اس سے مراد وہ حدیث ہے جسے ثقہ روایت کرے اور وہ ضعیف کی روایت کی مخالفت کرے تو یہ اس معنی میں منکر کے مد مقابل ہے۔ مثلاً گزشتہ موضوع ''منکر'' کے بیان میں جو دوسری مثال گزری وہی یہاں معروف کی مثال ہے کیوں کہ امام ابن ابی حاتم حبیب کی مرفوع روایت ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ یہ منکر ہے۔

المعلل

جب کسی راوی میں طعن کا سبب ''اس کا وہمی ہونا'' ہو تو ایسے راوی کی روایت کو معلل کہتے ہیں۔

لغوی و اصطلاحی مفہوم

اعَل، فعل سے اسم مفعول معَل، معل بنتا ہے لیکن غیر مشہور لغت کے مطابق محدثین سے یہ لفظ معلل منقول ہے۔ بعض محدثین نے اسے معلول بھی کہا ہے جو کہ قواعد عربی کے لحاظ سے ضعیف اور کمزور ہے۔ بہر حال اس لفظ کا ماخذ علَّل بنتا ہے اس کا معنی بہلانا اور مشغول کر دینا ہے۔

اصطلاحاً معلل سے مراد ایسی حدیث ہے جس میں کوئی ایسی مخفی علت پائی جائے جو اس کے صحیح ہونے پر اثر انداز ہوتی ہو جب کہ ظاہراً وہ صحیح و سالم معلوم ہوتی ہو۔

علت سے مراد

اس سے مراد کوئی پوشیدہ نقص و عیب ہوتا ہے جو حدیث کے درست ہونے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس تعریف میں یہ اشارہ ہے کہ علما حدیث کے ہاں ''علت'' میں دو باتیں ہونی شرط ہیں یعنی اس کا پوشیدہ اور مخفی ہونا اور صحت حدیث پر اثر انداز ہونا۔

بعض اوقات یہ علت کا لفظ حدیث کے کسی بھی عیب کے لیے استعمال کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً:

الف۔ پہلی صورت میں کسی حدیث کو معلّل قرار دینا اس سبب سے کہ اس کا راوی کذاب یا غفلت اور سوء حفظ سے موصوف ہو وغیرہ جب کہ یہ عیوب ظاہر اور واضح ہوں، حتیٰ کہ امام ترمذی نے نسخ کو بھی علت سے تعبیر کیا ہے۔

ب۔ اور دوسری صورت یوں کہ کوئی علت جو صحت حدیث کے لیے کسی طرح عیب نہیں مگر اس کے باوجود یہ لفظ استعمال کر دیا گیا۔ مثلاً کسی حدیث کا مرسل کو بیان کر دینا جیسے کہ کسی ثقہ نے موصول بیان کیا ہو۔

علل حدیث کی معرفت

علل حدیث کی معرفت ایک مشکل اور دقیق فن ہے کیوں کہ اس میں ان مخفی اور پوشیدہ علل کو واضح اور بیان کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جو صرف علوم حدیث میں مہارت رکھنے والوں پر ہی ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں صرف حافظہ وضابطہ اور دور اندیش اور روشن فہم رکھنے والا ہی کامیاب ہو سکتا ہے اور اس کی معرفت پر قدرت رکھ سکتا ہے۔

علت کا ادراک

علت کے ادراک پر درج ذیل چند امور سے مدد لی جاتی ہے:

۔ راوی کا منفرد اور اکیلا ہونا۔

۔ اس کا غیر اس کی مخالفت کرے یعنی کوئی اور صاحب علم اس راوی حدیث کی مخالفت کر رہا ہو۔

۳۔ یا بعض دیگر قرائن جو مذکورہ امور کو ثابت کریں۔

ان امور کے ذریعے کوئی ماہر فن اس بات سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ فلاں راوی سے وہم ہوا ہے۔ مثلاً کسی مرسل حدیث کو موصول بیان کر دیا، یا روایت موقوف تھی اسے مرفوع ذکر کر دیا یا ایک یث کو دوسری میں ضم کر دیا وغیرہ۔

یہ باتیں کسی ماہر فن کو ظن غالب کے طور پر اس نتیجہ تک پہنچاتی ہیں کہ وہ حدیث کو غیر صحیح قرار دے دیتا ہے۔

شاذ ومحفوظ

معنی ومفہوم

شاذ لفظ شذ سے ماخوذ اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کا علیحدہ اور منفرد ہو جانا اور جو جمہور سے منفرد اور الگ ہو اسے شاذ کہتے ہیں۔

اصطلاحی طور پر کسی مقبول راوی کی ایسی روایت جو اس نے کسی اپنے سے افضل واولیٰ کی مخالفت میں بیان کی ہو۔

مقبول راوی سے مراد وہ راوی ہے جو عادل اور تام الضبط یا قدرے خفیف الضبط ہو۔ اور افضل واولیٰ سے مراد وہ ہے جو اس سے بڑھ کر ضابط ہو یا ان کی تعداد زیادہ ہو یا اسی طرح کی دوسری ترجیحات جن میں وہ اس سے بڑھ کر ہو۔

شاذ سند اور متن دونوں میں واقع ہو سکتا ہے۔

ا۔ سند میں شاذ کی مثال

امام ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے ابن عیینہ کی سند سے بیان کیا ہے:

عن عمرو بن دينار عن عوسجة عن بن عباس ان رجلا توفي علىٰ عهد رسول الله ﷺ ولم يدع وارثا الا مولى هو اعتقه

اس حدیث کو موصول بیان کرنے پر ابن عیینہ کی متابعت ابن جریج وغیرہ نے کی ہے جب کہ حماد بن زید نے ان کی مخالفت کی ہے۔ اس نے عمرو بن دینار سے وہ عوسجہ سے بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے ابن عباس کا ذکر نہیں کیا۔ اس لیے ابو حاتم نے کہا ہے کہ ابن عیینہ کی حدیث محفوظ ہے۔ اگر چہ حماد بن زید صاحب عدالت اور صاحب ضبط ہے اس کے باوجود ابو حاتم نے ان کی روایت کو

راجح قرار دیا ہے جو اس سے تعداد میں زیادہ ہیں۔

۲۔ متن میں شاذ کی مثال

ابوداؤد اور ترمذی نے عبدالواحد بن زیاد کی حدیث سے بیان کیا ہے:

عن الاعمش عن ابی صالح عن ابی هریره مرفوعا اذا صلی احدکم الفجر فلیضطجع عن یمینه

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ عبدالواھد نے اس حدیث میں ایک بڑی تعداد کی مخالفت کی ہے کیوں کہ دوسرے لوگوں (راویوں) نے اس حدیث کو نبی اکرم ﷺ کے فعل سے بیان کیا ہے نہ کہ آپ کے قول سے اور ان لفظوں سے اعمش کے شاگردوں میں سے عبدالواحد منفرد اور اکیلا ہے (جو کہ قول سے بیان کرتا ہے۔)

شاذ کے انواع میں مذکورہ دونوں مثالیں محفوظ کی مثالیں ہیں یاد رہے شاذ کے مدمقابل حدیث محفوظ ہے۔

شاذ غیر مقبول حدیث ہوتی ہے لیکن محفوظ مقبول حدیث ہے۔

منسوب الیہ کے اعتبار سے حدیث کی تقسیم

مسند الیہ یا منسوب الیہ کے لحاظ سے حدیث کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔ حدیث قدسی

۲۔ المرفوع

۳۔ الموقوف

۴۔ المقطوع

حدیث قدسی

معنی و مفہوم

لغوی طور پر قدسی کی نسبت قدس کی طرف ہے جس کے معنی پاک و مطہر ے ہیں۔ اصطلاحی طور پر حدیث قدسی سے مراد وہ حدیث ہے جو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہم تک منقول ہو اور اس کی نسبت آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہو۔

حدیث قدسی اور قرآن مجید میں فرق

۱۔ قرآن مجید کے الفاظ اور معنی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور حدیہ قدسی میں معانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب کہ الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہوتے ہیں۔

۲۔ قرآن مجید کی تلاوت عبادت ہے جب کہ حدیث قدسی کا پڑھنا اصولی عبادت شمار نہیر ہوتا بلکہ عام عمل حسن ہوتا ہے۔

۳۔ قرآن مجید کے ثبوت کے لیے تواتر شرط ہے جب کہ حدیث قدسی کے لیے تواتر شرط نہیں ہے۔

احادیث قدسی کی تعداد

احادیث نبویہ کے مقابلے میں احادیث قدسیہ کی تعداد زیادہ نہیں یعنی یہ صرف دو سو سے کچھ زائد ہیں۔

مثال

صحیح مسلم میں مروی ہے کہ حضرت ابوذر ؓ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں، آپ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”اے میرے بندو! میں نے ظلم کو حرام ٹھہرایا ہے اور اسے تمہارے مابین بھی حرام ٹھہرایا ہے لہٰذا ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو:

حدیث قدسی کی روایت کے دو صیغے

حدیث قدسی روایت کرنے کے دو صیغے ہیں۔

۱۔ **قال رسول الله ﷺ فیما یرویه عن ربه عزو جل**

ترجمہ۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب سے روایت کرتے ہوئے فرمایا۔

۲۔ **قال الله تعالیٰ فیما رواہ عن رسوله ﷺ**

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جیسے اس کے رسول ﷺ نے بیان کیا۔

عبدالروف مناوی نے اپنی کتاب **الاتحافات السنیه بالا حادیث القدسیه** میں ۲۷۲ قدسی حدیثیں جمع کر دی ہیں۔ (۳۱)

مرفوع

معانی ومفہوم

مرفوع رفع فعل سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ یہ وضع کی ضد ہے۔ اس حدیث کا نام مرفوع اس لیے رکھا گیا کہ اس کی نسبت بلند اور رفیع مقام والے یعنی نبی اکرم ﷺ کی طرف ہوتی ہے۔

اصطلاحی طور پر وہ قول، فعل، تقریر یا صفت جو نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب ہو۔

یعنی وہ چیز جو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب ہو یا اس کی نسبت آپ ﷺ کی طرف کی گئی ہو خواہ وہ چیز قول یا بات ہو یا فعل یا تقریر و سکوت ہو یا کوئی صفت و خوبی ہو۔ اس لحاظ سے وہ اضافت کرنے والا خواہ صحابی ہو یا اس کم درجے کا ہو، اس کی سند متصل ہو یا منقطع ہو گویا کہ مرفوع میں موصول، مرسل، متصل اور منقطع سب شامل ہیں۔

مرفوع کے مفہوم سے واضح ہوتا ہے، حدیث مرفوع درج ذیل چار قسم کی ہوتی ہے۔

۱۔ مرفوع قولی

کوئی صحابی یا کوئی اور اس طرح حدیث بیان کرے کہ **قال رسول الله ﷺ کذا**.....

یعنی رسول اللہ ﷺ نے اس طرح فرمایا۔

۲۔ مرفوع فعلی

کوئی صحابی یا کوئی دوسرا شخص یوں بیان کرے کہ **فعل رسول الله ﷺ كذا**...... یعنی رسول اللہ ﷺ نے اس طرح عمل کیا۔

۳۔ مرفوع تقریری

کوئی صحابی یا کوئی اور اس طرح کہے کہ **فعل بحضرة النبی ﷺ كذا**...... یعنی نبی ﷺ کی موجودگی میں اس طرح کیا گیا...... اور وہ اس فعل پر رسول اللہ ﷺ کا انکار یا منع کرنا بیان نہ کرے۔

۴۔ مرفوع وصفی

کوئی صحابی یا کوئی اور اس طرح کہے کہ رسول اللہ ﷺ خلقت اور اخلاق کے اعتبار سے تمام لوگوں سے بہترین ہے۔

الموقوف

معنی و مفہوم

وقف سے اسم مفعول کا صیغہ ہے گویا کہ راوی حدیث لے کر صحابی پر ٹھہر جاتا ہے اور وہیں توقف کرتا ہے، باقی سلسلۂ اسناد کو نہیں چلاتا۔

اصطلاحی طور پر وہ قول، فعل یا تقریر جس کو صحابی کی طرف منسوب کیا گیا ہو۔ اسے ”موقوف“ کہتے ہیں۔

یعنی جو بات جو کسی صحابی یا صحابہ کی جماعت کی طرف نسبت کر کے بیان کی گئی ہو۔ اور یہ نسبت شدہ بات کوئی قول فعل یا تقریر ہو سکتی ہے اور سلسلۂ سند متصل یا منقطع کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

موقوف کی درج ذیل تین صورتیں ممکن ہیں:

موقوف قولی

راوی کا یہ بیان کہ حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا ''لوگوں کو وہی کچھ بیان کرو جو جانتے ہو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تکذیب کی جائے''؟

موقوف فعلی

بخاری کی یہ روایت کہ حضرت ابن عباسؓ نے نماز کی امامت کرائی جب کہ انہوں نے تیمّم کر رکھا تھا۔

موقوف تقریری

مثلاً کوئی تابعی یوں کہہ دے کہ میں نے فلاں فلاں صحابی کے سامنے اس طرح کیا اور انہوں نے مجھے منع نہیں کیا۔

بعض اوقات موقوف کی یہ اصطلاح غیر صحابہ کے لیے بھی استعمال کرلی جاتی ہے مگر اس صورت میں منسوب الیہ کا ذکر ضروری ہوتا ہے۔

مقام ومرتبہ

موقوف احادیث صحیح، حسن یا ضعیف ہر طرح کی ہوسکتی ہے۔ بالفرض اگر ان کا صحیح ہونا ثابت ہو تو کیا یہ قابل حجت ہوتی ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مرفوع حکمی کے علاوہ موقوف احادیث کے بارے میں اصل قاعدہ یہ ہے کہ حجت نہیں ہیں کیونکہ یہ صحابہ کرام کے اقوال ہوتے ہیں اگر ان کا صحیح ہونا ثابت ہو بھی تو بعض ضعیف احادیث کی تقویت کا باعث ہوتی ہیں۔ کیوں کہ صحابہ کرام سنت رسول پر ہی عملی طور پر گامزن تھے اور جو موقوفات مرفوع حکمی ہوں ان کا حکم مرفوع احادیث کی مانند ہوتا ہے اور وہ ہر طرح سے شرعی حجت ہیں۔ (۴۲)

المقطوع

معنی ومفہوم

یہ قطع سے اسم مفعول کا صیغہ ہے اور وصل کی ضد ہے۔

اصطلاحی طور پر اس سے مراد وہ قول یا فعل ہے جو تابعی یا اس سے بھی نیچے درجے والے تبع تابعی وغیرہ کی طرف منسوب ہو۔

یاد رہے کہ مقطوع اور منقطع میں اس طرح فرق ہے کہ مقطوع ہونا متن کی صفت ہے جب کہ منقطع ہونا سند کی یعنی مقطوع حدیث تابعی یا تبع تابعی کا کلام ہوتا ہے اور اس کی سند تابعی تک متصل ہو سکتی ہے۔ جب کہ منقطع حدیث کی سند متصل نہیں ہوتی اور اس وصف کا متن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مقام ومرتبہ

مقطوع روایات شرعی احکام میں حجت نہیں ہیں خواہ ان کی سند صحیح بھی ہو۔ کیوں کہ یہ عام مسلمانوں کے قول وفعل کا بیان ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی قرینہ پایا جائے جس سے ان کا مرفوع ہونا ثابت ہو جائے تو ان کا حکم مرفوع مرسل کا ہوگا۔

293/c

* * *

ہماری دیگر کتب

تفسیر حقانی	مولانا محمد عبدالحق حقانی
علم القرآن	مرتبہ: سید قاسم محمود
سفرنامہ ارض القرآن ([illegible])	محمد عاصم الحداد
القرآن اور علم النفس	محمد عثمان نجاتی
فلسفہ سائنس اور قرآن	رائے خدا بخش کلیار ایڈووکیٹ
اللؤلؤ والمرجان	ترجمہ: سید شبیر احمد
اصول الحدیث	ڈاکٹر خالد علوی
حفاظت حدیث	ڈاکٹر خالد علوی
حدیث نبویؐ اور علم النفس	محمد عثمان نجاتی
سیرۃ النبی ﷺ	علامہ شبلی نعمانی
رحمۃ اللعالمینؐ	قاضی محمد سلیمان منصور پوری
النبی الخاتمؐ	مولانا مناظر احسن گیلانی
رسول عربیؐ	نور بخش توکلی
حیات محمدؐ	محمد حسین ہیکل
محسن انسانیتؐ	نعیم صدیقی
انسان کاملؐ	ڈاکٹر خالد علوی
سیرت قرآنیہ سیدنا رسول عربیؐ	پروفیسر محمد اجمل خان
حیات سرور کائناتؐ	
سیرت طیبہ محمد رسول اللہؐ	

297.127
م 300 ت

الفیصل
ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور